دل گداز تحریریں، ٭ زندگی کی تصویریں

کراچی

ماہنامہ

سچی کہانیاں

35 واں سال

OCTOBER 2018

ونرز

خناس — حنا بشریٰ

منزل کی جستجو — محمد شہزاد

حسد کی آگ — کوثر اسلام

☜ 'عامل کامل' سچی کہانیاں کا نیا ہوشربا سلسلہ جو پڑھنے والوں کو جادو کی کالی دنیا سے آشنا کرائے گا

☜ 'املتاس' نہایت دلچسپ اور پراسرار سلسلہ جس کی ہر سطر خوف اور دہشت میں ڈوبی ہوئی ہے

☜ 'مسئلہ یہ ہے' آپ کے مسائل کا روحانی حل، سچی کہانیاں کا مقبول ترین سلسلہ

ماہنامہ سچی کہانیاں کراچی

E-mail:pearlpublications@hotmail.com

بانی سہام مرزا



مدیرہ اعلیٰ: منزہ سہام
مدیر: دانیال شمسی
نائب مدیرہ: ماہم اوزلین

MEMBER	
APNS	رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
CPNE	رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

منیجر مارکیٹنگ
زین شمسی
0331-8221212

منیجر سرکولیشن
آفتاب عالم
0334-3193174

انکم ٹیکس ایڈوائزر
مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹس)

رابطے کے لیے
021-35893121
021-35893123

خط و کتابت کا پتا: 88-C II فرسٹ فلور خیابانِ جامی کمرشل
ڈیفنس فیز-7، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

قیمت فی شمارہ: 70 روپے ✵ جلد: 35 ۔ شمارہ: 10 ✵ اکتوبر 2018ء

ایڈیٹر، پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

فون: 021-35893121-35893122 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی ستی پریس OB-7 تالپور روڈ کر

سالانہ [illegible] بذریعہ رجسٹری پاکستان 1000 روپے [illegible] افریقہ 75 ڈالرز کینیڈا، آسٹریلیا 75 ڈالرز ایشیا، یورپ 65 ڈالرز



سب سے بڑا فتنہ ...

پرانے دور میں مائیں بچوں کو جن بابا سے ڈرایا کرتی تھیں......

لڑکپن میں والد سختی کرتے تھے کہ مغرب کے بعد باہر مت نکلنا چڑیلیں نکلتی ہیں۔ پہلے بری باتوں کو چھپایا جاتا تھا۔ بڑوں کے سامنے بات کرنے کے کچھ آداب ہوا کرتے تھے......لوگ سادا تھے زندگی آسان تھی پھر وقت بدلا' حالات بدلے اور شاید لوگ بھی......اب بچے والدین کو ڈراتے ہیں سختی کرو' اچھا برا سمجھاؤ یا کسی بھی معاملے کی تصیح کرو تو شکایتیں فیس بک پر کرنے لگتے ہیں......اور مزے کی بات یہ کہ دوست احباب لائکس بھی بھیج دیتے ہیں۔ کسی پر الزام لگانا ہو تو بس سوشل میڈیا کا سہارا لے لیا جاتا ہے اور بنا تحقیق لوگوں کے پرخچے اڑا دیے جاتے ہیں.....لغو باتوں کو اہمیت دی جاتی ہے' بے سروپا الزامات پر ایک پوری عمارت کھڑی ہو جاتی ہے۔ کتنی زندگیاں یہ عفریت نگل چکا ہے کتنے لوگ زندہ ہو کر بھی مردوں سے بدتر زندگی گزار رہے ہیں......انسان کا بے پردہ ہو جانا دراصل عذاب الٰہی ہے مگر یہ بات اُن کو سمجھ آتی ہے جنہیں اللہ عقل سلیم عطا کرتا ہے۔ جب آپ کی خوشی' آپ کا غم اور آپ کی عزت صرف ایک کلک کی دوری پر ہو تو صاحب عقل ایسی ترقی کو ترقی نہیں بلکہ موجودہ دور کا سب سے بڑا فتنہ تصور کرتے ہیں۔ اللہ ہم سب کی عصمتیں محفوظ رکھے اور ہمیں صحیح اور غلط کی تمیز عطا فرمائے۔

منزہ سہام

احوال

مدیرہ اعلیٰ

قارئین کے درمیان رابطہ' آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

عزیز احوالیو! امید واثق ہے کہ آپ سب بھلے چنگے ہوں گے۔ کچھ ذاتی مصروفیات کی وجہ سے اس بار سچی کہانیاں بہت جلدی پریس بھجوانا پڑا کیونکہ جن تاریخوں میں پرچہ جاتا ہے میں ملک سے باہر تھی اس لیے آپ لوگوں کے خطوط آئے تو وقت پر لیکن شمارہ جلدی چھپنے کے باعث احوال میں شامل نہ ہوسکے اس کے لیے آپ کی مدیرہ معذرت خواہ ہے مگر وعدہ ہے کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ سچی کہانیاں میں کی گئی تبدیلیاں آپ لوگوں کو بھا رہی ہیں یہ سوچ کر مجھے بہت تقویت ملتی ہے۔ انشاء اللہ میں اور آپ مل کر اپنے عزیز از جان سچی کہانیاں کو کامیابیوں کی بلندیوں تک پہنچائیں گے۔

میں آج اپنے نمائندہ خصوصی بلوچستان عمران مظہر کو آواز دے رہی ہوں۔ کہاں غائب ہو بھائی اب ایسی بھی کیا مصروفیات...... اس کے بعد کا شمارہ پُراسرار نمبر ہوگا لہٰذا آپ لوگ اپنی نگارشات جلد از جلد ارسال کردیں۔ اس بار دیر سے ملنے والے خطوط پہلے شائع کئے جارہے ہیں۔ چلیے بڑھتے ہیں پہلے خط کی جانب......

تاخیر سے ملنے والے خطوط:

☜ پرنس افضل شاہین بہاولنگر سے لکھتے ہیں۔ اس بار اگست کے سچی کہانیاں میں خوبصورت ماڈل کے سرورق نے قبضہ کیا ہوا تھا۔ سرورق دیکھ کر یہ کہنے پر مجبور ہوگئے۔

دل میں عجب طرح کی خوشیاں بکھر گئیں
وہ دل ربا سا شخص ہمیں جب کبھی ملا

جشن کے حوالے سے اگر اس سرورق پر پاکستانی پرچم کا ٹیگ ہوتا تو اور اچھا ہوتا۔ آٹھ تا گیارہ اگست ہم لوگ فیبا ریڈیو کی دعوت پر کشمیر پوائنٹ کوہ مری لسنرز رفاقتی پروگرام میں گئے ہوئے تھے وہاں سے فارغ ہوتے ہی اور واپس آتے ہی سچی کہانیاں پڑھا اور فوراً تبصرہ لکھنے بیٹھ گیا اور اپنی نیند کی قربانی بھی دی۔ کیونکہ جاتے ہوئے اور آتے ہوئے بارہ بارہ گھنٹے کا سفر بنتا ہے۔ اداریے میں آپ نے ٹھیک لکھا ہے کہ خودکش دھماکوں میں بہت زیادہ لوگ شہید ہوئے مگر ٹی وی چینلز والے صرف میاں نواز شریف اور ان کی بیٹی کے اردگرد گھومتے رہے احوال میں آپ نے میرا خط سب سے پہلے شائع کیا مجھے ویلکم کیا یہ آپ کی محبت کی دلیل ہے نئے آنے والوں کو خوش آمدید کہتی رہیں۔ عالیہ نور ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو امتحان میں کامیاب فرمائے اور آپ اسی طرح سچی کہانیاں میں لکھتی رہیں۔ تحسین جو نیجو واقعی کوئی غلطی پر ہو تو ہمیں چاہیے کہ اسے اکیلے میں اس کی غلطی کا احساس دلائیں۔ محسن علی طالب ماہنامہ ریشم آپ کا ہی نہیں میرا بھی پسندیدہ رسالہ ہے لیکن دکھ ہوا کہ اسے اچانک ہی بند کردیا گیا۔ منزہ آپی واقعی آپ کے والد ایک محترم ہستی تھے ان کی باتیں قابل غور ہوتی تھیں۔ بہت ہی اچھا کیا کہ احوال کی تاریخ اٹھارہ کردی گئی ہے۔ تمام ہی خطوط نگاروں کے خطوط اچھے تھے۔ ہم تو اپنی آپی

فریدہ جاوید فری کا انٹرویو پڑھنا چاہتے تھے مگر ان کی بجائے مور شاہد کا انٹرویو پڑھنے کو ملا۔ چلیں ان کا انٹرویو بھی ٹھیک تھا۔ آپ کی ڈائری میں شمائلہ نوید، ایم حسن نظامی، امینہ بی بی، علی رضا، عمار یاسر، رضوانہ لطیف اور شعروسخن میں ابراہیم اشک، رفعت خان، فرح، زاہدہ سرور نے خوب لکھا، آپی فریدہ جاوید کی کوئی تحریر بھی نہیں تھی اللہ کرے آپی مکمل ٹھیک ہوجائیں۔ اور ہم ان کی غزلیں پڑھتے رہیں آمین۔

☆ بھائی اس ادارے سے دوشیزہ بھی شائع ہوتا ہے اور سچی کہانیاں بھی یقین کریں یہ ہمارا ذریعہ معاش نہیں بس والد اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے رسالے نکالا کرتے تھے۔ لہٰذا نفع نقصان کی تو کبھی پرواہ نہ انہوں نے کی نہ میں نے، اچھا معیاری ادب پڑھنے والوں تک پہنچے یہ خواہش ہے۔ آپ نے نیند کی قربانی دی اس لیے اب خط تاخیر سے ملنے والے خطوط میں شامل ہے۔

نفیسہ فضل محمود لکھتی ہیں۔ چاند سے پیاری بیٹی منزہ سہام بہت سی دعائیں۔ خوشیوں اور کامرانیوں سے ہمکنار رہو۔ دونوں پرچے ایک ساتھ ملے پھر اگست کا شمارہ بھی ملا جس میں میرا خط اور شعروسخن میں غزل لگی ہے۔ ابھی ایک غزل ہے آپ کے پاس...... اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف دل خوش کردیا غزالہ عزیز خوش رہو ایسی کہانیاں ایمان تازہ کرتی ہیں معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ جو باتیں آپ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے بارے میں ہمیں نہیں معلوم وہ معلوم ہوجاتی ہیں اللہ کرے زور قلم اور زیادہ، عشق حقیقی کیا بات ہے اُم مناہل تم نے تو میری روح کو جھنجوڑ ڈالا باخدا مزہ آ گیا خوش رہو مکافات عمل عثمان غنی سبق آموز حریر ہے گاؤں دیہاتوں میں یہ سب ہوتا ہے۔ فرمانبردار اولاد سلمیٰ نسیم بانو آج کل یہی سب ہورہا ہے۔ گلے کا طوق مور شاہد حسین جنات کی دنیا میں یہ سب ہوتا ہے کوئی نیک جن تھا جلد ہی جان چھوڑ گیا۔ تقدیر گزیدہ موہینہ بتول ہائے کیا اسٹوری ہے دل دکھا گئی ویسے ہی ہارٹ پیشنٹ ہوں دیر تک دل میں ٹیسیں اٹھتی رہیں ممتاز احمد دوسرے کی بیوی ہم بھی ہمیشہ سے سنتے اور دیکھتے آئے ہیں یہ سچ ہے ویسے ذوالقرنین کے ساتھ اچھا ہوا۔ زندگی شرمندگی جاوید راہی کی یہ کہانی پہلے بھی لگ چکی ہے۔ ساون لوٹ گئے ایم حسن نظامی کہانی دکھی کر گئی صفت فرعون بہت زبردست کہانی لائے محمد قاسم خان بلوچ اینڈ بہت اچھا رہا۔ نادان لڑکیوں کے لیے سبق ہے۔ برا انجام تبسم زہرا بے شک برائی بھلائی کا صلہ اسی دنیا میں ملتا ہے۔ اللہ پوچھے گا منزہ سہام ساری کہانی میں تجسس رہا مگر آخر میں وقاص جن لے اڑے ثمینہ کو واہ عامل کامل پیر شاہ محمد قادری بہت زبردست کہانی لائے ہیں بے چینی سے آئندہ کی قسط کا انتظار ہے لگتا تو ہے کہانی سچی ہے واللہ عالم...... حامد تابانی یہ حقیقت ہے کہ کتنے ہنستے بستے گھر اجاڑ دیے دہشت گردوں نے اس ماہ کی کہانیاں دل پر گہرا تاثر چھوڑ گئیں۔ جیسے ریٹائرمنٹ، غلام مرتضیٰ علوی کی تحریر حماقت نام نہاد حکیم ملاؤں کی پول کھول گئیں یا کولڈ فیئر؟ شبیہہ مظہر رانجھا مزہ آیا اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے آسیبی مسکن ڈاکٹر عامر شہزاد یہ سچ ہے ان چیزوں کا مذاق اڑائیں یا برا بھلا کہیں تو یہ انتقام لیتی ہیں۔ وڈا عشق عابدہ مغل یہ اسٹوری بھی خوب ہے عشق انسان کو کسی کام کا نہیں چھوڑتا جیسے علی بے چارہ، قمر علی عباسی کا سفرنامہ ہمیشہ ہی اچھا ہوا ہے لگتا ہے ہم بھی ساتھ ہیں اس مرتبہ آپ کی ڈائری اور شعروسخن زبردست رہے۔ مسئلہ یہ ہے باباجی کے لیے بے حد دعائیں اللہ پاک انہیں صحت و زندگی عطا فرمائے آمین۔ جوتیوں میں دال زبردست منزہ بیٹی ایسے ہی آئینہ دکھاتی رہو شاید شرم آجائے۔

☆ نفیسہ آنٹی شمارہ پسند کرنے کا شکریہ...... اپنی صحت کا خیال رکھیں۔

مہر پرویز دولومیاں چنوں سے لکھتے ہیں۔ السلام علیکم! اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے آمین۔ سرورق کی حسینہ بھولپن کے ساتھ متوجہ ہیں۔ سدا خوشیوں کے سنگ زندگی سے لطف اندوز ہو۔ دہشت گردوں نے معصوم جانوں سے کھیلنا شیوہ بنا رکھا ہے۔ تبدیلی آنے سے کاش ان کا قلع قمع ہو۔ جوتیوں میں دال

دعائے مغفرت

دوشیزہ کی مصنفہ خولہ عرفان کے سسر قضائے الٰہی سے انتقال کر گئے ہیں اللہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

خون میں ڈوبے عقیدت کے پھول تھے۔ احوال میں پرنس افضل شاہین' امان ملازم حسین شیرازی عبدالغفار عابد محبتوں کے پھول نچھاور کر کے حوصلہ افزائی کرتے نظر آئے ایم حسن نظامی کی تعریف پتہ نہیں تنقید تھی ان کا جملہ میں نے مہارت سے پرچے میں جگہ بنائی تو ان سے عرض ہے آپ کی حسن نظر کا شکریہ مان گئے کہ جواب عرضیوں کے درمیان میں بھی مقام بنا گیا۔ یہ وہ عظیم ادیب ہیں جنہوں نے لاہور کے سارے پرچے بند کروا کر اب کراچی کا رخ کر لیا ہے۔ انعام پر انعام ملنے پر محسوس ہوتا ہے مجھے انعامی تحریریں لکھنا آتا ہے آقا کے غلام حضرت ثوبانؓ پڑھ کر ایمان تازہ ہو گیا۔ اُم مناہل اپنے آباؤ اجداد کا شجرہ نسب اور خدمات کا خوب اظہار فرماتی نظر آئیں۔ مکافاتِ عمل حیثیت کے نام سے ڈرائجسٹ کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے۔ سلمیٰ نسیم نے اولاد کے کردار پر خوب روشنی ڈالی۔ مور شاہد حسین سے چٹکلوں میں ملاقات ہوئی' گلے کا طوق میں جن تو نیک آدمی تھا اسے کیوں واپس بھیجا۔ مومینہ بتول آزادی کے بدلے خون کے نزرانے پیش کر رہی تھی۔ عظیم ایوارڈ یافتہ ادیب ممتاز احمد کی دوسرے کی بیوی سبق آموز تحریر تھی۔ یہ کڑوا سچ حقیقت ہے کہ جو کسی کے چراغ بجھائے گا خود اندھیروں میں ڈوب جائے گا۔ جاوید راہی ایک لٹی پٹی دکھی دوشیزہ کی داستان الم بیان کرتے نظر آئے۔ ایم حسن نظامی کے ساون میں کرداروں کی موسلا دھار بارش تھی۔ عمر تنہا کی شاعری سے محظوظ ہوئے۔ فرعون صفت قاسم بلوچ خبیث پیر کو بڑی چھوٹ کے بعد انجام سے دوچار ہونا پڑا۔ اور عادل بھی بازی جیت گیا۔ محترمہ منزہ سہام کی تحریر اللہ نے پوچھا اور اپنا کرم بھی فرمایا۔ پھر لوگ کہتے ہیں کہ پیر اور بابا ڈھونگی ہوتے ہیں۔ ڈھونگ دکھانے پر ان کو مجبور کیا جاتا ہے۔ اور ساتھ نذرانے کی صورت میں نوٹوں کی گڈیاں اور شباب بغیر مانگے دیا جاتا ہے۔ پیر محمد شاہ قادری خوبصورت اور دلچسپ دل میں گھر جانے والی تحریر لائے ہیں اب دیکھیں جن کا کیا حشر ہوتا ہے۔ تہمینہ جلیل سائنس' ریاضی میں مسلم خواتین وحضرات کے کارناموں پر روشنی ڈال رہی تھی۔ مرتضیٰ علوی کی حماقت عامر کو معذوری سے دوچار کر گئی۔ شبیہہ مظہر رانجھا گھریلو حالات پر مبنی تحریر لائیں ڈاکٹر عامر شہزاد کا آسیبی مسکن دکھی کر گیا۔ جن کی وجہ سے بیچارے شہزاد کو نوکری چھوڑنی پڑی۔ وڈا عشق بہت خوبصورت دکھی کرنے والی اور اسی ماہ کی انعام یافتہ تحریر ہے۔ مزید لفظ نہیں تعریف کے لیے عباسی صاحب کا سفر ختم' شازلی سعید کی سنہرا اورنگزیب کے پیچھے پڑی ہے۔

☆ پرویز بھائی میری عثمان سے اس سلسلے میں بات ہوئی تھی دوسرے میگزین والوں نے یہ کہہ کر کہ کہانی طویل ہے ہمیں مختصر بھیجیں منع کر دیا پھر بعد میں تقریباً دس ماہ بعد شائع کر دی۔ بھائی جہاں تک رسالوں کے بند ہونے کا تعلق ہے تو اللہ سب پر رحم فرمائے۔ ہم ادارہ ہیں 45 سال سے اخبارات اور رسائل بھی شائع کر رہے ہیں آگے بھی اللہ کا کرم رہے گا دعا ہے۔

✍ حسین خواجہ منچن آباد سے لکھتے ہیں۔ السلام علیکم! سب سے پہلے تو معذرت چاہوں گا کہ ایک لمبے عرصے بعد حاضر ہوا ہوں۔ ایسا کیوں ہوا یہ تفصیل کے ساتھ بتانا کچھ مشکل ہو گا بس مختصر یہ کہ یکم مئی کی صبح پرچہ ملا جس پر مجھے انعام بھی ملا تھا اور اسی دن دوپہر کو اچانک حرکت قلب بند ہونے سے بڑے ماموں کا انتقال ہو گیا جبکہ اس

سے سال پہلے والدہ صاحبہ کا ہوا تھا اور والدہ صاحبہ کے انتقال سے تین سال پہلے بڑی خالہ کا انتقال ہوا تھا ماموں سے بڑھ کر نانی اماں کی فکر زیادہ ہو رہی تھی جس ماں کے پانچ میں سے تین بڑے بچے فوت ہو جائیں اس کے دل پر کیا گزرتی ہو گی 14 '17 اور پھر 2018ء ان حادثات نے کمر توڑ دی۔ اگست کا پرچہ ملا بہت زبردست تھا ونرز کو مبارکباد ایک عدد کہانی ارسال کر رہا ہوں اگر اچھی لگے تو جگہ عنایت فرما دیجیے گا۔

☆ بھائی حسین! یقیناً بہت کڑا وقت ہوتا ہے جب اپنے پیاروں کو زمین کے حوالے کرنا پڑتا ہے اللہ آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے آپ کی کہانی جلد شائع کروں گی۔

✍ ملازم حسین شیرازی بھکر سے لکھتے ہیں۔ محترمہ منزہ سہام صاحبہ السلام علیکم! امید ہے بخیریت ہوں گی خط ہذا کے ساتھ کہانی دعا تعارف معہ فوٹو روانہ خدمت ہے اس سے پیشتر ارسال کردہ کہانی کیسا ملاپ احوال نامہ دو عدد فوٹو بھیجے ہیں جو امید ہے مل چکے ہوں گے۔ نومبر کے پُر اسرار نمبر کے لیے کہانی بھیج دوں گا۔ میری کہانیوں اور خطوط کو شامل اشاعت کر کے بہت حوصلہ افزائی فرماتی ہیں عین نوازش اللہ پاک آپ کو خوش و خرم اور بہ سلامت رکھے آمین۔

☆ شیرازی بھائی! انشاء اللہ جلد آپ کا تعارف شائع کر دوں گی۔ آپ جیسے لکھاریوں کا تعاون سچی کہانیاں کو ہمیشہ درکار رہے گا۔

✍ حمیرا وحید واہ کینٹ سے لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! پیاری آپی منزہ میں خیریت سے ہوں اور امید کرتی ہوں آپ بھی خیریت سے ہوں گی۔ سچی کہانیاں رسالہ انتہائی معیاری اور معلوماتی ہے جس کے تمام سلسلے نہایت خوبصورت ہیں۔ مجھے رسالے میں چھپنے والی سچی کہانیاں بہت متاثر کرتی ہیں جو بہت سبق آموز ہوتی ہیں۔ شاعری بھی دل کو چھو لینے والی ہوتی ہے اسلامی معلومات کے حوالے سے بھی رسالہ نہایت مفید ہے۔ ستمبر کا مہینہ پاکستان کی تاریخ میں نہایت اہمیت کا حامل ہے جس میں پاکستانی افواج نے کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ دیے اور دشمن کو ایسا سبق سکھایا جیسے وہ خواب میں بھی نہیں بھلا سکتے۔ غلام بنے سردار ایک ایسا سلسلہ ہے جس کو پڑھ کر ہمارا ایمان تازہ ہو جاتا ہے اور ہم عشق نبوی ﷺ سے سرشار ہو جاتے ہیں۔

☆ اچھی سی حمیرا! اس میں کوئی شک نہیں کہ پاک فوج دنیا کی بہترین افواج میں سے ایک ہے اور ہمیں اپنی فوج سے محبت ہے۔ شمارہ پسند کرنے کا شکریہ۔

✍ ایم اے خالق بھٹی رحیم یار خان سے لکھتے ہیں۔ عزت مآب محترمہ باجی منزہ سہام صاحبہ آداب! محفل دوستاں کیا غائب ہوا دوستوں کی آدھی ملاقات اور لبوں میں چہکتی مسکراہٹ ہی روٹھ گئی۔ معلوم نہیں کس صاحب سرکار کے مشورہ پر عزت مآب محترم انکل سہام مرزا کی یادگار محفل دوستاں (چوپال) کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ خیر جی ہم تو اپنے ہاتھ بطور احتجاج کھڑے کر کے عرض ہی عرض کر سکتے ہیں کہ سلسلہ دوبارہ شروع کر کے انکل سہام مرزا کی یاد تازہ کی جائے۔ باجی رضوانہ کوثر غائب تھیں حالانکہ فون پر ان کا رابطہ تمام سچی کہانیاں رائٹرز سے رہتا ہے میری دعا ہے باجی ہمیشہ اپنی ان اچھی خوبیوں کے ساتھ سلامت رہیں آمین۔ باجی تحسین جونیجو کا لیٹر انسانیت کے حوالے سے اچھا لگا ہے باجی زرینہ جونیجو کو بھی حاضر ضرور لگوانی چاہیے۔ سسٹر حمیرا وحید بہت خوش نصیب ہیں یک نہیں دو شد یعنی دو لیٹرز زینت احوال ہیں سسٹر واہ کینٹ میں ہماری دبنگ باجی ماریہ عرفان رہتی تھیں ماضی میں ان کی احوال اور محفل دوستاں میں آمد سے ہل چل سی مچ جاتی تھی اب کہاں ہیں؟ سسٹر دشمہ خان عروش آف بہاولپور آپ کی پہلی آمد پر ویلکم! ہماری ایک سسٹر باجی بشریٰ صاحبہ بھی بہاولپور سے شریک محفل ہوتی تھیں۔ ملازم حسین شیرازی کا کافی لمبا چوڑا خط لکھ دیا ہے۔ عبدالغفار عابد آپ تو ہمارے پرانے ساتھی ہیں سلام

قبول ہو سرمد عباسی کہاں ہیں؟ نفیسہ آنٹی بھی شریک محفل تھیں سلام قبول کریں۔ معروف شاعرہ باجی شگفتہ شفیق صاحبہ یورپ یاترا سے وقت نکال کر سچی کہانیاں کی یاترا کرنے بھی پہنچ ہی جاتی ہیں جو باجی کی سچی کہانیاں کے ریڈرز سے سچی محبت کا ثبوت ہے اور ان کی شاعری تو ہر دلعزیز ہے ہی لیکن ان کا انداز تحریر بھی بہت دیدہ زیب ہوتا ہے۔ شاہد مور کا تعارف دلپسند تھا۔ اب بات کرتا ہوں اپنی مہمان خصوصی یعنی باجی پروفیسر صفیہ سلطانہ مغل صاحبہ سے آج وہ غیر حاضر ہیں لیکن اپنی شاعری کی بدولت پوری دنیا میں جہاں جہاں بھی اردو پڑھنے والے رہتے ہیں وہ ان کے نام اور کلام سے متعارف ہیں اور واہ واہ کی گونج سے انہیں یاد رکھتے ہیں ان کا نیا دوسرا مجموعہ کلام میرا درد کیسے غزل ہوا ہے انہیں پھر مبارکباد باجی منزہ سہام صاحبہ نے سچی کہانیاں کو ہر دلعزیز بنانے کے لیے کافی محنت کی ہے ان کی محنت بھرپور رنگ لا رہی ہے انعامات دینے کا سلسلہ بہت خوب ہے۔

☆ بھائی خالق! آپ بھی آواز دیجیے اُن لوگوں کو جو مصروفیات میں گم ہو کر سچی کہانیاں سے دور ہو گئے ہیں۔ آپ لوگوں کا ساتھ رہا تو سچی کہانیاں میں مثبت تبدیلیاں آتی رہیں گی۔

☚ ڈاکٹر محمد امین قتال پوری خانیوال سے لکھتے ہیں۔ باجی منزہ آداب تسلیمات مزاج بخیر عرض پرداز ہوں کہ پہلی بار آپ سے قلمی رشتہ قائم کر رہا ہوں امید ہے مزاج پر گراں نہ گزرے گا۔ بندہ ایک عرصے تک آداب عرض' جواب عرض' تسلیم عرض' سلام عرض' آداب جناب عرض میں نثر لکھتا رہا۔ پھر اچانک حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ گوشہ نشینی اختیار کرنا پڑی۔ دوستوں نے ہمت دی خاص طور پر برادرم عبدالغفار عابد اور جناب پرویز دولو صاحب نے جینے میں میری ہر طرح کی حوصلہ افزائی کی انہی کے حکم کی تعمیل میں ایک چھوٹی سی کاوش مقدر کا دوزخ لے کر قدم بوسی کی سعی کر رہا ہوں۔ امید ہے آپ میری اس پہلی کاوش کو قبولیت کا درجہ دے کر حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔ طفل مکتب ہوں اس لیے غلطیوں کا احتمال ہے مگر آپ کی رہنمائی اور دل جوئی پر مکمل اعتماد اور یقین ہے آپ کی اصلاح اور محبت سے مزید بہتر لکھنے میں مدد ملے گی۔ یہ ایک مکمل سچ ہے یہ کہانی ہمارے معاشرے میں زندہ رہنے والے کرداروں پر گواہی ہے اس میں کسی کو اپنا عکس نظر آئے تو محض اتفاق ہوگا۔ کوئی اسے اپنی نشاندہی نہ جانے نفرت اور طنز کے بھاری پتھر نہ پھینکے ما لکہ اپنی اصلاح کرے تمام کرداروں کے نام فرضی مگر حالات کی سنگینی سچ سے عبارت ہے واقعات کو کہانی کا روپ دیا گیا ہے۔ مجھے خوشی ہوگی جو میری کہانی پر تنقید برائے اصلاح کرے گا۔

☆ امین بھائی! اللہ آپ کی ہر مشکل دور فرمائے آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں مگر جلدی پڑھ کر بتاؤں گی بس آپ اپنی حاضری احوال میں یقینی بنائیں۔

☚ حافظہ مون شاہ سرگودھا سے لکھتی ہیں۔ قابل احترام آپی منزہ سہام السلام علیکم! تمام حمد و ثناء اللہ کے لیے جو تمام جہانوں کا رب ہے اور کروڑوں درود و سلام حضرت محمد ﷺ کی ذات پر جو منزہ عن العیوب ہیں۔ سلام اُن کی آل واصحابؓ پر...... سب سے پہلے میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ نے انتہائی محبت سے مجھے طویل غیر حاضری کے بعد خوش آمدید کہا۔ جس پر ڈھیروں خوشی ہوئی خدا سے آپ کی صحت و سلامتی کے لیے دعا گو ہوں۔ شب یلدا حاضر خدمت ہے امید کرتی ہوں کہ توقعات پر پوری اتر کر محبوب رسالے کی زینت بنے گی۔ شب یلدا کے بارے میں یہ بات واضح کرنا چاہتی ہوں کہ اس کے لکھنے کا مقصد منفی رویوں کو فروغ دینا نہیں ہے۔ بلکہ منفی رویوں کے اسباب کا جائزہ لینے کی اپنی سی کوشش ہے۔ میں نے حقیقت پسندی سے کام لے کر فطری مسئلے کی نشاندہی کرنا چاہی ہے۔ کیونکہ انسان خطا کا پتلا ہے اُس سے کبھی بھی خطا کی توقع کی جا سکتی ہے۔ شب یلدا اُن لوگوں کی کہانی ہے جو امید و بیم کے درمیان لٹکتے رہتے ہیں لیکن ہر کسی کا

دعائے مغفرت

سچی کہانیاں اور دوشیزہ کی مصنفہ انیلا احمید کے شوہر اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو گئے۔ اللہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

نظریہ جدا ہوتا ہے۔ نظریہ جدا ہونے کے باوجود درد مشترک ہے۔ اس کہانی میں معاشرتی مسائل بھی ہیں۔ مذہب کا رنگ بھی ہے تصوف کی جھلک نمایاں ہے۔ نفس کی کارگزاریاں بھی ہیں اور عشق کا نغمہ بھی ہے دوری کی کسک انتظار کی گھڑیاں اور ریاضت کا ثمر بھی موجود ہے۔ امید کرتی ہوں کہ آپ سب پیام کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ آخر میں محبوب رسالے کی ترقی کے لیے دعا کرتی ہوں۔ اور تمام قارئین اور لکھاریوں کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار...... اس یقین کے ساتھ اجازت چاہتی ہوں کہ انشاء اللہ میرا اور سچی کہانیاں کا تعلق اب ہمیشہ برقرار رہے گا۔

☆ پیاری حافظہ مون! مجھے تمہارا دوبارہ سچی کہانیاں سے جڑنا بہت اچھا لگا...... منفی رویوں نے ہمارے پورے معاشرے کو ہی نقصان پہنچایا ہے بہرحال اب تمہاری مدیرہ کسی کے ساتھ زیادتی نہیں ہونے دے گی لہٰذا بے فکر ہو کر احوال میں بھی شرکت کیا کرو کہانی جلد شائع کروں گی۔

☆☆......☆☆......☆☆......☆☆......☆☆......☆☆

اردشمے خان عروش بہاول پور سے لکھتی ہیں۔ منزہ سہام آپی' اسلام علیکم! ٹائٹل بس ٹھیک تھا...... غلام جو بنے سردار' غزالہ عزیز کی تحریر پڑھی ایسی دینی معلومات ہمیں ضرور پڑھنی چاہیے۔ فریدہ فری جی کا تعارف پڑھا بہت اچھا لگا فریدہ جی میں آپ کو بچپن سے پڑھ رہی ہوں اللہ آپکو صحت تندرستی عطا کرے آمین' اب آتی ہوں کہانیوں کی طرف خناس' حنا بشریٰ جی کی کہانی بہت اچھے موضوع کی طرف اشارہ تھا۔ بہو کی کھتا عظمیٰ شکور کی کہانی جاندار تھی' ہاجرہ عمران پیاری بہن کی کہانی نصیب قربانی حقیقی جزبے کو بیان کر رہی تھی۔ تتلیاں قید تھیں مقدر کی' سچ کہتی ہیں زریں قمر آنٹی لڑکیاں تتلیوں کی مانند ہوتی ہیں' جاوید راہی سر کی یہ حقیقت تھی' قسمت کا کھیل شیخ معظم الٰہی اور مریم شاہ بخاری کی گناہ گار بھی اچھی کہانیاں ہیں فاطمہ عبدالخالق کی کہانی تماشا پڑھ کے آنکھوں آنسو آ گئے' باقی سیگمنٹ بھی اچھے تھے۔ شعر و سخن میں سب کی شاعری اچھی تھی منزہ جی میں نے بھی اپنی شاعری اور کہانی بھیجی ہے امید ہے آپ کے معیار پے پوری اترے گی مزید یہ کہ جنہوں نے مجھے خطوط میں یاد رکھا انکی بہت شکر گزار ہوں محسن علی طاب کا بھائی کی بھی شکر گزار ہوں جنکی وجہ سے تحریریں بھیج سکی اللہ پاک سچی کہانیاں کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے آمین۔

☆ اردشمہ! سچی کہانیاں تمہیں اچھا لگ رہا ہے جان کر خوشی ہوئی تمہاری تحریر پڑھ کر بتاؤں گی کہ کب لگ رہی ہے۔

محسن علی طاب ساہیوال سے لکھتے ہیں۔ باجی منزہ سہام السلام علیکم! عرض ہے اللہ پاک آپ کو صحت و ایمان والی لمبی عمر عطا فرمائے آمین۔ آپی نزہت کے ساتھ گروپ فوٹو دیکھ کر دلی خوشی ہوئی آج یہ شمارہ اس مقام پر ہے تو اس میں بے شک آپ کی ذہانت کا داخل ہے۔ سچی کہانیاں ستمبر 2018ء کے شمارے کی ماڈل ویلکم کہتی محسوس ہوئی۔ الفاظ نہیں ہے آپ نے کڑوا سچ بولا' شکوہ کیسا؟ جلدی سے خطوط پر چھلانگ لگائی اور اپنا خط نہ پا کر دلی دکھ ہوا میری بہنوں کے خطوط بھی شامل نہ تھے۔ خیر آپ سے بات ہوئی آپ نے حوصلہ دیا بہت شکریہ'

نمائندہ خصوصی اوکاڑہ

جاوید راہی......0300-9479844

نظامی یار تمہیں نہیں یاد رکھوں گا تو کسے رکھوں گا۔ فیصل مشتاق کوشش ہوگی انشاء اللہ جلد میری تحریر سچی کہانیاں میں پڑھو گے۔ نظامی سچی بات ہے ریاض حسین شاہد دلبر جانی آ جائے تو مزہ آ جائے تو میں بھی آپ کے ساتھ ریاض کو پکارتا ہوں میرا پیغام بھی دے دیں۔ ملازم حسین شیرازی آپ کی محبت ہے بھائی سلامت رہو۔ مجھے جن کے خطوط اچھے لگے اُن کے اسماء گرامی ملازم حسین شیرازی' فیصل مشتاق' حسن نظامی' عبدالغفار' ڈاکٹر عمر شہزاد' مدیحہ گل اور مور شاہد تھے نئے آنے والوں کو دل سے جی آیاں نوں...... غزالہ عزیز کی اسلامی تاریخ کے اوراق سے عمدہ تحریر تھی۔ مصنفہ تنویر رؤف سے ملاقات شاندار رہی۔ تنویر نام پڑھ کر عمران سیریز یاد آ گئی مظہر کلیم صاحب کی اب عمران سیریز نہ پڑھ پاؤں گا آنکھیں بھر آئی۔ اس میں بھی ایک ایکشن ایجنٹ تنویر ہے۔ زریں قمر کی تحریر تتلیاں قید تھیں مقدر کی عمدہ تحریر بیان ہاجرہ عمران نصیب شاندار تحریر ہوگی کتھا عظمیٰ شکور پر مزاح تحریر تھی۔ پرنس کی آپی فریدہ جاوید کا تعارف اچھا لگا۔ خناس حنا بشریٰ معاشرے کا ایک رنگ دکھا رہی تھی تحریر گناہ گار مریم شاہ عمدہ لکھا۔ منزل کی جستجو محمد شہزاد ایک درد بھری تحریر اچھا لکھا۔ بوڑی شریف سے ارسال کردہ تحریر قلندری طریقت نے علم میں اضافہ کیا۔ ملتان سے فاطمہ عبدالخالق کی آمد بھی اچھی تھی عامل کامل اچھی جا رہی ہے۔ ڈاکے سے سیاست تک سبق آموز تھی۔ کولڈ فیئر آخری قسط ٹھیک تھی۔ واہ بھئی ساحل ابرو جن کا انتقام شاندار اچھی کوشش تھی۔ پاکستانی شوبز میں چٹ پٹی خبریں اچھی لگی۔ شعر و سخن میں جن کا کلام اچھا لگا اُن کے نام عثمان غنی' فیصل مشتاق' حسن نظامی' نفیسہ فضل اور عائشہ نور عاشا اچھا لگا۔ اس خط کے ساتھ کہانیاں ایک خوفناک نمبر کے لیے چڑیل بھیج رہا ہوں جگہ دیں دوسری تحریر کا نام سفاک قاتل ہے امید ہے قریبی اشاعت میں جگہ ملے گی انابیہ رحمٰن کی ایک غزل اور اروشمہ خان کی تحریر چھوٹی سی غلطی اور غزل بھی اسی خط کے ساتھ ہے جگہ دیں۔ باقی کہانیاں اور سلسلے شاندار اور اپنی مثال آپ تھے برائے کرم سوشل میڈیا پر کوئی گروپ نہ بنائیں ورنہ ارسال کی فروخت کم ہو جائے گی۔

☆ بھائی محسن! بروقت خط لکھنے کا شکریہ' محرم کی چھٹیوں کی وجہ سے سچی کہانیاں جلد پریس جا رہا ہے آپ کی کہانیاں موصول ہوگئی ہیں۔

✍ فریدہ فری لاہور سے لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! پیاری منزہ سہام کیسی ہیں سچی کہانیاں ملا اس میں اپنا تعارف پڑھ کر اچھا لگا تعارف لگانے کا بے حد شکریہ مگر میں نے ساتھ شاعری بھی بھیجی تھی وہ نہیں لگی سچی کہانیاں کی تو میں دیوانی ہوں افسانوں سے زیادہ مجھے کہانیاں اچھی لگتی ہیں۔ کرن شبیر کی کہانی ڈاکے سے سیاست' حسد کی آگ' جو ڈر گیا وہ مر گیا' اپنی جانو فاطمہ عبدالخالق کی تماشہ مزہ دے گئی تتلیاں قید تھیں' قسمت کے کھیل' حسد کی آگ' جن کا انتقام' خناس ایک سے ایک بڑھ کر کہانیاں بے حد اچھی لگیں۔ یہ خط میں کوہ مری سے لکھ رہی ہوں میں ہر موسم گرما میں کوہ مری جاتی ہوں۔ وہ تعارف میں نے ہاسٹل سے لکھا تھا میرے تین بھائی ہیں تینوں بھابیاں بے حد اچھی ہیں۔ ایک بھائی میرے پرنس افضل شاہین ہیں جو کہ بے حد مشہور رائٹر ہیں اور پروین افضل بھابی میری بے حد فیورٹ ہیں ابھی میری طبیعت بے حد خراب ہے سب کو دعا اور سلام

☆ فریدہ جی! اپنی صحت کا بہت خیال رکھیے لوگ آپ سے محبت رکھتے ہیں آپ کی طبیعت کی خرابی کا سن کر پریشان ہو جاتے ہیں۔

نفیسہ فضل کراچی سے لکھتی ہیں۔ پیاری بیٹی منزہ ہمیشہ خوش رہو' امید ہے بخیر و عافیت ہوگی بھابی رخسانہ اور تمام اسٹاف کو سلام دعا شکوہ کیسا بہت خوب منزہ ہم بھی اس موضوع پر صرف باتیں کر کے دل جلا کے رہ جاتے ہیں کاش حکومتی سطح پر بھی اس چیز پر غور کیا جائے۔ غلام جو بنے سردار زبردست تحریر ہے غزالہ عزیز ایسی کہانیاں لکھتی رہا کرو۔ معلومات میں اضافہ ہوتا ہے یہ حقیقت تھی جاوید راہی یہ کہانی بھی سچی کہانیاں کے کسی شمارے میں پہلے لگ چکی ہے نصیب حاجرہ عمران خان گاؤں اور شہر کی ملی جلی کہانی ہے' بہو کی کتھا عظمیٰ شکور اچھی بہویں اسی طرح نبھاتی ہیں جس طرح ثومی نے نبھایا۔ تعارف فریدہ جاوید فری آپ کا تعارف اچھا لگا خوش رہیے۔ خناس حنا بشریٰ اچھی تحریر ہے' قسمت کے کھیل معظم الٰہی ہم نے ایسی سوتیلی ماں دیکھی ہے جس نے اپنی عمر کے بچوں کو ایسے پالا ہے کہ ایک بیٹا جو اس وقت 90 سال کی عمر کے ہیں آج بھی اپنی سوتیلی ماں کو یاد کر کے روتے ہیں باقی تین بچے جواب اس دنیا میں نہیں ہیں بہت عزت و احترام کرتے تھے۔ گناہ گار مریم شاہ بخاری سبق آموز کہانی ہے رتبہ فجر نے بہت اچھا فیصلہ کیا۔ حصار سید علی ارسلان اگر یہ کہانی سچی ہے تو نا خلف اولاد کا یہی انجام ہونا تھا۔ منزل کی جستجو محمد شہزاد سلیم نے بہادری دکھائی کچھ بننے کی جستجو تھی تب ہی وہ کامیاب رہا حسد کی آگ کوثر اسلام برائی کا انجام تو برا ہی ہوتا ہے ناں جیسے ماسی خالدہ کا ہوا' قلندری طریقت تحسین جونیجو شاباش بیٹا اسی طرح کے بزرگوں کے قصے لکھتی رہا کرو دل کو بڑی تقویت حاصل ہوتی ہے۔ تماشا فاطمہ عبدالخالق کیا کہیں اس دنیا کو کیا ہو گیا ہے۔ ڈھاکہ بوائز الیاس فاطمہ اریان کاش سب بچے ہی ڈھاکہ بوائز بن جائیں۔ شاہ محمد قادری عامل کامل بہت دلچسپ ہے مگر کبھی سچی کہانی لگتی ہے کبھی ناول جو ڈر گیا وہ مر گیا نفیسہ سعید اکثر بدروحیں تنگ کرتی ہیں جن کا انتقام ساحل ابڑو میرے پاس بھی ایسی سچی کہانی ہے انشاء اللہ جلد لکھوں گی۔ آپ کی ڈائری دن بدن بہتر ہو رہی ہے۔ شعر و سخن سب ہی غزلیں اچھی ہیں پچھلے ماہ کی میری غزل پسند کرنے کا سب کا شکریہ مومینہ بتول محمد قاسم بلوچ ڈاکٹر عامر شہزاد بہت مبارک ہو آپ کی کہانیوں کو پسند کیا گیا انعام کی حقدار ٹھہریں تمام احوالیوں کو بہت ہی دعائیں ان سب بیٹے بیٹیوں کا شکریہ جو میرے خط پسند کرتے ہیں۔ ہاں اس مرتبہ میں احوال میں کیوں نہیں؟

☆ نفیسہ آنٹی سچی کہانیاں پسند کرنے کا شکریہ لیجیے اس بار آپ احوال میں ہیں۔

فیصل مشتاق قبولہ شریف سے لکھتے ہیں۔ السلام علیکم! پیاری آپی منزہ سہام اور تمام ساتھیوں کو محبت بھرا سلام' پچھلی مرتبہ میری غزل کو پسند کیا گیا اور اس مرتبہ خط بہترین قرار پایا اس پر میں پیاری آپی منزہ اور دیگر قارئین کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں ہر ماہ کی طرح سچی کہانیاں کا انتظار رہا۔ مجھے ادارہ کی جانب سے پرچہ آنا تھا مگر وہ موصول نہیں ہوا جس پر کافی افسوس ہوا میں نے مور شاہد بھائی کو اپنا مکمل ایڈریس بھی بھیجا مگر جانے کیوں پرچہ وصول نہیں ہوا۔ بالآخر میں نے بک اسٹال سے پرچہ خریدا۔ احوال میں تمام دوستوں کی شرکت بہت پسند آئی۔ ایم حسن نظامی کا خط اچھا لگا امان حیدر بھائی شکریہ ادا کر رہے تھے امان اللہ بھائی آپ کا خط مجھے ہمیشہ پسند آتا ہے اس بار بھی مختصر خط لکھا مگر ان کی تحاریر کا بے صبری سے انتظار ہے۔ ثمینہ مشتاق صاحبہ خط بہت جاندار رہا۔ انہیں میرا خط پڑھ کر ہنسی آئی اور انہوں نے میرے خط کو غالب کے خط کی یاد کہہ دیا اس سے بڑا اعزاز میرے لیے کوئی نہیں ثمینہ باجی میں تہہ دل سے آپ کا شکر گزار ہوں۔ سدا خوش رہیں آمین۔ فیصل ندیم بھٹی کا بہت مختصر سا خط پڑھا دیکھ کر حیرانی ہوئی پچھلی مرتبہ اتنا خوبصورت لاجواب خط اور اس مرتبہ اتنا ہی مختصر...... ایسا کیوں فیصل؟ فیصل ندیم بھٹی سے فون پر بات ہوئی وہ ایک اچھے انسان ہیں مزید ان کی کہانی کا سچی کہانیاں میں لگنے کا انتظار کر رہا ہوں۔ یہاں ایک بات جو واضح کرنا بہت ضروری ہے

فیصل ندیم بھٹی بھائی سرگودھا سے ہیں اور ان کا پورا نام فیصل ندیم بھٹی ہے جبکہ میرا نام فیصل مشتاق ہے اور میں قبولہ شریف سے تعلق رکھتا ہوں۔ اس شمارے میں ون خط میں میرے نام کے آگے سرگودھا لکھا تھا میں جانتا ہوں یہ کمپوزر کی غلطی ہے لیکن اگر انہیں آگاہ کر دیا جائے تو مجھے بہت خوشی ہوگی تا کہ وہ دونوں ناموں میں کوئی کوتاہی نہ کر سکیں۔ اس مرتبہ یہ حقیقت تتلیاں قید تھیں اور ایم شاہ بخاری کی گناہ گار سپرہٹ رہیں۔ عظمیٰ شکور نے بیچاری مظلوم بہو کی کتھا سنائی جو بلاشبہ سراہنے کے قابل ہے۔ فریدہ جاوید فری کا تعارف اچھا لگا مگر بہت مختصر سا تھا۔ حنا بشریٰ نے خناس میں خوبصورت لفاظی' پلاٹ اور کہانی سے سب کا دل جیت لیا۔ ہماری زندگی میں مختلف اچھے برے لمحات آتے ہیں مگر کچھ ایسے لمحات بھی ہوتے ہیں جب ہم بالکل ہمت ہار جاتے ہیں۔ ایسی ہی ایک کہانی منزل کی جستجو لیے محمد شہزاد حاضر تھے۔ اس نوجوان نے زندگی کے تمام برے حالات برداشت کیے بھی صبر کا ساتھ نہ چھوڑا کہانی نے بہترین سبق دیا۔ کرن شبیر کی مزاحیہ تحریر ڈاکے سے سیاست تک نے خوب ہنسی کا تہلکہ مچایا ویل ڈن' اس مرتبہ پاکستانی شوبز والا صفحہ دیکھ کر دل بہت خوش ہوا امید ہے یہ صفحہ برقرار رہے گا۔ ایم حسن نظامی کی غزل پسند آئی اس کے علاوہ عامر شہزاد کی غزل بھی بہترین رہی۔ مجھے بچپن سے خوفناک کہانیاں بہت پسند ہیں اس مرتبہ اداریہ کی طرف سے اگلی بار خوفناک کہانیاں بھیجنے کے لیے کہا گیا پھر کیا تھا میں نے فٹافٹ خوفناک کہانی لکھی اور اپنی خط کے ساتھ ارسال کر رہا ہوں۔ خوفناک پراسرار نمبر پڑھنے کے لیے بے حد پُرجوش ہوں۔ اس مرتبہ تفصیلی تبصرہ نہیں لکھ پایا کیونکہ میری طبیعت تھوڑی ناساز ہے۔ امید کرتا ہوں میں جتنی تحاریر آپ کو بھیج رہا ہوں تمام پسند آئیں گی۔ اگلے ماہ بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضری ہوگی۔

☆ بھائی فیصل! اعزازی کاپی بعض اوقات تاخیر سے ارسال کی جاتی ہے لیکن آئندہ ماہ سے آپ کو وقت پر ملے گی انشاء اللہ' ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہے جو نام کی مماثلت کی وجہ سے ہوئی اب آپ کے شہر کا نام درست کر لیا ہے۔ آپ کی تحریر ضرور پُراسرار نمبر کا حصہ ہوگی۔

ایم حسن قبولہ شریف سے لکھتے ہیں۔ قابل احترام پیاری بہنا جی! آداب عرض' سلام خلوص' امید ہے آپ اور پرچے سے جڑے بھی احباب بخیریت ہوں گے۔ ستمبر کا پرچہ اپنی تمامتر حشر سامانیاں سمیٹے جلوہ گر ہوا۔ آپ کی شیریں زبان نے ہر قاری اور لکھاری کو سچی کہانیاں کی طرف مائل کر دیا اور یہ کئی ایک دوسرے رسائل سے سبقت پر چلا گیا۔ آپ جس دل گی۔ خلوص' ذہانت اور محنت سے اسے ترتیب دے رہی ہیں بلاشبہ سراہنے کے قابل ہے۔ ہر تحریر اصلاحی موثر اور اچھوتی ہے۔ آپ ہر اس تحریر کا انتخاب کرتی ہیں جس کے الفاظ و فقرات جاندار' بامعنی اور بامقصد ہوں اور تحریر سے کوئی ایک سبق نکلتا ہو۔ اور یہ سبھی کچھ ایک کامیاب ایڈیٹر کے مرہون منت ہے۔ آپ کے اداریے میں بھی آپ کی ذہانت اور قابلیت کا رنگ جھلکتا ہے۔ آپ ایک ہی صفحہ میں پوری کہانی تھوڑے سے الفاظ میں بیان کر دیتی ہیں جسے پڑھتے ہوئے دل شادمان ہوتا چلا جاتا ہے اور بندہ پرچہ پڑھے بنا نہیں رہ سکتا۔ احوال کی خوبصورت پھلواری میں رنگا رنگ کے پھول اپنی منفرد خوشبوؤں سے مہک رہے تھے۔ محمد حنیف' فیصل ندیم بھٹی کی مسکراہٹ یعقوب احمدانی کے وعدے' ثمینہ مشتاق کی جلبلی باتیں ارشد اقبال چوہان کے مفید مشورے' مدیحہ گل کی منفرد سوچ' ڈاکٹر عامر شہزاد کا منفرد تبصرہ' فیصل مشتاق کی مسکراہٹیں' عبدالغفار عابد کا اچھوتا خیال نسرین اختر نینا کی دلچسپی ملازم حسین شیرازی کی بامقصد گفتگو مور شاہد قمر کی پرچے میں دلچسپی' اُم مناہل کی شیریں زبان' خضر حیات کی مختصر پسندیدگی' عثمان غنی کا پرچے پر اچھوتا خیال بھی احباب کے منفرد لفظوں کی خوشبو دور دور تک بکھر کر ہر چہرے کو

اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے ناکافی تھی۔ پرچے کی پہلی اسلامی اور اصلاحی تحریر غزالہ عزیز کے حصہ میں آئی۔ انہوں نے ایمان افروز باتوں سے من کو خوش کر دیا اور وجود کے بھی حصے معطر ہو گئے۔ تعارف میں تنویر رؤف اور ہماری پیاری بہن فریدہ جاوید فری حاضری لگوا رہی تھیں ان کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔ فریدہ بہن کی دونوں بکس میں نے ریڈ کی ہیں بلاشبہ اچھی شاعرہ ہیں خداوند کریم انہیں تندرستی سے نوازے آمین۔ جاوید راہی صاحب نے حسینہ کے حسن پر فریفتہ ہونے والوں کی حقیقت سے پردہ اٹھا رہے تھے تو زریں قمر بہن مقدروں اور قسمت پر طبع آزمائی فرما رہے تھے۔ بلاشبہ لڑکیاں بھی تتلیاں ہی کی مانند ہوا کرتی ہیں۔ ہاجرہ عمران خان انسان کے نصیبوں پر عمدہ قلم چلا رہی تھیں۔ عظمیٰ شکور ساس بہو کے رشتوں پر محو گفتگو پائیں۔ حنا بشریٰ بھی عمدہ خیال لائیں ان کے تقرارت میں جان پائی قسمت کے کھیل جی ہاں کبھی کبھی تقدیر انسان سے منفرد اور نرالا کھیل کھیل جاتی ہے اور پھر گزرا وقت انسان کی دسترس سے دور چلا جاتا ہے۔ شیخ معظم الٰہی نے اچھا لکھا۔ مریم شاہ بخاری نے بھی گناہ گار منفرد زاویوں سے رقم کیا۔ سید علی ارسلان دولت کے حصار میں پائے اور لالچ کا نتیجہ موت ہی ہوا کرتی ہے۔ منزل کی جستجو میں کچھ لوگ عمر بھر سرگرداں رہتے ہیں اور کسی کو چند قدموں پر منزل مل جایا کرتی ہے محمد شہزاد جی یہ بس قسمت اور تقدیر کے کھیل ہیں بس ذرا ہمت اور حوصلے کی ضرورت ہوا کرتی ہے کوثر اسلام صاحبہ نے بھی حسد جیسے عنوان پر خوبصورت جذبات رقم کیے۔ تحسین جونیجو صاحبہ نے سخی لال شہباز قلندر کے بارے میں ایمان افروز اور معلوماتی تحریر رقم کی۔ فاطمہ عبدالخالق زمانے کے اتار چڑھاؤ اور نیک و بلا کا تماشا تحریر کر رہی تھی تو الماس فاطمہ ارمان سچے واقعات سے پردہ اٹھا رہی تھیں۔ پیر شاہ صاحب انسان اور تاغوتی طاقتوں کے مابین عمدہ اور معیاری لکھ رہے ہیں ان کی تیسری کڑی پسند آئی۔ نفیسہ سعید، نجیب عمر اور کرن شبیر بھی اپنی ذہانت میں ایک دوسرے کے مقابل ٹھہرے، تہمینہ جلیل عظیمی نے اپنے مضمون میں بہت سے ایمان افروز اسباق چھوڑے ساحل ابرو کے قلم میں بھی پختگی پائی۔ نیا سلسلہ پاکستانی شوبز بھی پسند آیا۔ ساتھیوں کی ڈائری سے خوبصورت اور بامقصد اقتباسات پڑھنے کو ملے۔ شعر و سخن کو ذرا سنوارنے کی ضرورت ہے۔ آپ نے پرچے پر جس قدر توجہ دے گی اور شوق سے محنت کی وہ سراہتے اور آپ کو داد دیے کی بنا نہیں رہ سکتے خداوند کریم آپ کو صحت و تندرستی سے نوازے اور پرچے کو آکاش کی بلندیوں کا چمکتا ستارہ بنا دے۔ اگلے ماہ تک کے لیے اجازت......

☆ حسن بھائی! آپ نے مجھے ذاتی خط لکھا اس کے جواب میں میں کہوں گی کہ میں بھی لوگوں کو خوب پہچانتی ہوں آپ کو سچی کہانیاں میں اب صرف وہی لوگ نظر آئیں گے۔ جو جھوٹی شہرت کے دیوانے نہیں ہیں۔ باقی آپ نے میری محنت کو سراہا مجھے اچھا لگا۔ سچی کہانیاں آپ کا رسالہ ہے اور کوئی آپ کو اس میں شامل ہونے سے نہیں روک سکتا۔

ارشد اقبال چوہان جڑانوالہ سے لکھتے ہیں۔ السلام علیکم! سچی کہانیاں کے تمام متعلقین کی خیریت صحت کے لیے دعا گو ہوں۔ سب سے پہلے اللہ کا شکر اور پھر آپ کا شکر کہ آپ نے اتنے بڑے شہر کی نمائندگی کے لیے میرا انتخاب کیا۔ میری پوری کوشش ہوگی کہ میں اپنی ذمہ داری کو آپ اور دوسرے احباب کے تعاون سے پورا کرنے میں کامیاب رہوں۔ وعدہ اس لیے نہیں کہ وعدے ٹوٹ جاتے ہیں کوشش کامیاب ہو جاتی ہے۔ سرگودھا سے فیصل بھٹی صاحب کا شکریہ کہ فون پر اطلاع دی کہ پرچہ آ گیا ہے۔ مگر جڑانوالہ میں نہیں، اُس دن فیصل آباد سے منگوایا، اور دو دن میں تقریباً مکمل مطالعہ کے بعد تحریراً حاضر ہوں۔ اس ماہ سے کوشش کروں گا کہ مختلف اسٹال پر رکھوں اور سرکولیشن منیجر صاحب کو اطلاع دوں۔ انشاء اللہ مل کر حکمت عملی طے کریں

گے کہ ہمارا پرچہ زیادہ سے زیادہ جگہوں پر دستیاب ہو۔ شکریہ لندن سے منشی عزیز صاحب کا ایس ایم ایس کر کے رابطہ کیا۔ آپ نے میرے ماہ اگست کے لیے لکھے ہوئے خط کو بھی ستمبر کے خط ساتھ ستمبر کے شمارہ میں شائع کر کے ریکارڈ بنا دیا ہے کہ ایک شمارہ میں ایک قاری کے دو خطوط' شکریہ میری بہن نے عید پر مبارکباد دی یقین کریں بے شمار احباب کے ایس ایم ایم اور ویڈیو آئے مگر جونشہ آپ کے مبارک باد دینے کا آیا وہ سب پر حاوی رہا۔ اب ذرا ستمبر کے شمارہ کی طرف احوال میں احوالیوں کی تحریریں پڑھ کر ایک الگ ہی مزہ آتا ہے۔ پڑھنے والوں سے درخواست ہے کہ احوال میں زیادہ سے زیادہ شمولیت کیا کریں اور تحریر مختصر تا کہ زیادہ دوستوں کو موقع ملے۔ غلام جو بنے سردار' علیحدہ قسم کا سلسلہ ہے جو عشق کا سبق دیتا ہے۔ جاوید راہی صاحب کی یہ حقیقت ہے اپنے ہی کسی شمارہ میں شائع ہو چکی ہے۔ ریکارڈ چیک کر لیں زریں قمر صاحبہ دعا کریں کہ سب تتلیاں اسی طرح آزاد ہو کر عمر بھر کے لیے قید ہو جائیں۔ حاجرہ عمران صاحبہ کی نصیب کا انجام بہت خوبصورت ہے کیونکہ ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ بہو کی کتھا' عظمیٰ شکور صاحبہ نے اس بات کو غلط ثابت کر دیا کہ میں بہو تھی تو ساس اچھی نہ ملی میں ساس بنی تو بہو اچھی نہ ملی۔ حنا بشریٰ کی خناس صرف دین سے دوری کی نشاندہی کر رہی ہے۔ مریم شاہ بخاری صاحبہ کی گناہ گار میں رتبہ نے جو کیا ایک مسلمان اور مشرقی عورت کے کردار کے عین مطابق کیا اور اللہ نے اجر دیا کہ دنیا والوں کی سزا نہ دی عزت سے اپنے پاس بلایا۔ سید علی ارسلان صاحب کی حصار اس بات کا ثبوت ہے کہ اگر ماں کے قدموں تلے جنت ہے تو باپ جنت کا دروازہ ہے محمد شہزاد صاحب کی منزل کی جستجو محنت کی عظمت کا ثبوت ہے۔ قلندری طریقت جونیجو صاحب کی ایک معلوماتی تحریر ہے۔ اُن کو خراج تحسین پیش ہے۔ کرن شبیر صاحبہ باز نہیں آئیں اُن سے حلف لیں کہ کیا یہ واقعی اُن کی تحریر ہے؟ مسلم خواتین ایک ایمان افروز تحریر' جس نے روح کو تازہ کر دیا۔ عامل کامل اور المناس بہت اچھی جا رہی ہیں۔ خط ذرا طویل ہو گیا ہے اس لیے تمام تحریروں پر تبصرہ نہ کیا۔ مگر ایک بات ہے ہر گزرتا دن ہمارے سچی کہانیاں کو نئے رنگ دے رہا ہے۔ اللہ کرے یہ اسی طرح دھنک کے رنگوں سے سجتا رہے آمین' تحریر میں کوئی غلطی' کسی کی دل آزاری ہوئی ہو تو معذرت' آپ کی رہنمائی کا طالب (نمائندہ کے طور پر) آپ کی مزید کامیابیوں اور سب کے لیے اللہ سے آسانیاں کی دعاؤں کے ساتھ اجازت۔

☆ بھائی ارشد! مجھے اپنے فیصلوں اور اپنے نمائندوں پر فخر محسوس ہوتا ہے جس طرح آپ لوگ اپنی بہن کا مان رکھتے ہیں وہ میرے لیے اثاثہ ہے۔ آپ نے درست کہا کہ خطوط مختصر ہوں تا کہ سب کو جگہ ملے' احوال دوستوں کی محفل ہے یہاں کسی کی پروموشن نہیں کی جا سکتی۔ کرن شبیر رابطے میں نہیں آ رہی ہیں لہٰذا اب اُن کی کوئی تحریر سچی کہانیاں کا حصہ نہیں ہوگی۔ میری پوری کوشش ہے کہ سچی کہانیاں کا معیار اولین دور جیسا ہو۔

✿ عامر شہزاد ننکانہ صاحب سے لکھتے ہیں۔ پیاری آپی منزہ سہام صاحبہ اسٹاف' شعرا' رائٹرز اور قارئین السلام علیکم! ستمبر کا شمارہ جلد مل گیا مکمل مطالعہ کے بعد زیر تبصرہ ہے ٹائٹل خوبصورت اور منفرد لگا سہام مرزا صاحب کی تصویر ہمیشہ کی طرح پیاری لگی آپی منزہ کا کالم ہمیشہ کی طرح بہترین ثابت ہوا جس میں انہوں نے معاشرتی مسائل کو احسن انداز سے اجاگر کیا۔ احوال میں محمد حنیف شاکر' فیصل ندیم بھٹی' ایم یعقوب احمدانی' ثمینہ مشتاق' ارشد اقبال' مدیحہ گل' فرزانہ نگہت' عظمیٰ صدیقی' امان حیدر' ایم حسن نظامی' فیصل مشتاق' عبدالغفار' نسرین اختر نیناں' ملازم حسین شیرازی' مور شاہد قمر' اُم مناہل' خضر حیات' ارشد اقبال چوہان اور عثمان غنی نے بہترین تبصرہ نگاری کی جس سے نا صرف نئے رائٹرز کی حوصلہ افزائی ہوگی بلکہ میرے جیسے رائٹرز ان کے مشوروں سے مستفید ہو کر اپنے آرٹیکلز میں نکھار پیدا کر سکیں گے۔ مومنہ بتول' محمد قاسم بلوچ' فیصل

مشتاق اور نفیسہ فضل محمود کے نام ونرز لسٹ میں آنے پر ان کو میری طرف سے بہت بہت مبارک' میرے آرٹیکلز پسند کرنے پر ملازم حسین شیرازی' عثمان غنی' خضر حیات' مور شاہد' اور ایم حسن نظامی کا تہہ دل سے شکریہ' غزالہ عزیز نے حضرت صہیب رومیؓ کے احوال زندگی پر روشنی ڈال کر دل خوش کر دیا یو آر گریٹ' شگفتہ شفیق نے آج کی مصنفہ میں تنویر رؤف پر اچھا لکھا۔ عظمیٰ شکور نے بہو کی کتھا میں بہتر انداز اپنایا۔ فریدہ فری صاحبہ یہ جان کر دلی خوشی ہوئی کہ آپ کی پسندیدہ ترین ہستی وہی مبارک ہستی ہے جو میری بھی پسندیدہ ترین ہے یعنی آقائے دو جہاں' رحمتہ اللعالمین تاجدار ختم نبوت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ......

جو لوگ عشق محمد ﷺ دل میں بسا لیتے ہیں
خدا کی قسم وہ خدا کی خدائی پالیتے ہیں

محمد شہزاد آپ نے منزل کی جستجو میں ثابت کر دیا کہ اللہ کے فضل سے کامیابی کی واحد شرط سخت محنت ہے۔ تحسین جونیجو صاحبہ آپ نے حضرت لال شہباز قلندر کی زندگی کے ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی جن سے کچھ لوگ نا آشنا تھے اور ان کے عرس پر ہونے والی غیر شرعی رسومات بیان کر کے اپنے راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کا ثبوت دیا جزاک اللہ' نفیسہ سعید نے بہترین پُراسرار کہانی لکھی مناہل جیسے کرداروں سے لوگوں کو عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ ان کے علاوہ جاوید راہی کی یہ حقیقت تھی زریں قمر کی تتلیاں قید تھیں مقدر کی' حاجرہ عمران کی نصیب' حنا بشریٰ کی خناس' مجیخ معظم کی قسمت کے کھیل' مریم شاہ بخاری کی گناہ گار سید علی ارسلان کی حصار' کوثر اسلام کی حسد کی آگ' فاطمہ عبدالخالق کی تماشا' الماس فاطمہ کی ڈھاکہ بوائز کرن شبیر کی ڈاکے سے سیاست' نجیب عمر کی ناقابل شناخت' تہمینہ جلیل کی مسلم خواتین اور ساحل ابرو کی جن کا انتقام بہترین اور منفرد کہانیاں ثابت ہوئیں سلسلہ وار کہانیاں بھی خوب رہیں انعامی سلسلہ اور مسئلہ یہ ہے بھی لاجواب' آپ کی ڈائری میں ہدایت علی' مسز نورین' فرح شاہد عابدہ مغل' عثمان غنی' بنش علی' یاسمین اقبال' مومنہ خان' حمیرا ظفری' عامر مغل' بسمہ احسن' اقبال علیم' نور فاطمہ' زینب شاہ اور شہزا عدیل نے بہترین اور معلومات سے بھرپور تحاریر لکھیں شعر و سخن میں عثمان غنی' ایم حسن نظامی' فیصل مشتاق' نفیسہ فضل' خولہ عرفان' دیا علی' عائشہ نور' وجیہہ ثانی' عرفان ستار' حمیرا راحت اور گل نے منفرد اور اعلیٰ شاعری تخلیق کیں۔ محمد حنیف شاکر صاحب ہمارے ہیڈ ماسٹر ہیں نہایت معزز اور قابل احترام آپ بہت بڑے رائٹر ہیں۔

☆ عامر بھائی! یقیناً استاد ہم سب کے لیے قابل احترام ہونے چاہئیں۔ آپ کو سچی کہانیاں میں چھپی کہانیاں اور دیگر سلسلے اچھے لگے خوشی ہوئی۔

پیر نوید شاہ ٹھٹھ سے لکھتے ہیں۔ آداب عرض' امید ہے کہ مع اہل و عیال بخیریت ہوں گی آمین۔ باجی' میں ایک سینئر ایوارڈز یافتہ ادیب ہوں اور آپ کے ادارہ کے ماضی کے پرچے ماہنامہ بچوں کا رسالہ' کی پیداوار ہوں۔ 30/32 برس قبل اس پرچے سے ادبی کیریئر کا آغاز کرتے ہوئے بچوں کے لیے پہلی کہانی تحریر کی تھی۔ الحمدللہ اعلیٰ قلمی' ادبی تربیت پائی اور خود کو خوب منوایا۔ باجی سچی کہانیاں کا برسوں سے باقاعدہ مطالعہ جاری ہے۔ احوال میں اس سے قبل چند ایک بار شمولیت رہی ہے۔ آج طویل وقفے کے بعد قلم اٹھایا ہے جس کی اہم وجہ پرچے کی بڑھتی ہوئی خوبصورتی ہے۔ اس بات میں کوئی دو رائے نہیں کہ مسند پر آپ کے براجمان ہونے کے بعد پرچے کو چار چاند لگ گئے ہیں۔ ہر شمارہ بلندی پر دکھائی دیتا ہے۔ بلاشبہ مالک مالک ہوتا ہے۔ وہ ہی اپنی چیز کو بہتر طور پر سنبھال سکتا ہے۔ یوں ہی اپنے مسند پر ڈٹ کر رہے گا۔ قارئین سے اپنا قلبی رشتہ بدستور قائم رکھے گا اب کسی اور کو حاکم بنانے کا سوچے گا بھی نہیں کہ اس کی قطعی ضرورت نہیں۔ ماہ

ستمبر کا جگمگاتا ہوا شمارہ 6 ستمبر کو ملا۔ تمام تر مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کے مطالعے میں جت گئے۔ جوں جوں مطالعہ کرتے گئے' ہندسے واہ...... واہ کی گردان کرنے لگے۔ کہانیوں میں یہ حقیقت تھی جاوید راہی' حصار سید علی ارسلان' تتلیاں قید تھیں زریں قمر' اول نمبر پر ثابت ہوئیں۔ نصیب حاجرہ عمران' خناس' حنا شرئی' گناہ گار مریم شاہ' جن کا انتقام ساحل ابڑو' بہو کی کتھا عظمٰی شکور' قسمت کے کھیل شیخ معظم' نے بھی متاثر کیا جبکہ منزل کی جستجو' حسد کی آگ' تماشہ' ڈھاکہ بوائز' جو ڈر گیا وہ مرگیا' ناقابل شناخت' ڈاکہ سے سیاست تک اور دیگر نے بھی خوب تفریح فراہم کی۔ یا کولڈ فیئر؟ کہانی تو نہیں البتہ سر درد ضرور ثابت ہوئی۔ مصنفہ کو ابھی قلمی تربیت کی اشد ضرورت ہے۔ قلندری طریقت میں تحسین جونیجو نے ہلا کے رکھ دیا۔ اُن کی حقیقت بیانی کا متعلقین کو نوٹس لینا چاہیے اولیاء اللہ کے مزارات پر ناچ گانا ہرگز نہیں ہونا چاہیے عامل کامل اور الماس معیاری ناول ہیں من کو بھا رہے ہیں۔ مصنفین کو مبارکباد' باجی چند گزارشات ہیں کہ سچی کہانیاں میں شائع شدہ سلسلوں کو کتابی صورت میں پیش کیا جائے۔ ٹائٹل کو سنگل کی جائے۔ املا کی غلطیوں پر نظر ثانی کیجیے فنی لحاظ سے کمزور کہانیوں کے لیے الگ گوشہ مختص کیجیے باجی سچی کہانیاں کے چند شمارے مس ہوگئے کہیں سے نہیں مل رہے آپ ارسال کردیں تو قیمت ادا کی جائے گی۔ پہلی بار ایک مزاحیہ تحریر 'قلمی کیڑا' ارسال خدمت ہے مع تصویر شائع کر کے ہمت افزائی کیجیے گا۔

☆ نوید بھائی یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے بچوں کے 'رسالے' سے لکھنے کا آغاز کیا۔ میری بھی پہلی کہانی 'بلی کانفرنس' اسی میں شائع ہوئی تھی۔ آپ کی آمد اچھی لگی۔ سچی کہانیاں میں چھپنے والی لکھاری یقیناً قابل تعریف ہیں جو اس قدر معیاری تصانیف ارسال کرتے ہیں امید کرتی ہوں کہ آپ کا اور ہمارا قلمی تعلق برقرار رہے گا۔ اور سب سے اہم بات تصویر تو آپ نے بھیجی نہیں میں کہانی کے ساتھ کیسے شائع کروں۔ اگر اب بھی بھیج دیں گے تو ضرور لگا دوں گی۔ خوش رہیے۔

☆ نعمان احمد آرائیں کوٹری سے لکھتے ہیں۔ السلام علیکم کے بعد عرض یہ ہے کہ عبدالغفار عابد صاحب آپ قانون جانتے ہوں گے وہ آپ کو اور ساحل ابڑو کو معلوم ہوگا کہ ادب کے قانون میں تھوک کے چاٹنے کی کوئی شق موجود نہیں ہے کیونکہ آپ دونوں ہی رائٹر ہیں میں تو ایک احوالی ہوں جو صرف رسالہ پر تبصرہ کرتا ہوں۔ میں ادب کے قانون کے بارے میں نہیں جانتا وہ آپ رائٹرز کا کام ہے۔ افتخار چوہدری کی فل اسٹاپ محبتیں کے قصے پر مبنی ہے۔ الماس فاطمہ کی جو کیا تھا وعدہ ایک مختلف کہانی ہے۔ عورت کو ووٹ دینے کی پوری آزادی ہے کچھ لوگوں کے اجازت نہ دینے کی وجہ سے آپ نے تمام اچھے برے لوگوں کو ملا دیا ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ ایک ماں باپ کے بچوں کی سوچ ایک جیسی ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں تو عورت کو ہر قسم کی آزادی ہے۔ میری تو کزنیں سرکاری ملازمت کر رہی ہیں آپ نے تو ووٹ کی آزادی کے بارے میں لکھا ہے آپ پہلے ہی دلائل کے ساتھ تنقید کرتے تو کیا ہی بہتر ہوتا تو نہ ہی آپ کو اپنی صفائی پیش کرنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ مدیر اعلیٰ منزہ سہام صاحبہ جی ساحل ابڑو نے اپنے تبصرے میں یہ سطر لکھی کہ یہ میرا احوال میں آخری خط ہے آپ نے کہا کہ یہاں آپ نے میری اور رسالے کی بے عزتی کی ہے پھر عرصے سے آپ کے بنا اجازت نیٹ پر اب لوٹ ہو رہے ہیں جس کے خلاف آپ قانونی کارروائی کرائیں گے۔ اسی وجہ سے آپ نے ڈی جی ایف آئی اے سائبر کرائم سے ملاقات کا وقت لیا تھا۔ یہی بات میں عبدالغفار صاحب کو سمجھانا چاہتا ہوں۔ اس لیے میں نے اپنے جولائی کے تبصرے میں لکھا کہ ساحل ابڑو اگر آپ کی سوسائٹی اور ادارہ سرکاری طور پر رجسٹرڈ ہیں تو آپ قانونی رد عمل کروا سکتے ہیں۔ کیونکہ عابد صاحب نے ساحل ابڑو

کے ساتھ ساتھ ایک فاؤنڈیشن پر بھی تنقید کی جو کہ غلط ہے کہ اس میں کئی اور رائٹرز بھی شامل تھے۔ مدیر اعلیٰ آپ کا بھی کہنا ہے کہ ادارے یا رسالے کو نشانہ بنانا بھی ادب کے دائرے سے باہر ہے' عابد صاحب اتنی سی بات کو دل پر لے گئے۔ آپ نے عورت آزادی کے بارے میں لکھا تو ایک واقعہ آپ کے گوش گزار کردوں کہ کچھ عرصے پہلے اسلام آباد میں ایک مظاہرہ ہوا تھا جس میں ایک این جی او کی طرف چند لیڈی سوشل ورکرز نے نعرہ لگایا کہ اپنا جسم اپنی مرضی تو کیا یہ آزادی دے دینی چاہیے۔ مور شاہد کا تعارف اچھا لگا۔ میں جولائی کے شمارے پر تبصرہ نہ کرسکا کیونکہ میرا چھوٹا بھائی جو کہ آرمی میں تھا جو ایک آپریشن میں 2 جولائی کو شہید ہوگیا تھا۔ سچی کہانیاں میں شامل تمام سلسلے اچھے ہیں۔ ایک اچھا سلسلہ اپنے اختتام کو پہنچا آخر میں تمام احوالیوں قارئین اور رائٹرز کے لیے سلامتی خوشحالی تندرستی کی دعا اور جن کے عزیز و اقارب اس دنیائے فانی سے پردہ کرچکے ہیں ان کے لیے دعائے مغفرت اور میرے شہید بھائی کے لیے بھی دعا کریں۔

☆ نعمان بھائی لڑائی جھگڑے کی باتوں کو طول دینے کا کیا فائدہ یہ بات جتنی جلدی سمجھ میں آجائے اتنا اچھا ہے آپ کے بھائی کے بارے میں جان کر فخر محسوس ہوا کہ ہم بھی شہدا سے نسبت رکھتے ہیں۔ شہید تو بخشے بخشائے ہیں بہت بڑا درجہ ہے شہید کا شمارہ پسند کرنے کا شکریہ۔

✎ عبدالغفار عابد چیچہ وطنی السلام علیکم! اس دعا کے ساتھ آغاز کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کے دلوں میں انسانی جذبہ پیدا کردے آمین تاکہ ہم انسانیت کی بھلائی کے لیے کام کریں۔ عرفان کے میدان میں نبی کریم ﷺ کا آخری پیغام بھی یہی تھا فرمایا لوگو دعا اور آخرت کی کامیابی اجتماعی زندگی جینے میں ہے' ہم نے عرفات کے میدان والا یہ اہم پیغام بھلا دیا ہے اس لیے تو باجی منزہ کو شکوہ کیسا؟ گلہ کیوں؟ لکھنے کی ضرورت پیش آتی۔ آج ہم جس وطن میں رہتے ہیں اس کے لوگوں نے اپنی تاریخ بھلا دی ہے اقرار کو پس پشت ڈال دیا ہے اور ماضی کی خوبیاں اب خامیاں سمجھی جانے لگی ہیں۔ اس ملک کے بانی قائداعظم محمد علی جناح کی اصول پسندی دیکھیں کہ ریاست سے ایک پیسے کا نہیں اٹھایا۔ ان کے بعد آنے والے لیاقت علی خان ایک نواب زادہ تھے۔ مگر اس ملک میں آکر عام شہری کی حیثیت اختیار کرلی۔ اپنی ریاست کے بدلے میں چاہتے تو قانونی طریقے سے بہت سی املاک الاٹ کروا سکتے تھے مگر ایسا سوچا بھی نہیں اور بھی کتنے ہی عظیم انسان تھے جنھوں نے دنیا کا مال نہیں بنایا۔ کردار کو داغ دار نہیں ہونے دیا اصولوں پر کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تحریک آزادی کی صف اول کی قیادت کوئی بڑی جائیداد نہیں چھوڑ کر نہیں گئی ان کے نام اربوں روپے کے بینک بیلنس نہیں تھے نہ ان کی بیرون ملک جائیدادیں مگر ان کے نام تاریخ میں سنہری حروف سے لکھے گئے ہیں۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان عظیم لوگوں کی جگہ پانے والے رہنما' اقتدار اور معیار میں ان سے بہت پیچھے ہیں۔ لوگوں کو ذاتی مفادات اور لالچ کھا گیا۔ یہ وطن یہ دھرتی ماں یہ پاکستان نعمت خداوندی ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ جس نے بھی اس خدائے واحد کی دی ہوئی نعمتوں کی ناشکری کی وہ رسوا ہوئے جنھوں نے اس نعمت کا شکر ادا کیا خدا نے اور نوازا' اے وطن کے حکمرانو اور نوجوانوں اس نعمت خداوندی کی حفاظت کے لیے قدم بڑھائیں اور ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر دعا کریں خدا کرے میری ارض پاک پر اترے وہ فصل گل جسے اندیشہ زوال نہ ہو' باجی منزہ کے علاوہ کوثر اسلام کے حسد آگ' سید علی ارسلان کی حصار' مریم شاہ بخاری کی گناہ گار شیخ معظم الٰہی کی قسمت کے کھیل' عظمیٰ شکور کی بہو کی کتھا' زریں قمر کی تتلیاں قید تھیں مقدر کی یہ سب تحریریں ناکام معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں آج محبت کرنا بھی جرم کے زمرے میں آتا ہے اس موضوع پر جاوید راہی نے یہ حقیقت تھی بہت اچھی تحریر لکھی۔ منزل کی جستجو محمد شہزاد نے اپنی اس تحریر میں

مایوس لوگوں کو پیغام دیا ہے شبیہہ مظہر رانجھا کی تحریر یا کولڈ فیئر کا دوسرا اور آخری حصہ پڑھا جس کی تعریف میں لکھنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ شازلی سعید مغل کی سلسلے وار الماس اپنی دلچسپی برقرار رکھے ہوئے ہے۔ باجی منزہ میں نے اگست کا اداریہ دوبارہ پڑھا ہے اپنی ہار یا جیت کو نظر انداز کرہی کہنا چاہوں گا کہ میرا مقصد صرف نام کی حد تک تھا رہی بات چھیڑ چھاڑ کی یہی بات بھائی ملازم حسین شیرازی کہہ رہے تھے آپ دونوں بہن بھائیوں سے کہہ رہا ہوں کہ میں اس بارے میں احتیاط کی پوری کوشش کروں گا وعدہ نہیں کیونکہ میں اپنی فطرت سے مجبور ہوں ارادب کی توہین مجھے گوارہ نہیں اب اگلی ملاقات تک اجازت چاہوں گا۔

☆ عابد بھائی! سچ کہا آپ نے دنیاوی فائدوں نے ہمیں اندھا اور بہرہ کردیا ہے۔ ہم تو یہ بھی بھول چکے ہیں کہ اپنے ہر عمل کے لیے جواب دہ ہونا ہوگا۔ وہاں جھوٹی شان و شوکت' سازشی ڈرامے اور جھوٹی شہرت کچھ کام نہ آئے گی۔ میں بھی جانتی ہوں کہ آپ باز آنے والے نہیں اس لیے ایک خصوصی تیز طرار قینچی آپ کے خطوط کے لیے تیار کر رکھی ہے۔

☆ سعدیہ وحید سعدی اسلام آباد سے لکھتی ہیں۔ کیسی ہیں منزہ آپی' اللہ سے آپ کی آپ کے اسٹاف کی اور سچی کہانیاں کے سب قارئین اور لکھاریوں کی خیریت کی دعا گو ہوں اللہ آپ کو ہنستا مسکراتا رکھے اور مزید ترقیاں اور کامیابیاں دے۔ منزہ آپی میں آپ سے بڑی سخت قسم کی ناراض ہوں ڈیڑھ منٹ کے لیے کسی کہانی کا کوئی جواب نہیں دیا آپ نے اتنی تحریریں بھیجی نہ کوئی مراسلہ نہ کوئی نگارشات کچھ بھی نظر سے نہیں گزرا کیا یہ زیادتی نہیں ہے۔ اب ڈیڑھ منٹ ہوگیا ہے اس لیے ناراضگی ختم...... ہاہاہا' آپ کی مصروفیات کا اندازہ ہے دو رسالوں کو دیکھنا آسان کام تو نہیں ہوتا اللہ آپ کو اسی طرح کامیابی و کامرانی عطا فرمائے آمین۔ اب آتی ہوں اس ماہ کے شمارے کی طرف' آپ کا شکوہ بالکل بجا ہے بلکہ یہ ہر پاکستانی کا شکوہ ہے۔ ہر تہوار پر اسی مناسبت سے کپڑے پہننے سے وطن سے محبت کا اظہار ضروری نہیں ہے یہ بیچارے غریب کا دل تھوڑا کرنے والی بات ہے اصل وطن سے محبت غربت کی ضرورت پوری کرنا اور ملک کی خدمت کرنا ہے اور رہی حکمرانوں کی بات تو ڈیئر آپی جیسی قوم ویسے حکمران یہاں ریڑھی بان سے لے کر چپڑاسی تک سب لوٹنے میں مصروف ہیں۔ تو حکمران پیچھے رہیں وہ تو بہتی گنگا میں ہاتھ دھونا اپنا فرض سمجھتے ہیں الہ سب کو ہدایت دے' غلام جو بنے سردار اُمِ ایمان کا ایمان افروز کالم تھا۔ آپی کیا میں بھی کسی موضوع پر کوئی اسلامی کالم بھیج سکتی ہوں؟ شگفتہ جی سے ملاقات اچھی رہی ہاجرہ عمران کی ہی کہانی رسم قربانی کے نام سے پاکیزہ میں بھی موجود تھی۔ بہو کی کتھا' ہلکی پھلکی تفریح اچھی لگی۔ نصیحت سب کو بری لگتی ہے مگر ہوتی فائدہ مند ہے یہ بات ہمیں دیر بعد پتہ چلتی ہے۔ حسد کی آگ واقعی سب کچھ جلا دیتی ہے باقی ابھی زیر مطالعہ ہے کیونکہ لیٹر جلدی پوسٹ کروانا ہے۔ شامل تو پتہ نہیں آپ نے کرنا ہے کہ نہیں ہاہاہا...... آپی یہ بھی پوچھنا تھا کہ دوشیزہ کے لیے بھی خط اور نگارشات ایک ہی لفافے میں بھیج سکتی ہوں دعاؤں میں یاد رکھیے۔

☆ پیاری سعدیہ! فکر مت کرو تمہاری کہانیاں ضرور شائع ہوں گی بس کچھ صبر اور دیکھو تمہارا خط احوال میں شامل ہے کیونکہ بروقت ملا...... تم مضمون بھیج سکتی ہو مگر مکمل تحقیق ضرور کرنا...... ہاں تم سب کچھ ایک ہی لفافے میں ارسال کردیا کرو۔

اس آخری خط کے ساتھ اپنی مدیرہ کو اجازت دیجیے اور سچی کہانیاں سے متعلق کوئی بھی بات ہو بلا جھجک مجھ سے کہیے۔ میں منتظر رہوں گی۔

دعاؤں کی طالب

منزہ سہام

غلام جو بنے سردار

حضرت خبابؓ بن ارت (سادس الاسلام)

غزالہ عزیز

سیدنا ابوعبداللہ خباب بن ارت کا تعلق بنو تمیم کے قبیلہ سے تھا۔

تاریخ اس معاملہ میں خاموش ہے کہ بنو تمیم کے اس خاندان پر کیا صعوبت نازل ہوئی کہ ان کے اس سپوت کو غلام بنا کر مکہ میں فروخت کر دیا گیا۔

وہ ام نماد بنت سباع الخزاعیہ کے غلام تھے۔

حضرت خبابؓ ہنر مند آدمی تھے۔ لوہے سے تلواریں اور نیزے بنانا ان کا پیشہ تھا۔ محنتی تھے لہٰذا معقول آمدنی ہو جاتی۔ مزے میں زندگی گزر رہی تھی۔ عین اسی زمانے میں رسول اکرم ﷺ نے حق کا آوازہ بلند کیا۔

حضرت خبابؓ نے بڑھ کر توحید کا دامن تھام لیا۔ وہ اسلام قبول کرنے والی اولین عظیم المرتبت ہستیوں میں شامل تھے۔

ان سے پہلے صرف پانچ افراد تھے جو ایمان کے شرف سے بہرہ مند ہوئے تھے یعنی حضرت خدیجہؓ حضرت ابوبکرؓ حضرت علیؓ حضرت زید بن حارثہؓ اور حضرت ابوذر غفاریؓ......

اس زمانے میں مکہ اہل ایمان پر تنگ تھا۔ اسلام قبول کرنا دنیا بھر کے مصائب اور اذیتوں کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

خود رسول اکرم صبح شام مشرکین مکہ کے طعن و تشنیع اور اذیتوں کا شکار رہتے تھے۔ ایسے عالم میں ایک بے یار و مددگار غریب الوطن غلام ان کے عتاب سے کیسے محفوظ رہ سکتا تھا۔

لیکن حضرت خبابؓ نے اسلام قبول کرنے کے بعد ایک دن کے لیے بھی اس کو اخفاء نہ رکھا اور یوں 'سادس الاسلام' کا لقب پایا۔

ان کی آقا ام انماد نہایت ظالم اور بے اولاد عورت تھی۔ علامہ ابن سعد کا بیان ہے کہ وہ خبابؓ کو لوہے کی زرہ پہنا کر دھوپ میں لٹاتی اور کبھی تپتے ہوئے لوہے سے ان کا سر داغا کرتی۔

اسلام لانے کے پہلے دن سے ان پر بے پناہ مظالم ڈھائے گئے۔ کبھی ان کو کپڑے اتروا کر دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا دیا جاتا اور سینے پر بھاری

پتھر رکھ دیے جاتے یا کوئی قوی الہیکل شخص سینے پر بیٹھ جاتا تاکہ کروٹ نہ بدلنے پائیں۔

حضرت خبابؓ جلتے ہوئے کوئلوں پر کباب کی طرح بھنتے، جسم کی چربی پگھل پگھل کر انگاروں کو ٹھنڈا کر دیتی، زخموں کا علاج نہ کیا جاتا، جس کے باعث زخم پیپ اور خون سے بھر کر ناسور کی شکل اختیار کر لیتے، لیکن تمام مظالم کے باوجود وہ حق کا دامن استقلال کے ساتھ تھامے رہے۔

رحمت عالم سرور کائنات ﷺ اس ظالم عورت کے مظالم کا حال سنتے تو بے حد دلگیر ہوتے حضرت خبابؓ کی دلجوئی فرماتے۔

اس بدبخت عورت کو رسول اکرم ﷺ کی دلجوئی اور ہمدردی کا علم ہوتا تو مزید جوش کے ساتھ مظالم ڈھاتی، ظلم و تشدد سہتے سہتے ایک عرصہ گزر گیا۔ ایک دن حضرت خبابؓ فریاد لے کر رحمت اللعالمین کی خدمت میں حاضر ہوئے اس وقت رسول اکرم ﷺ کعبہ کی دیوار کے سائے میں چادر سر کے نیچے رکھے آرام کر رہے تھے۔

حضرت خبابؓ نے رسول اکرم ﷺ سے عرض کیا۔

''یا رسول اللہ ﷺ اللہ کی مدد کب آئے گی؟''

یہ سن کر رسول اللہ ﷺ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ غصے سے چہرہ مبارک سرخ ہو گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔

''تم سے پہلے گزشتہ زمانے میں ایسے لوگ بھی ہوئے تھے کہ لوہے کی کنگھیوں سے ان کا گوشت نوچ ڈالا گیا اور سوائے ہڈیوں اور پٹھوں کے کچھ نہ چھوڑا گیا لیکن ان کا ایمان متزلزل نہ ہوا ان کے سروں پر آرے چلائے گئے، ان کو چیر کر دو ٹکڑے کر دیا گیا لیکن انہوں نے دین کو نہ چھوڑا۔''

اللہ ضرور اپنے دین کو کامیاب کرے گا اور تم دیکھ لوگے کہ اکیلا سوار صنعاء (یمن) سے لے کر حضر موت تک جائے گا اور سوائے عزوجل کے اس کو کسی کا ڈر نہ ہوگا۔

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد سن کر حضرت خبابؓ نے سر جھکا لیا اور صبر، حوصلے کا دامن مزید مضبوطی کے ساتھ تھاما اور گھر چلے گئے۔

حضرت خبابؓ کی آقا ام انمار پر مظالم کے نت نئے انداز آزماتی رہی۔

ایک دن حضرت خبابؓ نے رسول اکرم ﷺ سے اپنے لیے مدد کی دعا کی درخواست کی۔ حضور اکرم ﷺ نے دعا کی۔

''یا الٰہی خبابؓ کی مدد کر۔''

علامہ اثیر نے لکھا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی دعا کے بعد ام انمار کے سر میں شدید درد شروع ہو گیا اور درد کسی طرح کم نہ ہوتا تھا۔ وہ درد کی شدت سے کتوں کی طرح بھونکتی پھرتی تھی۔

حکیموں نے اس کا علاج یہ بتایا کہ سر کو لوہے سے داغا جائے۔

چنانچہ حضرت خبابؓ ہی کو یہ فرض سونپا گیا کہ وہ سرخ گرم لوہے سے اس کا سر داغیں۔ چنانچہ وہ لوہا جو ام انمار حضرت خبابؓ کو داغنے کے لیے استعمال کرتی تھی اب اس کو اسی کو داغنے کے لیے استعمال کیا جاتا لیکن اس اذیت ناک علاج کے باوجود وہ صحت یاب نہ ہو سکی اور اسی مرض میں تڑپ تڑپ کر مر گئی۔

مشرکین مکہ کے دلوں میں نفرت اور انتقام کی ایسی آگ تھی کہ وہ محض جسمانی اذیت دے کر ٹھنڈی ہونے والی نہ تھی لہٰذا وہ مالی نقصان کا بھی

کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔
عاص بن وائل مکہ کا ایک مشہور مشرک تھا حضرت خبابؓ کا کچھ روپیہ اس کے پاس باقی تھا وہ جب بھی روپیہ کی واپسی کا تقاضا کرتے وہ کہتا۔
''جب تک تم محمدﷺ کا دین ترک نہ کرو گے میں تمہیں ایک کوڑی بھی نہ دوں گا۔''
جواب میں حضرت خبابؓ فرماتے کہ جب تک دوبارہ زندہ ہوکر اس دنیا میں نہ آؤ گے میں محمدﷺ کا دامن نہیں چھوڑ سکتا۔''
عاص کہتا تو پھر انتظار کرو جب میں مر کر دوبارہ زندہ ہوں گا اور اپنے مال و اولاد پر متصرف ہوں گا تو تمہارا قرض لوٹا دوں گا۔
عاص دراصل اس طرح ایک طرف مسلمانوں کے عقیدہ آخرت کا مذاق اڑاتا اور دوسری طرف قرض کی ادائیگی سے بھی جان چھڑاتا۔
صحیح بخاری میں ہے کہ اس واقعہ پر قرآن کریم کی یہ آیات نازل ہوئیں۔
''اے محمدﷺ تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے ہماری آیات سے کفر کیا اور کہا کہ (قیامت بھی) مجھے مال اور اولاد دی جائے گی کیا اس شخص کو غیب کا علم ہوگیا ہے یا اس نے رحمٰن سے عہد لیا ہے ہرگز نہیں ہم اس کا یہ کہنا بھی لکھے لیتے ہیں اور اس کے لیے عذاب میں ڈھیل دیتے چلے جائیں گے اور جو کچھ یہ کہتا ہے اس کا ہم وارث ہوں گے اور یہ تنہا ہمارے سامنے لایا جائے گا۔''
(سورۃ مریم 14)
حضرت خبابؓ عرصے تک ظلم و ستم سہتے رہے آخرکار جب ہجرت مدینہ کا حکم ہوا تو وہ رسول اکرمﷺ سے اجازت لے کر ہجرت کر کے مدینہ چلے آئے۔
مدینہ میں رسول اکرمﷺ نے حضرت خبابؓ اور فراش بن صمہ کے غلام تمیم کے درمیان مواخات کرادی۔ حضرت خبابؓ نے تمام غزوات میں رسول اکرمﷺ کے ساتھ شرکت کی اور انتہائی شجاعت اور بہادری کا مظاہرہ کیا۔
حضرت خبابؓ اکثر رسول اکرمﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور آپﷺ سے دین کی تعلیم حاصل کرتے تھے ایک رات حضرت خبابؓ حضور اکرمﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ آپﷺ نے ساری رات نماز پڑھنے میں گزار دی صبح ہوئی تو حضرت خبابؓ نے عرض کیا۔
''یارسول اللہﷺ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں آج رات آپﷺ نے جیسی نماز پڑھی اس سے پہلے کبھی نہیں پڑھی۔''
حضور اکرمﷺ نے فرمایا۔
''یہ بیم و رجاء کی نماز تھی میں نے بارگاہ رب العزت میں اپنی امت کے لیے تین چیزوں کی دعا مانگی تھی جن میں سے دو چیزیں منظور ہوگئیں اور تیسری چیز منظور نہیں کی گئی جو دعائیں قبول ہوئیں وہ یہ تھیں کہ اللہ دشمنوں کو مجھ پر غلبہ نہ دے اور اللہ میری امت کو کسی ایسے عذاب میں ہلاک نہ کرے جس سے گزشتہ ہلاک ہوئیں تھیں۔
حضرت خبابؓ بے حد منکسر المزاج، سادہ طبیعت اور مستغنی فطرت تھے۔ ایک مرتبہ بہت سے اصحاب کے درمیان تشریف فرما تھے۔ ان اصحاب نے حضرت خبابؓ سے درخواست کی کہ آپ ہمیں کسی بات کا حکم کریں تاکہ ہم اس پر عمل کریں۔
انہوں نے فرمایا۔

"میں کون ہوں جو کسی بات کا حکم کروں۔ ممکن ہے کہ میں لوگوں کو کسی بات کا حکم کروں اور خود اس پر عمل نہ کرتا ہوں۔"

عہد فاروقی میں جب فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا اور غنائم کے ڈھیر کے ڈھیر مدینہ آنے لگے تو حضرت خبابؓ بعض اوقات بہت رویا کرتے اور فرماتے۔

"ہم نے رضائے الٰہی کے خاطر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہجرت کی اور ہمارا اجر اللہ کے ذمہ رہا۔

پھر ہم میں سے بعض تو ایسے تھے کہ مر گئے اور دنیا میں انہوں نے اپنے اجر کا کچھ پھل بھی نہ کھایا لیکن بعض کا پھل پک گیا اور وہ اسے توڑ کر کھا رہے ہیں مصعبؓ نے وفات پائی تو ان کو کفنانے کے لیے ایک چھوٹی سی چادر کے سوا ہمارے پاس کوئی چیز نہیں تھی۔

اس چادر سے ان کا سر ڈھانکتے تو ان کے پاؤں ننگے رہ جاتے اور پاؤں ڈھانکتے تو سر برہنہ رہ جاتا۔

آخر رسول اکرم ﷺ کے حکم کے مطابق ہم نے ان کا سر چادر سے ڈھانک دیا اور پاؤں پر اذخر گھاس کی ایک قسم ڈال دی۔

آج یہ حال ہے کہ اللہ کا فضل بارش کی طرح ہم پر برس رہا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے مصائب کا بدلہ ہمیں کہیں دنیا ہی میں تو نہیں دے دیا۔

حضرت خبابؓ سے تینتیس احادیث مروی ہیں انہوں نے 72 سال کی عمر میں وفات پائی۔ عمر کے آخری حصے میں کوفہ میں شدید بیمار ہو گئے۔ پیٹ کی تکلیف کے باعث ان کا پیٹ کو سات جگہ سے داغا گیا۔

جہالت اور شرک

(اے ایمان والو) یہ (مشرک) لوگ، اللہ کے سوا جن (دوسروں) کو پکارتے رہتے ہیں، انہیں گالیاں نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر اللہ کی شان میں بے ادبی کرنے لگیں۔ ہم نے تو اُسی طرح ہر گروہ کی نظر میں اُس کے عمل کو خوشنما بنا دیا ہے، پھر ان سب کو اپنے رب ہی کی طرف جانا ہے، اُس وقت وہ انہیں بتا دے گا جو کچھ بھی وہ کرتے رہتے تھے۔

(الانعام:108)

خوشنودی

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا: "اے مالک! جب تُو خوش ہوتا ہے تو کیا کام کرتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "جب میں خوش ہوتا ہوں تو بارش برساتا ہوں۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دوبارہ عرض کیا۔ "جب تو اور زیادہ خوش ہوتا ہے تو......؟"

فرمایا: "تو میں بیٹیاں پیدا کرتا ہوں۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر عرض کیا: "اے مالک دو جہاں! تو جب سب سے زیادہ خوش ہو تو کیا کرتا ہے؟"

فرمایا: "پھر میں مہمان بھیجتا ہوں۔"

(مرسلہ: اشعر کاشف۔ کراچی)

اس کی تکلیف بہت شدید تھی۔ فرماتے تھے کہ اگر حضور اکرم ﷺ نے موت کی تمنا کرنے سے منع نہ کیا ہوتا تو میں اپنی موت کی دعا کرتا۔

بیماری کی نازک حالت میں کچھ لوگ عیادت کے لیے آئے اور باتوں باتوں میں کہا۔

''اے ابو عبداللہ! خوش ہو جایئے کہ دنیا چھوڑنے کے بعد حوض کوثر پر اپنے بچھڑے ہوئے ساتھیوں سے ملاقات کریں گے۔''

یہ سن کر ان پر گریہ طاری ہو گیا اور فرمانے لگے کہ اللہ میں موت سے نہیں گھبراتا لیکن تم نے جن ساتھیوں کا ذکر کیا ہے انہوں نے دنیا میں کوئی اجر نہیں پایا۔

آخرت میں انہوں نے یقیناً اپنا اجر پا لیا ہو گا لیکن ہم ان کے بعد رہے اور دنیا کی نعمتوں کا اس قدر حصہ پایا کہ ڈر ہے کہ کہیں وہ ہمارے اعمال کے ثواب ہی میں تو جمع نہ کیا جائے۔

وفات سے کچھ دیر قبل جب ان کے سامنے کفن لایا گیا تو حسرت سے فرمایا۔

''یہ تو پورا کفن ہے افسوس حمزہ کو ایک چھوٹی سی چادر میں کفنایا گیا جو ان کے سارے بدن کو بھی نہ ڈھانک سکتی تھی۔

پیر ڈھانکتے تو سر کھل جاتا اور سر ڈھانکا جاتا تو پاؤں کھل جاتے تھے۔

آخر ہم نے ان کے پاؤں کو اذخر سے ڈھانک کر کفن پورا کیا۔

پھر انہوں نے وصیت کی کہ اہل کوفہ کی روایت کے مطابق مجھے شہر کے اندر نہیں بلکہ باہر کھلے میدان میں دفن کرنا اور یوں انہوں نے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔

وصیت کے مطابق انہیں شہر کے باہر دفن کیا گیا بعد میں کوفہ کے لوگ آپ کے پاس اپنے مردے دفنانے لگے۔

حضرت علیؓ جنگ صفین سے واپسی پر 37ھ میں کوفہ کی طرف واپس آئے تو شہر میں داخل ہونے سے پہلے انہوں نے شہر کے باہر سات قبریں دیکھیں آپ نے حیرت کا اظہار کیا اور کہا

''جب ہم یہاں سے گئے تھے تو یہاں پر کوئی قبر نہیں تھی اب یہ کس کی قبریں ہیں۔''

لوگوں نے جواب دیا۔

''یہ پہلی قبر حضرت خبابؓ کی ہے اور باقی وہ لوگ ہیں جن کو ان کی اتباع میں ان کے رشتہ داروں نے یہاں دفن کیا ہے۔''

یہ سن کر حضرت علیؓ کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں اور وہ دیر تک حضرت خبابؓ کے لیے اور دیگر اہل قبور کے لیے دعائے مغفرت کرتے رہے اور فرمایا۔

''خبابؓ پر خدا کی رحمت نازل ہو اور وہ اپنی خوشی سے اسلام لائے' اپنی خوشی سے ہجرت کی' ساری زندگی جہاد کیا اور خدا کی راہ میں مشکلات اور مصائب سہے' بے شک اللہ تعالیٰ اپنے نیکوکار بندوں کے عمل ضائع نہیں کرتا۔''

حضرت خبابؓ وہ اولعزم صحابی تھے کہ جنہوں نے غریب الوطن مسکین اور بے کس غلام ہونے کے باوجود اسلام لانے میں دیر نہ کی اور 'سادس الاسلام' کا لقب پایا۔

انہوں نے حق کی راہ میں ایسے ایسے عذاب اور اذیتوں کا سامنا کیا کہ جس کا حال سن کر بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ بے قرار ہو جاتے تھے۔ انہوں نے عزیمت کی راہ اختیار کی اور کبھی بھی اس میں کمزوری نہ دکھائی خدا ان سے خوش ہو اور وہ خدا سے خوش ہوں۔

☆☆......☆☆

لالہ موسیٰ کی خوبصورت آواز

نعت خواں

قاری محمد عثمان

حافظہ سون بخاری

قدرت کے عطا کردہ تحفوں میں سے ایک انمول تحفہ حسین آواز بھی ہے۔ قارئین ہم دیکھتے ہیں کہ گلوکار' آر جے' وغیرہ اپنی آواز کے ذریعے عوام کے دلوں پر راج کر رہے ہیں۔ کیونکہ سریلی آواز سماعتوں پر خوش گوار اثر ڈالتی ہے اور اگر اسی آواز میں سوز بلالی بھی شامل ہو جائے تو کیا خوب ہے؟ بلاشبہ وہ لوگ خوش نصیب ہوتے ہیں جو اپنی آواز کے سروں کو وقفِ ثنائے احمد نبی ﷺ کر دیتے ہیں۔ عہد نبوی ﷺ میں جلیل القدر صحابہ کرامؓ حضور ﷺ کے ثناء خواں نظر آتے ہیں۔ ان سب میں حضرت حسان بن ثابتؓ کو نمایاں مقام ثناء خوانی حاصل ہے کیونکہ بارگاہ رسالت ﷺ سے انہیں چادر مبارک مرحمت فرمائی گئی جو بارگاہِ نبوی ﷺ میں ثناء خوانوں کی تکریم کا ثبوت ہے۔

آقا ﷺ کا سب سے پہلا اور بڑا ثناء خوان خالق اکبر اور اس کے بعد قرآن مجید ہے۔ عصرِ حاضر کے تمام علماء کرام' مشائخ عظام اور ثناء خواں ہمارے نزدیک یکساں لائق احترام ہیں کیونکہ یہ وہ قابل قدر شخصیات ہیں جنہوں نے نہ صرف ہماری اصلاح کا کام کیا بلکہ ہمارے دلوں میں عشق نبی ﷺ کے جذبے کو فزوں تر کرنے کا فریضہ بھی انجام دیا۔ قارئین! حضور اکرم ﷺ کے ثناء خوان ہر خطے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اگر ہم بات کریں وطنِ عزیز پاکستان کی تو یہاں بھی حضور اکرم ﷺ کے بے شمار نعت خوان موجود ہیں۔ ہر ایک کا انداز منفرد اور دلکش ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی زبانوں کو حضور ﷺ کے ذکر سے تر رکھتے ہیں۔

قاری وحید ظفر قاسمی' پروفیسر عبدالرؤف روفی' مرغوب ہمدانی سے لے کر محمد شہباز قمر فریدی' قاری شاہد محمود قادری تک آقا ﷺ کا ہر ثناء خوان معزز اور انمول ہے۔ گلشن محمدی ﷺ کے انہی مہکتے ہوئے گلوں میں سے ایک نوخیز گل قاری محمد عثمان غنی قادری ہیں۔ جو اسمِ با مسمّی ہیں۔ سحر انگیز آواز کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ پُرکشش شخصیت کے مالک اور نہایت بااخلاق و باکردار انسان ہیں۔ آپ 6 نومبر 1986ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق

پنجاب کے شہر لالہ موسیٰ سے ہے۔
ان کا ستارہ عقرب ہے۔ قارئین کرام! محمد عثمان غنی کے غالباً پندرہ البم ریلیز ہو چکے ہیں۔ ان کو بچپن ہی سے ثناء خوانی کا شوق تھا۔ نکھری ہوئی آواز کی بدولت جلد ہی اپنا مقام بنانے میں کامیاب ہوئے۔ تجوید و قرآت کی تعلیم بھی حاصل کی اور مقابلہ حسن قرآت میں اول آئے۔

تجوید و قرآت میں ان کے استاد محترم قاری امجد علی قادری ہیں اور ہم عصر نعت خوانوں میں سید فصیح الدین سہروردی سے متاثر ہیں۔ ان کا پہلا البم 'یا محمد ﷺ میں تیرا دیوانہ' ہیرا پروڈکشن اور دوسرا البم اے آر وائی اور کیو ٹی وی سے ریلیز ہوا۔ 'آیا رمضان' نامی چوتھے البم سے انہوں نے شہرت پائی۔ مزاجاً سنجیدہ ہیں صاف گوئی اور نرم خوئی ان کی نامیاں خوبیاں ہیں۔ پسندیدہ کتاب قرآن مجید ہے جو اقوام عالم کے لیے ضابطہ حیات کا کامل ترین نمونہ ہے۔ کشف المحجوب' مکاشفۃ القلوب اور سفیران حرم بھی ان کی پسندیدہ کتابوں میں شامل ہیں۔ قاری محمد عثمان غنی کے نزدیک پسندیدہ ترین شخصیت حضور نبی اکرم ﷺ نور مجسم ﷺ کی ہے جبکہ حضرت عمر فاروقؓ اور سید نا امام حسین (علیہ السلام) کو وہ اسلامی تاریخ کا بہترین ہیرو مانتے ہیں۔

قاری عثمان غنی قادری سوفٹ ویئر انجینئر ہونے کے ساتھ ذاتی قائم کردہ اسٹوڈیو (ایچ ڈی ایس) کے حساب ڈیجیٹل اسٹوڈیو کے مالک ہیں اور اس کی نسبت حضرت حسان بن ثابتؓ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ آپ اسی فروری میں عمرہ کی سعادت بھی حاصل کر چکے ہیں۔ قارئین کرام زیر نظر گفتگو روایت سے کچھ ہٹ کر ہے۔

امید ہے آپ لوگ اس کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہوئے قیمتی آراء سے نوازیں گے۔

❖ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ کیسے ہیں آپ؟

☆ وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ و برکاتہ اللہ کا شکر ہے میں خیر سے ہوں۔

❖ سب سے پہلے میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کہ آپ نے اپنے قیمتی لمحات میں سے کچھ وقت ہمارے لیے نکالا۔



☆ (مسکراتے ہوئے) سب سے پہلے میں بھی ادارہ سچی کہانیاں کا شکر گزار ہوں کہ عوام الناس فنکاروں کے احوال جاننے کی جستجو رکھتے ہیں اور آپ لوگ مذہبی شخصیات کی گفتگو چھاپ رہے ہیں یہ جذبہ قابل قدر ہے۔

❖ درست کہا آپ نے...... خیر عمرہ کا مبارک سفر کیسا رہا اور بہت مبارک ہو کہ یہ سعادت آپ نے حاصل کر لی۔

☆ جزاک اللہ سفر بہت اچھا رہا اللہ کریم سب کو یہ سعادت نصیب کرے آمین۔

❖ میرا پہلا سوال یہ ہے کہ آپ کس شاعر کے نعتیہ کلام کا انتخاب کرتے ہیں اور کلام منتخب کرتے ہوئے کس بات کا خیال رکھتے ہیں؟

☆ نعتیہ کلام کے لیے کسی مخصوص شاعر کا انتخاب نہیں کرتا۔ میں اب تک پیر سید نصیر الدین شاہ، نجم، شاکر، نعمان، وارثی، احمد علی حاکم، ضیاء، نیازی اور انور کے کلام پڑھ چکا ہوں یہ سب میرے لیے محترم ہیں۔ جبکہ کلام کا انتخاب کرتے ہوئے میں اس بات کا خیال رکھتا ہوں کہ اشعار کفریہ اور سوئے ادب نہ ہوں۔

❖ ماضی اور حال کے نعت گو شاعر حضرات میں آپ کو کوئی فرق نظر آتا ہے؟

☆ ماضی کے نعت گو شعراء کرام کا کلام اسلوب دار اور حسن ادب سے مرقع تھا۔ کوئی بات قرآن و سنت کے منافی نہ تھی۔ شعراء کرام کلام تخلیق کرتے ہوئے ادب کو ملحوظ رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام کی اثر آفرینی سدا بہار تھی۔ نبی اکرم ﷺ سے محبت کی چاشنی کلام کو جان دار بنا دیتی تھی۔ موجودہ زمانے میں شعراء نے نعت کے تقدس کو ملحوظ نہیں رکھا۔ سبھی شعراء کرام یکساں طور پر تو نہیں لیکن چند ایک ایسے ضرور ہیں جو حرمت کا خیال نہیں رکھتے جبکہ اکثر ابھی بھی دل جمعی اور توفیقِ خداوندی سے دل کش کلام تخلیق کر رہے ہیں۔ نعت شاعری کی وہ صنعت ہے جو نازک بھی ہے اور حساس بھی...... فی زمانہ جو گانا عوام میں مقبول ہو جاتا ہے۔ اگلے روز اس کی طرز پر نعت 'بنادی' جاتی ہے۔ معذرت کے ساتھ کہتا ہوں کہ ماضی میں نعت کہی یا لکھی جاتی تھی لیکن آج 'بنائی' جاتی ہے۔

❖ قاری صاحب اب تو نعت خوانی کو بھی پروفیشن بنالیا گیا ہے کیا کہتے ہیں آپ؟

☆ جی ہاں یہ افسوس ناک امر ہے حضور اکرم ﷺ کے ثناء خوانوں کو دنیاوی طمع سے کوئی علاقہ نہیں ہونا چاہیے۔ تاہم ابھی بھی بہت سے لوگ بغیر کسی حرص کے محض اللہ کی رضا کے لیے نعت خوانی کر رہے ہیں۔ ہر انسان کی خصلت کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ کون کس نیت سے کیا کر رہا ہے۔

❖ آپ کا پڑھا ہوا کلام 'تاجدار ختم نبوت زندہ باد' بہت مقبول ہوا۔ اس بارے میں کیا کہیں گے؟

☆ یہ کلام عمران عاجز صاحب کا لکھا ہوا خوبصورت کلام ہے۔ گزشتہ دنوں جو ملکی حالات 'قانون ختم نبوت' کے حوالے سے رہے۔ یہ اُن حالات کے پیش نظر حضور ﷺ سے محبت کے اظہار کا طریقہ ہے خدا قبول کرے۔

❖ مذہب کیا ہے؟

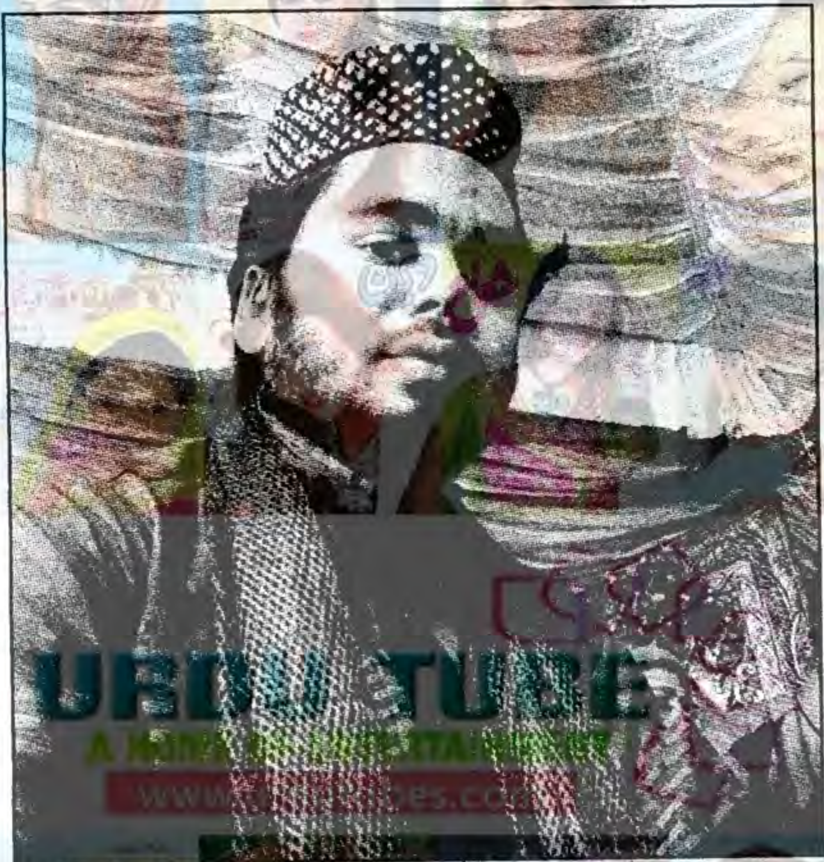
☆ مذہب انسان کی پہچان ہے وہ راستہ ہے جس پر چل کر ہم خدا کے قریب ہوتے ہیں۔

❖ کردار آپ کی نظر میں کیا ہے؟

☆ کردار وہ عمل ہے جس کے ذریعے لوگ ہماری شخصیت کو پرکھتے ہیں۔

❖ شریعت کیسا نظام ہے؟

☆ شریعت کا نظام ہمیں بتاتا ہے کہ ہم مادر پدر آزاد نہیں ہیں کہ روشن خیالی اور آزادیٔ اظہار



رائے کے نام پر جو چاہیے کریں اور جو چاہے بولیں اور نہ ہی شرع محض نماز روزے تک محدود دائرہ کار ہے۔ بلکہ شریعت ہماری زندگیوں میں نظم وضبط پیدا کرتی ہے۔ کاروباری' خانگی اور معاشرتی معاملات کو سمجھنے اور ان کے مسائل کے حل کا طریقہ بھی بتاتی ہے۔

❖ کیا شریعت وطریقت الگ ہیں؟

☆ ہرگز نہیں' شیخ عبدالقادر جیلانی' داتا علی ہجویری' اور بابا فرید کی مقدس تعلیمات سے اندازہ ہوتا ہے کہ شریعت وطریقت لازم وملزوم ہیں۔ جو اس کی نفی کرتے ہیں وہ صریح غلطی پر ہیں۔

❖ دنیا کیا ہے اور آپ کے نزدیک دولت کیا اہمیت رکھتی ہے؟

☆ دنیا دارالعمل ہے اور اسلاف کے نزدیک دنیا کسی مردہ بکری کے وجود سے بھی زیادہ ذلیل ہے جو کسی گزرگاہ پر پڑی ہو اور ہر راہ گیر اُسے ٹھوکر مار کر گزرے جبکہ دولت کو میں آزمائش سمجھتا ہوں۔

❖ دعا کیا ہے؟

☆ خدا کی قدرت پر یقین کا دوسرا نام دعا ہے۔

❖ آپ اپنے گزرے کل اور آنے والے کل کو کیسے واضح کریں گے؟

☆میں اپنے ماضی، حال اور مستقبل کو اپنے رب پر توکل اور اچھی امید سے واضح کروں گا۔

❖ محبت کیا ہے؟

☆محبت کے بغیر قربانی کی راہیں بالعموم مسدود ہو جاتی ہیں۔ حضور اکرم ﷺ کے لیے کائنات کا وجود میں آنا اور خالق کا ہمارے عیبوں کی پردہ پوشی کرتے ہوئے نوازتے چلے جانا محبت کی بڑی مثالیں ہیں۔ جبکہ اپنے حصے کی شے کسی دوسرے ضرورت مند کو دے دینا بھی محبت کی علامت ہے۔

❖ نفس کیا ہے؟ اس پر قابو پانا کتنا ضروری ہے اور اس پر کیسے قابو پایا جا سکتا ہے؟

☆نفس جذبات و خواہشات کا بے لگام گھوڑا ہے ضبط نفس کے بغیر کامیابی کا یقین خوش فریبی ہے حضرت ابوالحسن فرقانی فرماتے ہیں نفس کی ایک خواہش پوری کرنے سے اللہ کی راہ میں سینکڑوں رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں شیخ عبدالقادر جیلانی کے نزدیک موت کو یاد رکھنا نفس کی ہر بیماری کی دوا ہے۔ کسی انگریز فلسفی کا قول ہے کہ کردار کی مضبوطی میں دو صفات اہم ہیں۔ قوتِ ارادی اور ضبط نفس، گویا زندگی کی عظیم ترین کامیابی نفس کا مغلوب کرنا ہے۔

❖ معاشرتی بگاڑ کی کیا وجہ ہے؟

☆معاشرتی بگاڑ کی بہت سی وجوہات میں سے بڑی وجہ تربیت کا انحطاط، اخلاقی بحران اور سوشل میڈیا ہے۔ سوشل میڈیا پر موجود حیا سوز مواد انسانی ذہن کو پستیوں کی طرف دھکیل رہا ہے ایسے لوگوں کے خلاف حکومتی کارروائی ہونی چاہیے۔

❖ موجودہ دور کی عورت کو کس مقام پر دیکھتے ہیں؟

☆معاشرتی بے راہ روی کے سبب موجودہ عورت تباہی کے دہانے پر ہے۔ اس کا اصل مقام گھر کی چار دیواری اور پردہ ہے۔ اسی میں عورت کی بقا ہے۔

❖ آپ کی نظر میں صغیرہ و کبیرہ گناہ کیا ہے؟

☆صغیرہ گناہوں پر دلیری اور پختگی کبائر کا موجب ہے۔ میری نظر میں زبان سے نکلے وہ بول جو کسی کو اذیت دینے کا باعث بن جائیں صغیرہ اور دل توڑنا کبیرہ گناہ میں سے ہے۔

❖ عزم آپ کی نظر میں کیا ہے؟

☆کسی دانش ور کا قول ہے کہ وہ پانی میں اترتے وقت یہ مت دیکھے کہ پانی کتنا گہرا ہے یہ دیکھے کہ آپ کا قد کتنا ہے مطلب اپنے عزم کو جانچنا اور اعتماد رکھنا ضروری ہے اور یہی درست ہے۔

❖ سرزمین پاکستان سے کتنا لگاؤ ہے؟

☆پاکستان کی سرزمین کا یہ ٹکڑا میرے قدموں کو مضبوطی سے کھڑا رکھنے کیلیے بہت ضروری ہے۔ اور میں ہر محب وطن کی طرح پاکستان کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار ہوں۔

❖ قارئین کے لیے کوئی پیغام؟

☆حضرت علیؓ کا قول ہے "جو شخص ذرا سی مصیبت کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اللہ اسے بڑی مصیبتوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔" لہٰذا صبر و شکر کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ اپنی گفتگو میں اس بات کو یقینی بنائیں کہ آپ کا بولا ہوا لفظ کسی کی اذیت کا باعث نہ بن جائے اور سب سے بڑھ کر سنت نبوی ﷺ کو عام کریں۔

اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے آمین۔

قارئین کرام! قاری محمد عثمان غنی سے ملاقات اختتام کو پہنچی۔ آپ کو ان سے مل کر کیسا لگا بتانا مت بھولیے گا۔

☆☆......☆☆☆



اوکاڑہ سے ارسال کردہ تحریر

آخری گھاؤ

مرد کے ازلی ظلم کی داستان......

جب وہ خود کو زمین پر خدا سمجھنے لگتا ہے......

جاوید راہی

گوتم بدھ نے کہا تھا کہ زندگی دکھوں کا گھر ہے۔ ہسٹری کی کتاب میں پڑھا مگر کوئی بات پلے نہ پڑی۔ میری بربادی کا آغاز اسی روز سے شروع ہو چکا تھا جب میں چھٹی کلاس میں پڑھ رہی تھی میرے گھر والوں کا شمار محنت مزدوری کر کے بچوں کو پالنا اور سفید پوشی کو برقرار رکھنے والوں میں ہوتا تھا۔

میرے والد شہر میں دکان کرتے تھے یوں ہمارے گھر کی گزر اوقات ہوتی۔ ہم بہنیں بھائی تعلیم حاصل کر رہے تھے کچھ خواب ماں باپ دیکھ رہے اور کچھ ہم بُن رہے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا میرے والد گھر پر کام کر رہے تھے کہ ایک شخص جو شکل وصورت سے انتہائی شریف انسان دکھائی دیتا تھا میرے والد صاحب کے پاس آ کر رُکا۔ پہلے تو گھر والوں نے سمجھا کوئی کام ہوگا اسے مگر چند پل بعد وہ سیدھا اندر چلا آیا میں گھر کے کاموں میں لگی ہوئی تھی۔

اس شخص کو اچانک اندر پا کر بڑی پریشانی ہوئی مگر جلد ہی پتہ چل گیا کہ یہ صاحب جن کا نام فاروق ہے ہمارے دور کے رشتہ داروں میں سے ہیں اور اسی شہر میں کسی کام کے سلسلے میں وارد ہوئے ہیں اور مجھے دیکھنے کی غرض سے ہی ہمارے گھر آئے ہیں کیونکہ میرا رشتہ اپنے لیے مانگ رہے تھے۔

اس نے مجھے اور میں نے اسے دیکھ لیا بات یہاں ختم ہوگئی میں اپنی پڑھائی میں مصروف ہوگئی۔

دونوں خاندانوں میں ہمارے رشتوں کی بات چلتی رہی میں نے میٹرک پاس کر لیا اور گھر میں بیٹھ گئی اس کے بعد گھر کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے نوکری کر لی۔ بچوں کو تعلیم و تدریس کے ساتھ ساتھ سلائی کڑھائی کا کام بھی سکھاتی رہی اسی دوران میری منگنی فاروق سے ہوگئی۔

میری شادی جن حالات میں انجام پائی اس کا ذکر کرنا اس لیے مناسب نہیں کہ عزت والے

لوگ اپنی لڑکیوں کو بس اپنے گھر سے چلتا کرتے ہیں میرے سسرال والوں نے بھی اسی پر اکتفا کیا کہ مجھے بیاہ کر ہی لے گئے۔ میں نے اپنے میاں کے گھر کا ماحول دیکھا اور خود پر جبر کرتے ہوئے نبھا کرنے پر تیار ہوگئی۔

میری ہر ممکن کوشش ہوتی کہ میں کسی کو شکایت کا موقع نہ دوں مگر میری ساس روایتی ساس سے بھی زیادہ سنگدل واقع ہوئی۔

میرے میاں جو ابھی تک زیر تعلیم تھے ان کی حوصلہ افزائی پر میں ہر طرح کے ستم ہنس کر سہہ جاتی میرے ساتھ یہاں تک سنگدلی کا مظاہرہ کیا جاتا کہ افطاری پر سارا گھر برف والے مشروبات سے افطاری کرتا مگر میں اپنے کمرے میں خدا کا لاکھ بار شکر ادا کرتے ہوئے گھڑے کے ابلے پانی سے روزہ کھولتی۔

سارے گھر کا کام میرے ذمہ ہوتا' میرے سسر جو انتہائی سفاک انسان تھے میری حالت پر برہم ہو جاتے اور مجھ پر طعنہ زنی کی بوچھاڑ کر دیتے' میں تڑپ اٹھتی اور اپنے ناکردہ گناہ کی سزا تصور کر کے چپ ہو جاتی۔

سنا کرتی تھی کہ کچھ سسر نام کے سسر ہوتے ہیں اندر سے وہ شیطان صفت ہوتے ہیں اس کی مثال مجھے اپنے گھر میں نظر آتی تھی۔ میرا دیور مجھے اپنی طرف راغب کرتا جبکہ سسر صاحب کی عنایت اپنے اندر کسی اور جہان کی خبر دیتی۔

میں ثابت قدم کانٹوں پر رینگتی رہی مگر شکوہ



تک نہ کیا میرے شوہر اسی دوران لاہور شفٹ ہو گئے انہیں کام مل گیا تھا اور میں ایک بیٹے کی ماں بن گئی۔ اب میں نے اپنے بیٹے کی خاطر جینا سیکھ لیا تھا۔

گھر میں جو وقت ملتا وہ دوسروں کے کپڑے وغیرہ بنا کر اپنی ضروریات پوری کرتی۔ میرے شوہر جو کماتے اپنے ماں باپ کے ہاتھ پر لا کر رکھتے اس گھر میں میری حیثیت ایک کام کرنے والی کی سی تھی اگر کسی کے کام میں کوتاہی ہوتی تو میرے شوہر میرا جینا حرام کر دیتے ان کا رویہ میرے لیے بہت ہی تکلیف دہ ثابت ہوا۔

فاروق کا یہ انداز میرے لیے رہی سہی قوت برداشت کو بھی ختم کر گیا میں اس گھر میں فضول چیز سمجھ کر پھینک کر دی گئی میں نے اپنے گھر والوں کو سارے حالات سے آگاہ کیا جو مجھے اپنے ساتھ لے گئے کئی ماہ تک میرے شوہر اور اس کے گھر والوں نے میرا حال تک نہ دریافت کیا آخر مجبوراً مجھے خود ہی اپنے شوہر کے گھر جانا پڑا۔

میں اپنے بیٹے کو سینے سے لگائے اپنے کمرے میں پڑی رہتی میرا شوہر آتا تو اپنے ماں باپ بہن بھائیوں میں زیادہ وقت صرف کرتا میرا شوہر شہر میں کسی جگہ ٹیوشن پڑھانے کا کام بھی سرانجام دیتا تھا جس گھر کے بچے پڑھاتا تھا اسی گھر میں اسے رہنے کے لیے جگہ بھی مل گئی تھی پہلے تو گاؤں آ جاتا تھا پھر اس نے یہ سلسلہ بھی بند کر دیا۔

اس کے سارے گھر والے اسے شہر جا کر مل لیتے جب واپس آتے تو اسی گھر کی مالکن کی بہت تعریف کرتے میرے دل میں ایک عورت کا دل تھا میں اپنی تباہی کا منظر اپنے ذہن کے کینوس میں آہستہ آہستہ بن رہی تھی۔

ایک روز میرے شوہر آئے اور مجھے اپنے ساتھ لے کر شہر آ گئے یہاں آ کر مجھے معلوم ہوا کہ اس گھر کی مالکن کو زچگی کے مراحل سے دوچار ہونا تھا اور مجھے اس کی خدمت کے لیے لایا گیا تھا۔ مجھ پر جلد یہ انکشاف ہو گیا کہ میرا شوہر کیوں گاؤں آنا پسند نہیں کرتا تھا ٹیوشن کی آڑ میں گھر کی مالکن کو پڑھانے میں مصروف تھا۔

وہ میری موجودگی میں کھانا اکٹھے کھاتے وہ عورت ذرا سا بیمار ہو جاتی تو میرا شوہر رات گئے تک اسے دباتا اور مجھے دوسرے کمرے میں بھیج دیتا۔

میں اپنے سامنے اپنی بربادی کا تماشا دیکھتی اور منہ سے کچھ نہ بولتی۔ جب میرے صبر کا پیمانہ چھلکنے لگا تو میں نے اپنے شوہر سے کہا کہ مجھے وہ گاؤں چھوڑ آئے وہ بھی شاید اسی انتظار میں تھا فوراً مجھے تیار کرایا اور گاؤں لے آیا تمام راستے وہ بات بات پر میری بے عزتی کرتا آیا۔

گھر آئی تو اپنے بیٹے کی حالت دیکھ کر تڑپ اٹھی وہ بیمار پڑا تھا۔ میں دوسرے گھر میں غیر بچوں کی دیکھ بھال میں لگی تھی اُدھر میرا بیٹا سوکھ کر کانٹا بن گیا تھا میرا بیٹا جو باپ کی شفقت کو ترس گیا تھا اپنے باپ کو سامنے پا کر ایک دم اس کی جانب لپکا مگر اس سنگدل انسان نے یہ کہہ کر اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پیچھے کر دیے کہ کیا اپنا انفکشن دوسروں کو دینے کا ارادہ ہے؟ جتنی دیر تک وہ رکا اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے باتیں کرتا رہا میں اپنے بیٹے کی حالت پر اتنی پریشان تھی کہ کہ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔

میں نے دو تین بار اپنے شوہر سے کہا کہ منے کی حالت بہت خراب ہے اسے کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلیں اس نے بات سنی ان سنی کر کے اپنے چھوٹے بھائی کی ذمہ داری میں دے دیا۔

میرا شوہر شام تک رکا پھر واپس چلا گیا۔ میں نے اپنے گھر والوں کو لکھا اور میری والدہ مجھے اور میرے بیٹے کو ساتھ لے آئی۔

یہاں آ کر میرے غریب والدین نے دن رات ایک کر کے میرے بیٹے کا علاج کروایا اور وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوا۔ میری والدہ اور میری خالہ میرے شوہر کے پاس گئیں اور اسے سمجھایا کہ تم جس آگ سے کھیل رہے ہو وہ تمہارا سب کچھ جلا کر راکھ کر دے گی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا اُس عورت نے میری والدہ اور خالہ کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ میرے شوہر نے اس عورت کی طرفداری کرتے ہوئے میری والدہ کو مارنا شروع کر دیا میری والدہ کی بزرگی کا اس شخص کو خیال نہ آیا میری والدہ آنسو بہاتی واپس آ گئیں۔

میں کئی ماہ تک اپنے ماں باپ کے گھر رہی میرے سسرال والوں کی جانب سے نہ کوئی آیا اور شاید نہ ہی کسی کو آنا تھا۔ میرے والد اس صورت حال سے اتنا پریشان تھے کہ اکثر انہیں میں نے رات کو اپنی چارپائی پر پڑے روتے دیکھا میری وجہ سے میری دوسری بہنیں بھی پریشان تھیں۔

میں نے اپنے والد سے اجازت طلب کی کہ وہ تو مجھے نہیں لینے آئیں گے میں بھائی کو ساتھ لے کر چلی جاتی ہوں بہرصورت اب زندگی کا سفر طے تو کرنا ہے۔ میں اپنے بیٹے کو لے کر بھائی کے ہمراہ گاؤں چلی آئی پورے گھر کے لوگ ہمارے آنے سے بیزار سے نظر آنے لگے تھے۔ میں نے سب کی پرواہ کیے بغیر سارے گھر کے کام کاج پھر سے سنبھال لیے میرا بھائی مشکل سے ایک دو روز ٹھہرا اور واپس چلا آیا میرے دیور کو میرے آتے

غزل

ہموار راستوں کو دلدل کیا نہ جائے
جو کام آج کا ہے وہ کل کیا نہ جائے

یہ کیا کہ دن گھڑی کو ہی تکتے گزر گیا
سوچا یہ تھا کہ ضائع کوئی پل کیا نہ جائے

مانا کہ آدمی کو ودیعت ہے عقل و فہم
ہر ایک مسئلہ حل کیا نہ جائے

کچھ تشنگی رہے کہ ہے اس سے نمودِ فن
تصویرِ آگہی کو مکمل کیا نہ جائے

جاذب یہی ہے مصلحتِ فن کا اقتضا
بازو کو شل، دماغ کو بوجھل کیا نہ جائے

مختار جاذب

ہی بھیج دیا گیا کہ وہ میرے شوہر کو گاؤں لائے۔

زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا میرا شوہر چوتھے روز گاؤں آ گیا دروازے کے اندر قدم رکھتے ہی اس نے مجھے بالوں سے پکڑ لیا اور میرے منہ پر تھپڑوں کی بارش کر دی اور گندی گالیاں نکالنا شروع کر دیں کہ اسی وقت یہاں سے نکل جاؤ میرے سسر اور دیور بھی میرے شوہر کی طرفداری کر رہے تھے۔

میرا سسر طلاق دینے پر زور دے رہا تھا میرا بیٹا سہم کر دروازے کے پیچھے چھپا کھڑا تھا۔ جب میرا شوہر مجھے مارتے مارتے بے دم ہو گیا تو مجھے گھسیٹ کر سب سے آخر والے کمرے میں لے آیا دوپٹے سے میرے بازو پشت پر باندھ دیے اور چارپائی پر پھینک دیا۔ اس کے دل کا زہر اس کی زبان سے بہہ نکلا وہ کہہ رہا تھا کہ فریدہ اگر تم نے مجھے دوسری شادی کی اجازت نہ دی تو میں تمہارا خون کر دوں گا۔ اب میرے ذہن میں اس درندہ صفت انسان کی بات آئی کہ وہ مجھ سے کیا چاہتا تھا میں اپنے ہاتھوں اپنے گھر کو کیسے آگ لگا سکتی تھی؟ میں اس کے آگے تن گئی کہ میرے جیتے جی یہ کبھی نہیں ہو سکتا وہ مجھے اسی حالت میں چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

میں اپنے خدا کے آگے سجدہ ریز ہو گئی کہ اگر میرے نصیب میں یہ کچھ لکھا ہے تو پھر گلہ کیسا؟ رات کے اندھیرے پھیل رہے تھے کہ میرا شوہر پھر آ گیا اب اس کا رویہ کچھ نرم تھا۔ میں اس کے لہجہ کا بدلا ہوا رنگ محسوس کر کے سمجھ گئی کہ اب یہ اس کی نئی چال ہے میں نے اس کے ارادوں کو سختی سے جھڑک دیا اور وہی جواب دیا جو پہلے دے چکی تھی۔ وہ پھر آگ بگولہ ہو گیا اور مجھ پر لاتوں، گھونسوں کی بارش شروع کر دی اور باہر نکل گیا جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں مٹی کے تیل کی بوتل تھی جو اس نے مجھ پر چھڑک دی۔ میرے سامنے موت کا خوفناک تصور رقص کرنے لگا میرے شوہر نے ماچس کی تیلی نکالی اور کھینچ کر مجھ پر اچھال دی۔ ایک دم میرا جسم آگ کے شعلوں میں تبدیل ہو گیا میرے منہ سے دلخراش چیخوں کی آواز سن کر باہر لوگ اکٹھے ہو گئے۔ میرا سسر جلدی سے اندر آ گیا اور مجھ پر رضائی وغیرہ پھینک کر آگ پر قابو پا لیا میں موت و زندگی کی کشمکش میں پھنسی بے ہوش ہو چکی تھی۔ میرے شوہر وغیرہ نے باہر یہ بات مشہور کر دی کہ میں بتی جلاتے ہوئے جھلس گئی ہوں مجھے گاؤں سے شہر لایا گیا اور ایک پرائیویٹ ڈاکٹر کے زیر علاج رکھا گیا جب تھوڑی سی چلنے پھرنے کے قابل ہوئی تو فوراً گاؤں لے آیا گیا تاکہ میں کسی پر آگ لگانے کا راز افشاں نہ کر دوں کہ مجھے قتل کرنے کی نوبت کیوں آئی۔

اس طرح دو ماہ گزر گئے میری نگرانی ہوتی رہی میرا چہرہ مکروہ اور خوفناک بن چکا تھا میں سارا دن چادر میں منہ چھپائے پڑی رہتی میرے گھر والوں کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو وہ مجھے ساتھ لے آئے میں اپنے بیٹے کو بھی ساتھ لے آئی میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب فاروق کے پاس کبھی نہ جاؤں گی اپنے گھر آ کر میں نے اسکول میں نوکری کر لی۔ میرے میاں نے میرے پیچھے کئی الزام لگا کر طلاق بھیج دی میں اس آخری گھاؤ کو بھی مقدر کا لکھا جان کر سہہ گئی میرا بیٹا اب بھی مجھ سے اپنے ابو کو ملنے کے لیے ضد کرتا ہے۔ میں اس کے ننھے منے جملوں کا زہر اپنی ممتا میں سمیٹ کر تڑپ اٹھتی ہوں۔

☆☆......☆☆

گوجرانوالہ سے ارسال کردہ سسپنس سے بھرپور تحریر

ٹرانسفر لیٹر

رفعت کو ابھی تھوڑی تکلیف اور سہنی تھی......

پولیس ڈیپارٹمنٹ میں موجود دو بہترین افسروں کا کارنامہ......

افتخار چوہدری

دھیمی رفتار سے چلتی ہوئی ٹھنڈی میٹھی ہوا کے دوش پر پیپل کی لچکدار شاخیں سُرور کی سی کیفیت میں جھوم رہی تھیں جس کی وجہ سے پتے موسیقیت بھری جھنکار اور سرسراہٹ پیدا کر رہے تھے۔

اس دوران شاخوں سے جھڑتے ہوئے زرد پتے خزاں رُت کی آمد کا پتہ دے رہے تھے۔

اپنی معیادِ زندگی پوری کرنے والے یہ زرد پتے ہوا کا ہلکا سا دباؤ بھی برداشت نہیں کر پا رہے تھے، وہ ٹہنیوں سے ٹوٹ کر چند سیکنڈ فضا میں گھومنے کے بعد زمین پر گر رہے تھے۔

یہ وہی پتے تھے جو پچھلی بہار کی آمد پر زندگی کی نوید بن کر کھلے تھے اور آج کسی بے وقعت چیز کی طرح بکھرتے چلے جا رہے تھے، اب ان کے مقدر میں کسی کے پاؤں تلے آ کر محض ایک لمحے کے لیے چرمرانا باقی رہ گیا تھا۔

سر... چوہدری بشارت کچھ لوگوں کے ہمراہ تھانے میں آیا بیٹھا ہے، وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔

سپاہی نذیر نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا، تو میں اپنے خیالوں سے چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

میں اس وقت تھانے سے ملحقہ اپنے سرکاری کوارٹر کے باغیچے میں بیٹھا ہوا تھا اور درختوں سے گرتے ہوئے پتوں کو دیکھنے میں اس قدر محو تھا کہ مجھے نذیر کے آنے کا علم ہی نہیں ہوا۔

کوارٹر کا ایک دروازہ تھانے کے اندر کھلتا تھا وہ اسی دروازے سے میرے پاس آیا تھا۔

مجھے اس تھانے میں تعینات ہوئے کئی ہفتے گزر چکے تھے مگر ابھی تک یہاں کوئی کیس فائل نہیں ہوا تھا۔

مجھے لاہور کے ایک مصروف ترین اسٹیشن سے بطور سزا ٹرانسفر کر کے یہاں بھیجا گیا تھا، وہاں میرے آفیسر اور ماتحت عملہ میری ضرورت سے زیادہ ایمانداری کی وجہ سے حد درجہ تنگ آئے ہوئے تھے، آخر کب تک وہ اپنی اوپر کی آمدن میں رکاوٹ برداشت کر سکتے تھے، انہوں نے میرا

تبادلہ سرگودھا کی ایک سرسبز تحصیل سلانوالی کے اس غیر معروف علاقے میں کروا کر ہی سکون کا سانس لیا تھا۔

مجھے نیک نیتی کے اس (ناقابلِ معافی جُرم) کی پاداش میں یہاں آنا ہی پڑا، ویسے میرے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی، مجھے تقریباً ہر چھ ماہ بعد ٹرانسفر لیٹر کی شکل دیکھنے کی عادت سی ہوگئی تھی۔

اب یہاں میرے پاس درختوں سے گرتے ہوئے پتوں، اٹکھیلیاں کرتے ہوئے پرندوں اور شکلیں بدلتے ہوئے بادلوں کو دیکھنے کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔

اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ اس علاقے میں جرائم نہیں ہوتے تھے، میرے تھانے کی حدود میں تین درجن سے زائد گاؤں تھے، ان میں مرغی چوری سے لے کر ڈکیتی اور قتل جیسی خونریز وارداتیں بھی ہوتی رہتی تھیں، مگر متاثرہ لوگ تھانے آنے کی بجائے، چوہدری بشارت کے ڈیرے پر جانا پسند کرتے تھے۔ اس نے غیر اعلانیہ طور پر حکومت کے متوازی اپنے قانون وضع کیے ہوئے تھے، جن کی بنا پر وہ فریقین کے مابین فیصلے کرتا تھا، اور حیرت کی بات یہ تھی کہ کوئی شخص اس کے کیے ہوئے فیصلے کو ماننے سے انکار کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔

پورے علاقے میں چوہدری کو بے تاج بادشاہ کی سی حیثیت حاصل تھی ہزاروں ایکڑ زرعی



اراضی کا مالک ہونے کی وجہ سے اس کا دماغ ہر وقت ساتویں آسمان پر رہتا تھا۔
رہی سہی کسر موجودہ حکومت میں وزیر کے عہدے پر براجمان اس کے بھائی نے پوری کر رکھی تھی۔ میری اطلاع کے مطابق اس نے نجی جیل تک بنا رکھی تھی۔
اگر وہ کسی سے ناراض ہو جاتا تو پھر زمین اپنی تمام تر کشادگی کے باوجود اس پر تنگ کر دی جاتی تھی، اور پھر اس غریب کا مقدر تنگ و تاریک کوٹھری میں سڑنا ہی ہوتا تھا۔
طاقت کا کل توازن اس کے پلڑے میں ہونے کی وجہ سے وہ سارے علاقے کے سیاہ و سفید کا مالک تھا۔
حد تو یہ تھی کہ میرے تھانے کے اکثر ملازم اسی کے زر خرید تھے، یا یوں کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ تھانے کی کالی بھیڑیں تنخواہ تو سرکاری خزانے سے وصول کرتی تھیں اور چاکری چوہدری بشارت کی کرتے تھے۔
تھانے کے بکاؤ لوگ چوہدری کا نام اتنے احترام اور عقیدت سے لیتے تھے کہ شاید انہوں نے اپنے والدِ محترم کو بھی کبھی اتنے احترام سے مخاطب نہیں کیا ہوگا۔
یہاں تعیناتی کے کافی دن بعد تک میں کسی کیس کا انتظار کرتا رہا۔ مگر جب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو ایک دن میں اپنے ماتحتوں کے منع کرنے کے باوجود چوہدری بشارت کے ڈیرے پر جا پہنچا۔
جس وقت میں وہاں پہنچا اس وقت چوہدری اپنے حواریوں میں گھرا بیٹھا تھا، وہاں پر موجود لوگوں کی اکثریت نیچے فرش پر بیٹھی تھی۔ صرف چند لوگ ہی کرسیوں پر بیٹھے تھے اور وہ بھی شاید اس لیے کے سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے وہ کارآمد مہرے تھے۔
ایک ملازم چوہدری کے کندھے دبا رہا تھا۔ چھوٹی سٹائلش داڑھی کے ساتھ بڑی بڑی کنڈل مار کہ مونچھیں بلڈاگ جیسے چہرے پر عجیب سے جنگلی پن کا تاثر دے رہیں تھیں۔ خباثت تو جیسے اس کے چہرے پر ثبت ہو کر رہ گئی تھی۔
تنگ ماتھا اور آنکھوں میں موجود تیز چمک اس کے شقی القلب ہونے کا واضح ثبوت تھی۔
وہ اس وقت رنگدار پایوں والے انواری پلنگ پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا، اور منہ میں حقے کی نے لیے ہوئے سفید دھویں کے بادل اگل رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کی باچھیں کھل گئیں، جبکہ آنکھوں کی چمک یکدم کئی گنا بڑھ گئی۔
زہے نصیب تھانیدار خاور صاحب آج آپ کو ہماری یاد کیسے آگئی یا پھر راستہ بھول کر ادھر آنکلے ہو۔
اس نے اپنی جگہ سے ہلے بغیر مصافے کے لیے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ مجھے اس کے تکبرانہ انداز سے کافی سبکی محسوس ہوئی، مگر میں کڑوا گھونٹ پی کر رہ گیا۔
اس نے مجھے نام لے کر مخاطب کیا تھا، حالانکہ یہ ہماری پہلی ملاقات تھی، اس کا یہی مطلب تھا کہ وہ گرد و پیش سے باخبر رہنے والا انسان ہے۔
جناب میں یہ کہنے کے لیے حاضر ہوا ہوں کہ اگر آپ کے کار سرکار میں کوئی رخنہ اندازی نہ ہو تو کچھ کیس ہماری طرف بھی بھجوا دیا کریں تاکہ ہم بھی اپنی روزی روٹی حلال کر سکیں۔ میں نے اپنے لہجے کو حتی الوسیع نارمل رکھنے کی کوشش کرتے

ہوئے کہا۔
میری بات سن کر چوہدری کا بھدا قہقہہ کان پھاڑ دینے والا تھا، اس کی دیکھا دیکھی اس کے حواری بھی اپنے دانتوں کی نمائش کرنے لگے۔
یہ بھی خوب کہی تھانیدار صاحب پہلی بار کسی کو بھیک میں کیس مانگتے دیکھا ہے، چلو اب تم ہمارے دروازے پر آہی گئے ہو تو ہم خیال رکھیں گے کہ سرکار کا کام بھی چلتا رہے اور تمہاری روٹی بھی حلال ہوتی رہے۔
اس نے انتہائی نخوت بھرے لہجے میں جواب دیا، اس کی بات سن کر میرا بلڈ پریشر ایک دم سے ہائی ہو گیا تھا جس کا ثبوت میری دھڑکن کی رفتار میں اضافہ اور کانوں سے نکلتی ہوئی تپش تھی، مگر میں بات کو مزید آگے بڑھانے کی بجائے شکریہ کہتے ہوئے واپس پلٹ آیا تھا۔
آج چار دن بعد سپاہی نذیر اسی چوہدری بشارت کی آمد کا پتا دے رہا تھا، میں سپاہی کے ساتھ ہی تھانے آ گیا۔
میں دفتر میں داخل ہوا تو چوہدری بشارت کلف لگی اونچے شملے والی پگ پہنے گردن اکڑائے کرسی پر بیٹھا تھا، اس کے چہرے پر موجود تاثرات سے لگ رہا تھا کہ اسے میرا انتظار کرتے ہوئے کافی کوفت محسوس ہو رہی ہے۔ اس کی کرسی کے پیچھے دو گارڈز ہاتھوں میں کلاشنکوفیں لیے مستعد کھڑے تھے، ان سے کچھ فاصلے پر ایک ادھیڑ عمر جوڑا کھڑا تھا جو دیکھنے میں میاں بیوی لگ رہے تھے، عورت شاید روتی رہی تھی جس کی وجہ سے اس کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی تھیں، مرد کا چہرہ بھی حزن و ملال کی تصویر بنا ہوا تھا۔
دفتر میں اور کئی خالی کرسیاں بھی موجود تھیں مگر وہ دونوں میاں بیوی ان پر بیٹھنے کی بجائے کھڑے رہنے پر مجبور تھے، یقیناً چوہدری ان کم حیثیت لوگوں کو اپنے برابر بٹھانا اپنی توہین گردانتا ہوگا۔
زہے نصیب چوہدری صاحب آج کیسے راستہ بھول گئے، میں نے چہرے پر زبردستی مسکراہٹ کا خول چڑھاتے ہوئے ماحول کو بات کے لیے سازگار بنانے کے لیے کہا۔
میری بات کا جواب دینے کی بجائے وہ چند لمحے میری طرف غور سے دیکھتا رہا اور پھر گویا ہوا۔
تم نے چند دن قبل ڈیرے پر آکر مجھ سے گلہ کیا تھا کہ اس علاقے کے لوگ کوئی جرم ہونے کے بعد تھانے سے رجوع نہیں کرتے، میں نے سوچا تمہاری صلاحیتوں کو بھی جانچ لیا جائے۔
میں تمہارے لیے ایک کیس لے کر آیا ہوں، اگر تم اسے حل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو میرے ساتھ ساتھ گاؤں کے لوگ بھی تھانے پر اعتبار کرنے لگیں گے۔ یہ ہمارے گاؤں کے ماسٹر الطاف صاحب ہیں، میں انہیں بچپن سے جانتا ہوں، بلکہ جب میں چھوٹا بچہ تھا تو اللہ جنت نصیب کرے میرے والد مرحوم نے انہیں میری تعلیم و تربیت کے لیے ملازم رکھا تھا، اس لیے میں انہیں ذاتی طور پر جانتا ہوں، یہ انتہائی شریف انسان ہیں۔ ان کی ایک ہی بیٹی ہے جو کل سے لاپتہ ہے، ہر ممکنہ جگہ تلاش کر لیا گیا ہے، مگر کہیں سے خیر کی کوئی خبر نہیں ملی۔
اب میں انہیں یہاں لے آیا ہوں، تم اگر ان کی بیٹی رفعت کو ڈھونڈ نکالو تو میرا وعدہ ہے کہ نا صرف تمہاری ترقی کروا دوں گا، بلکہ اگر تم چاہو گے تو تمہاری پسند کی جگہ پر تمہارا ٹرانسفر بھی کروا دوں گا۔
چوہدری نے اپنی بارعب آواز میں لمبی تمہید

باندھنے کے بعد تھانے میں قدم رنجہ فرمانے کا مقصد بیان کر دیا۔اور آخر میں مجھے ترقی اور پسند کی جگہ پر ٹرانسفر کروانے کا سبز باغ بھی دکھا دیا۔

جناب میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا،ویسے اب تک جو تگ ودو کی گئی ہے کیا اس کے بارے مجھے بتا سکتے ہیں تا کہ میں ابتدائی تفتیش پر وقت ضائع کرنے کی بجائے لڑکی کو بازیاب کروانے کیلئے کوئی لائن آف ایکشن ترتیب دے سکوں۔میں نے گلا کھنگارنے کے بعد نرم لہجے میں پوچھا۔

اب تک کی بھاگ دوڑ سے تو یہی نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ یہ کیس اگر نا قابل حل نہیں بھی تو مشکل ضرور ہے تمہیں تو معلوم ہے کہ نہر کی پٹڑی سے اتر کر جو راستہ گاؤں کی طرف آتا ہے اسی راستے پر لڑکیوں کا سکول ہے اور سکول کی عمارت سے ملحق قبرستان متروک ہو چکا شمشان گھاٹ بھی ہے سکول میں ٹائلٹ نہ ہونے کی وجہ سے بچیاں قضائے حاجت کے لیے کھیتوں کا رخ کرتی ہیں مگر جب کبھی ایمرجنسی میں کوئی بد نصیب لڑکی کھیتوں کی بجائے ملحقہ قبرستان یا شمشان گھاٹ میں جاتی ہے تو پھر سمجھ لو کہ اسے جلد یا بدیر اس جرم کا خمیازہ بھگتنا ہی پڑتا ہے اس کیس میں متاثرہ لڑکیوں کی اکثریت ذہنی توازن کھو بیٹھتی ہیں اور پھر چند دن بعد خودکشی کرنا ان کا مقدر بن جاتا ہے۔چوہدری نے تفصیل بتائی۔

کیا کسی نے رفعت کو قبرستان یا شمشان گھاٹ کی طرف جاتے ہوئے دیکھا ہے،میں نے چوہدری کی بات اچکتے ہوئے پوچھا۔

اس کی کئی کلاس فیلو یہ گواہی دے چکی ہیں کہ انہوں نے رفعت کو شمشان گھاٹ کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا،چوہدری نے بنا کسی توقف کے ترنت جواب دیا۔

اور جو لڑکیاں اس مسئلے سے دو چار ہوتیں ہیں ،وہ کس طریقہ کار سے خودکشی کرتی ہیں،میں نے ایک سوال اور پوچھا۔

اب تک جتنی لڑکیوں نے بھی خودکشی کی ہے ان سب کا طریقہ کار ایک جیسا ہی رہا ہے،ذہنی طور پر ماؤف ہونے کے بعد نہر میں چھلانگ لگا کر اپنی جان سے گزرتی ہیں۔

اسی نہر پر چند کلو میٹر آگے ایک جال ہے،جہاں پر گورنمنٹ نے جال لگوایا ہوا ہے جو لاشیں تیرتی ہوئی وہاں تک پہنچتی ہیں وہ اس جال میں پھنس جاتی ہیں، کل سے گاؤں کے کئی نوجوان وہاں بھی پہرہ دے رہے ہیں،مگر لاش ابھی تک وہاں نہیں پہنچی،شاید رستے میں کہیں جھاڑیوں سے اٹک کر رک گئی ہو۔

چوہدری نے ایک بار پھر پوری تفصیل سے اب تک کی بھاگ دوڑ کا رزلٹ مجھے سنا دیا۔

اللہ نہ کرے اس بچی کے ساتھ ایسا کچھ ہوا ہو ،چوہدری کی بات سن کر میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

تھانیدار صاحب انسان چاہے جتنی بھی کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لے مگر حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا،ہمیں کسی بھی ناگہانی صورت حال کے لیے ذہنی طور پر تیار رہنا چاہیے،اگر رفعت نے جانے انجانے میں شمشان گھاٹ میں موجود آتماؤں کو تنگ کیا ہے تو پھر اللہ ہی اس کے حال پر رحم کرے،کیونکہ اس سے پہلے جتنی بھی لڑکیوں نے یہ غلطی کی ہے ان سب کو اس کی سزا بھگتنی پڑی ہے۔

چوہدری بشارت نے اپنی بات کو اصرار کے ساتھ دہرایا۔

چوہدری صاحب اگر سارا کیس ایسے ہی ہے جیسے آپ بتا رہے ہیں، تو اس میں سلجھانے والی تو کوئی بات ہی نہیں رہ گئی۔

اب جیسے ہی نہر سے رفعت کی لاش ملے گی تو اس کے پوسٹمارٹم کے بعد یہ کیس کلوز سمجھیں۔

لیکن مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آئی کہ آپ کس حوالے سے کہہ رہے تھے کہ یہ کیس اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے، میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

چوہدری میری بات سن کر ایک لمحے کے لیے چونک سا گیا، اور پھر چند ثانیے غور سے میری طرف دیکھتا رہا، ظاہر ہے، لاش نہیں مل رہی پہلے کیسوں میں کبھی ایسا نہیں ہوا، یہی اس کیس کا مشکل پہلو ہے جس کی وجہ سے میں نے ایسا کہا، چوہدری نے ہاتھ پھیلاتے ہوئے بے زاری سے جواب دیا۔

اس کے انداز سے ایسے لگ رہا تھا، جیسے اسے میرا سوال پر سوال پوچھنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

ٹھیک ہے تھانیدار صاحب اب میں چلتا ہوں، اور امید کرتا ہوں کہ آپ جلد ہی رفعت کی کوئی خیر خبر دو گے، چوہدری بشارت نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

اگر آپ ماسٹر صاحب کو یہیں چھوڑ جائیں تو اچھا ہے ہو سکتا ہے ان سے کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے، کچھ دیر بعد میں انہیں واپس بھجوا دوں گا، میں نے بھی اٹھتے ہوئے کہا تو اس نے ایک لمحے کے لیے ان دونوں میاں بیوی کی طرف دیکھا، اور پھر کچھ سوچنے کے بعد اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا، ٹھیک ہے میں انہیں یہاں چھوڑ جاتا ہوں مگر انہیں غیر ضروری سوال پوچھ کر تنگ مت کرنا، یہ پہلے ہی بہت زیادہ پریشان ہیں۔

آپ بے فکر رہیں چوہدری صاحب آپ کے استادِ محترم ہمارے لیے بھی قابل احترام ہیں۔ میں نے محرر کو چوہدری صاحب کے ساتھ باہر تک جانے کا اشارہ کیا، اور خود ان میاں بیوی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ماسٹر صاحب افسردہ کھڑے تھے، ان کی آنکھیں شدت غم سے چھلکنے کو تھیں۔

تشریف رکھیں میں نے کرسی کی طرف اشارہ کر کے انہیں بیٹھنے کے لیے کہا تو ان کے چہرے پر حیرت کے آثار ابھر آئے، وہ کبھی کرسی اور کبھی میری طرف دیکھنے لگے، پلیز سر بیٹھیں، میں نے اپنی بات دہرائی تو وہ دونوں بھلے مانس انسان آگے بڑھ کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ انکے انداز میں ہچکچاہٹ نمایاں تھی۔

مجھے دلی دکھ اور افسوس ہے آپ اتنے اندوہناک حادثے کا شکار ہوئے میں اپنی پوری کوشش کروں گا کہ رفعت بیٹی کو ڈھونڈ نکالوں، میں نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

میرے منہ سے ہمدردی کے دو بول سن کر دونوں میاں بیوی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔

میں نے کچھ دیر تک انہیں دل کا غبار ہلکا کرنے دیا، ٹیبل پر پانی کا جگ اور گلاس موجود تھے میں نے گلاسوں میں پانی انڈیل کر انہیں پینے کے لیے دیا۔

پانی پینے کے بعد ان کی حالت قدرے سنبھل گئی۔

جو کچھ چوہدری صاحب نے بتایا ہے کیا سب معاملات ایسے ہی پیش آئے ہیں یا کوئی ایسی بات بھی ہے جو وہ بتانا بھول گئے ہیں، میں نے ہمدردانہ لہجے میں ایک بار پھر بات آگے بڑھائی۔

جیسے چوہدری صاحب نے تفصیل بتائی ہے بالکل ویسا ہی ہوا ہے، ماسٹر الطاف نے پہلی بار زبان کھولی ان کی آواز رندھی ہوئی بلغم زدہ سی تھی ۔

کوئی خاص بات جو ہمیں رفعت بیٹی تک پہنچنے میں مدد دے سکے میں نے ایک بار پھر اپنی بات پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔

میری بچی معصوم سی ہے اسے پڑھائی کے علاوہ اور کسی سرگرمی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، میں نے اس کی منگنی اسکے تایازاد جمشید سے کی ہے۔

وہ تو ابھی اس منگنی وغیرہ کے جھنجھٹ میں بھی پڑنا نہیں چاہتی تھی ، کیونکہ ابھی وہ مزید پڑھنا چاہتی ہے ہر کلاس میں پہلی پوزیشن لیتی رہی ہے ،اب وہ میٹرک میں ہے ،نجانے وہ کونسی منحوس گھڑی تھی جب اس نے شمشان گھاٹ کا رخ کیا تھا۔

ماسٹر صاحب تفصیل بتاتے ہوئے ایک بار پھر آبدیدہ ہو گئے ،اس دوران انہوں نے اپنی جیب سے ایک تصویر نکال کر میری طرف بڑھائی ۔

تصویر میں رفعت سکول کا یونیفارم پہنے ہوئے معصوم سی گڑیا لگ رہی تھی ۔

آپ پریشان نہ ہوں اور دعا کریں کہ اللہ پاک اسے اپنے حفظ وامان میں رکھیں۔

یہ جمشید کیا کام کرتا ہے میں نے تصویر کو دراز میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

سرگودھا شہر میں کوئی دھاگے کی مِل ہے جس میں وہ الیکٹریشن کی نوکری کرتا ہے، رفعت کی گمشدگی کا سنتے ہی واپس آگیا ہے ، بہت بھلا مانس بچہ ہے۔

ارشد ڈرائیور کو ساتھ لے لو اور ماسٹر صاحب کو احترام کے ساتھ واپس گھر چھوڑ آؤ ، واپسی پر رفعت کے منگیتر کو ساتھ لیتے آنا ماسٹر صاحب اس کے گھر کے بارے میں تمہیں بتا دیں گے ۔ میں اس سے بھی چند باتیں کرنا چاہتا ہوں ، میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے مخاطب ہو کر کہا ، جو ابھی دفتر میں داخل ہوا تھا۔

میری بات سن کر وہ ماسٹر صاحب اور ان کی بیوی کو ساتھ لے کر باہر نکل گیا۔

قبرستان یا شمشان گھاٹ میں قضائے حاجت کے لیے جانے سے ذہنی توازن جانے والا معاملہ میری سمجھ سے باہر تھا۔اور اس علاقے میں چوہدری بشارت کی اجازت کے بغیر کسی قسم کی سرگرمی کا ہونا ناممکنات میں سے تھا۔

میں نے ان میاں بیوی کو اسی لیے روک لیا تھا کہ اگر رفعت کے گم ہونے میں چوہدری یا اس کے کارندے کا کوئی کردار ہو تو بات کلیئر ہو سکے ،مگر ماسٹر صاحب تو چوہدری کی بات سے مکمل اتفاق کر رہے تھے۔

اب مجھے کیس کو کسی اور زاویے سے دیکھنے کی ضرورت تھی اس سے پہلے میں جمشید سے مل لینا چاہتا تھا، ہو سکتا ہے اس سے مجھے کوئی کلیو مل جاتا۔

میں کافی دیر بیٹھا اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتا رہا ،مگر کوئی سرا ہاتھ نہیں آرہا تھا، میں اس وقت چونکا جب ہیڈ کانسٹیبل ایک نوجوان کو لیے میرے کمرے میں داخل ہوا۔

وہ اٹھارہ انیس سال کا معصوم سا نوجوان تھا مجھے وہ کچھ ڈرا سہما ہوا سا لگا۔شاید تھانے میں لائے جانے کا اثر تھا۔

سر یہ جمشید ہے ،ارشد نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، اسی لمحے جمشید نے ہاتھ اٹھا کر مجھے سلام کیا۔

بیٹھو جمشید، میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا تو وہ مودبانہ انداز میں ٹیبل کے دوسری طرف موجود کرسی پر بیٹھ گیا۔

ٹھیک ہے تم جا سکتے ہو، میں نے ارشد سے کہا تو وہ سلیوٹ کر کے باہر نکل گیا۔

جمشید جب رفعت گم ہوئی تو اس وقت تم کہاں تھے؟ میں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں پہلا سوال پوچھا، تو اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔

یا تو اس کے دل میں چور تھا، یا پھر میرا لہجہ ضرورت سے زیادہ کرخت رہا ہو گا، جس کی وجہ سے وہ گھبرا گیا۔

سر کیا آپ مجھ پر شک کر رہے ہیں، اس نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔

یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے، میں ہر اس شخص پر شک کر رہا ہوں جو کسی بھی طرح رفعت کو نقصان پہنچا سکتا ہے، اور میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ وہ تم سے منگنی کروانے پر راضی نہیں تھی، ہو سکتا ہے اس طرح کی کوئی وجہ رہی ہو، جس کی وجہ سے تم نے اسے نقصان پہنچایا ہو، میں نے بدستور پہلے جیسے لہجے میں کہا۔

تو اس کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار پیدا ہو گئے۔

سر آپ جیسے چاہیں تسلی کر لیں، میں بالکل بے قصور ہوں، جس وقت رفعت گم ہوئی میں ڈیوٹی پر تھا۔ ہاں یہ بھی سچ ہے کہ وہ منگنی نہیں کروانا چاہتی تھی، وہ اس لیے کہ وہ مزید پڑھنا چاہتی تھی، اس پر میں نے اسے کہا کہ منگنی کروا لو، جب تک تم پڑھتی رہو گی میں تمہیں شادی کے لیے نہیں کہوں گا، اس بات پر وہ راضی ہو گئی تھی۔

جمشید نے رفعت کی منگنی نہ کروانے والی بات کی وضاحت کرتے ہوئے جواب دیا۔

ہونہہ...... اس کا مطلب ہے کہ تم دونوں تنہائی میں بھی ملتے رہے ہو، جو تم نے اسے منگنی کے لیے راضی کیا، میں نے چونکتے ہوئے پوچھا نہیں۔

سر ایسا بالکل بھی نہیں ہے، ہم دونوں کزن ہیں، کبھی میں ان کے گھر جاؤں یا وہ ہمارے گھر آئے تو بس سلام دعا کی حد تک ہی ہمارے درمیان بات ہوتی ہے، منگنی والی بات میں نے چاچی زینب کی موجودگی میں اس سے کی تھی۔ اس بار جمشید نے جواب دیا تو اس کے لہجے میں کچھ دیر پہلے کے برعکس اعتماد جھلک رہا تھا۔

تمہارے خیال میں کیا واقعی شمشان گھاٹ میں قضائے حاجت کے لیے جانے سے انسان کا ذہنی توازن بگڑ سکتا ہے؟ میں نے اس کا ذہن پڑھنے کے لیے ایک اور سوال کیا۔

بالکل بھی نہیں سر، یہ سب افواہیں ہیں، اس نے دو ٹوک انداز میں جواب دیا۔

تمہیں کیسے معلوم کہ یہ سب افواہیں ہیں، حالانکہ کتنی ہی بدنصیب لڑکیاں اس سانحے کا شکار ہو کر زندگی کی بازی ہار چکی ہیں، اور پورا گاؤں اس بات کا گواہ ہے، میں نے جگ سے پانی گلاس میں انڈیل کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

میری بات سن کر اس کے چہرے پر سوچ کی لکیریں گہری ہو گئیں، جبکہ اس کی نظریں پانی کے گلاس پر جمی ہوئی تھیں۔

کیا سوچ رہے ہو میں نے کچھ دیر توقف کے کے بعد پوچھا۔

سر ایک بات بتاؤں، اس نے ادرگرد دیکھ کر آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

مجھے لگا کہ وہ کوئی اہم بات بتانے والا ہے۔
ضرور بتاؤ تاکہ تمہاری منگیتر کو جلد از جلد بازیاب کروایا جا سکے۔ میں نے بھی آگے کی طرف جھکتے ہوئے اسی کے انداز میں سرگوشی کی۔
سر کل جب مجھے رفعت کے گم ہونے کی خبر ملی تو میں اسی وقت گاؤں آ گیا تھا، پہلے تو رات گئے تک گاؤں والوں کے ساتھ مل کر اسے ڈھونڈتا رہا مگر ناکامی پر میں کافی جذباتی ہو گیا، اور پھر کسی کو بتائے بغیر ہی شمشان گھاٹ جا پہنچا اس وقت رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی، میں رفعت کے بغیر جینا نہیں چاہتا۔
جس طرح وہ شمشان گھاٹ جا کر ذہنی توازن کھو کر گم ہوئی تھی، میں بھی ویسے ہی دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو جانا چاہتا تھا، اسی مقصد کے تحت میں وہاں گیا، اور وہاں موجود سالوں پرانی مڑھیوں پر غصے سے پیشاب کرتا رہا، سر میں جانتا ہوں کہ یہ غیر اخلاقی حرکت ہے، مگر اس وقت میرا ذہن دکھ اور پریشانی سے ماؤف ہو چکا تھا۔
میں فجر کی اذان تک وہیں رہا، مگر مجھے کچھ نہیں ہوا۔۔ دیکھ لیں میں آپ کے سامنے بھلا چنگا بیٹھا ہوں، خدارا میں ہاتھ جوڑ کر درخواست کرتا ہوں آپ ان افوہوں پر کان دھرنے کی بجائے سائنٹفک انداز میں تفتیش کریں۔
اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑتے ہوئے روہانسے لہجے میں التجا کی۔
اس کی بات سن کر میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا، اس نے بے وقوفی کی حد تک بہادری دکھائی تھی۔
سائنٹفک انداز میں کام کرنے کے لیے کوئی چھوٹا موٹا ثبوت تو پاس ہونا چاہیے، اگر ثبوت نہ بھی ہو تو کم از کم کوئی مفروضہ تو ہو جس کی بنیاد پر کام شروع کیا جا سکے، پھر کوئی نہ کوئی راہ نکل آتی ہے، مگر اس کیس میں تو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آ رہا ہے، میں نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔
میری بات سن کر وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔
میں نے اس کے سامنے موجود پانی کے گلاس کو مزید اس کی طرف کھسکایا تو وہ چونک کر پہلے گلاس اور پھر مجھے دیکھنے لگا۔
اگلے ہی لمحے اس نے گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا، اور پھر گلاس اس وقت رکھا جب سارا پانی حلق سے نیچے اتار لیا۔
سر مجھے یہ بات کرنی تو نہیں چاہیے، مگر آپ پر بھروسہ کرتے ہوئے کر رہا ہوں، مجھے امید ہے کہ آپ یہ بات اپنے تک محدود رکھیں گے، اس کے لہجے میں تذبذب موجود تھا، جیسے فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ اپنے ذہن میں موجود بات میرے ساتھ شیئر کرے یا نہیں۔
تم جو کہنا چاہتے ہو بے فکر ہو کر کہو، میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔
سر چھوٹا منہ بڑی بات والا معاملہ ہے، اگر چوہدری بشارت کو معلوم ہو گیا کہ میرے منہ سے ایسی کوئی بات نکلی ہے تو وہ میرا خون پی جائے گا۔
میں اس پر الزام نہیں لگا رہا، کیونکہ میرے پاس کوئی ثبوت موجود نہیں ہے، میں یہ بات صرف آپ کی معلومات میں اضافے کے لیے بتا رہا ہوں، چوہدری بشارت نو عمر لڑکیوں کا شئی ہے، ہو سکتا ہے کہ...... جمشید اپنی بات ادھوری چھوڑ کر ہونقوں کی طرح میری طرف دیکھنے لگا، اس کے چہرے پر پسینہ قطروں کی صورت ظاہر ہو چکا تھا۔
وہ شاید میرے چہرے پر موجود تاثرات سے اندازہ لگا رہا تھا کہ میں اس کی کہی ہوئی بات

چوہدری تک پہنچا کر اس کے خاندان کو کسی مصیبت میں تو نہیں دھکیل دوں گا۔

کچھ دیر پہلے تم نے کہا تھا کہ شمشان گھاٹ والی کہانی مفروضوں اور افواہوں پر مبنی ہے ،تو تمہارا یہ بہتان بھی تو لوگوں کی سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہوسکتا ہے ،اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ تم خود اقرار کررہے ہو کہ تمہارے پاس کسی قسم کا کوئی ثبوت نہیں ہے اور ابھی تک مجھے بھی چوہدری کے بارے میں ایسی کوئی رپورٹ نہیں ملی ۔

سر جی گستاخی معاف کیجیے گا ،عام لوگ تو رہے ایک طرف آپکے تھانے کا عملہ بھی چوہدری کی چوکھٹ پر سجدہ ریز رہتا ہے،تو کوئی آپ کو اس بارے میں کیوں رپورٹ کرے گا۔

اس نے اعتماد بھرے لہجے میں دلیل دی۔

لڑکا دلیر ہونے ساتھ ذہین بھی تھا۔گو......کہ میں نے اس کے خیال سے اتفاق کرنے سے یکسر انکار کردیا تھا،مگر سچ یہیں تھا کہ میں بھی دل میں وہی تمام باتیں سوچ رہا تھا جو وہ میرے سامنے بیٹھا کررہا تھا۔

اگر اس تھانے کا عملہ چوہدری کے سامنے سجدہ ریز رہتا ہے تو میں بھی تو اس تھانے کے عملے میں شامل ہوں ۔تو پھر تمھیں ایسی بات کہنے کی جرات کیسے ہوئی ، میں نے اسے ٹٹولنے کی غرض سے کہا۔

سر.....مجھے علم ہے آپ یہاں نئے آئے ہیں اور چند دن پہلے آپ نے ڈیرے پر جاکر جس انداز میں چوہدری سے بات کی ایسا کوئی بہادر آدمی ہی کرسکتا ہے آپ اس گاؤں کی ہسٹری میں پہلے شخص ہیں جس نے اتنی جرات کا مظاہرہ کیا۔ اس دن سے پورے گاؤں میں آپ ہی کے چرچے ہیں میرا دل گواہی دے رہا ہے اگر آپ ہمارے کیس میں کوئی مدد نہ بھی کرسکے تو کم از کم میر کہی ہوئی باتوں کو چوہدری تک نہیں پہنچائیں گے۔

اس نے اپنی کہی ہوئی بات کی وضاحت کی تو میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

مسٹر جمشید اپنے دل کی زیادہ نہ سنا کرو کہیں یہ تمھیں بے موت ہی نہ مروادے ۔ کیونکہ ہر بار تمھارے سامنے انسپکو خاور نہیں ہوگا ،،اب تم جا سکتے ہو،اپنے کان اور آنکھیں کھلی رکھنا ،اگر کوئی کام کی بات معلوم ہو تو فوراً مجھے خبر کرنا، یہ میرا سیل نمبر ہے ،میں نے ایک تعارفی کارڈ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا،تو اس نے کارڈ لے کر ایک نظر دیکھا اور جیب میں رکھ کر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆......☆......☆

اماوس کی گہری تاریک رات نے اپنے سیاہ پر پھیلا کر ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا،اندھیرا گہرا ہونے کے باوجود چوہدری بشارت کی وسیع و عریض حویلی کا شاندار اور کئی منزلہ ڈھانچہ اپنے وجود کی غیر معمولی حیثیت کو منوا رہا تھا یہ محل نما حویلی گاؤں سے کچھ فاصلے پر بنائی گئی تھی ،اور شاید الگ تھلگ بنانے کے پیچھے انفرادیت قائم رکھنے کی نفسیات کارگر رہی ہوگی۔

اس وقت حویلی کے برآمدوں میں اکا دکا بلب جل رہے تھے جن کی زرد روشنی اداسی لیے ہوئے تھی ،جبکہ چھت پر بگھیاڑی نسل کے کتوں کا جوڑا اٹھکیلیاں کرتا پھر رہا تھا۔

میں پچھلے آدھے گھنٹے سے حویلی کی عقبی دیوار کے ساتھ موجود ایک آم کے پیڑ پر موجود تھا۔

آم کی شاخیں خاردار تاروں کے اوپر سے

گزرتی ہوئی حویلی کے اندر جھکی ہوئی تھی۔

اب میرے پاس حویلی کی تلاشی لینے کے علاوہ کوئی آپشن نہیں بچا تھا، رفعت کو گم ہوئے آٹھ روز گزر چکے تھے، مگر کیس کو حل کرنا تو دور کی بات، میں ایک انچ بھی اسکے حل کی طرف نہیں کھسکا تھا۔

رفعت کی پوری کلاس اور ٹیچرز کی کئی بار تفتیش کر چکا تھا، گاؤں کے ہر اس شخص سے پوچھ گچھ کر چکا تھا، جس پر ایک فیصد بھی شک کیا جاسکتا تھا، مگر نتیجہ صفر کی صورت نکل رہا تھا۔

میری سروس کا یہ عجیب وغریب کیس مجھے نفسیاتی مریض بنانے پر تلا ہوا تھا، ایک جیتی جاگتی لڑکی غائب ہوگئی تھی، اور میں محض اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا پھر رہا تھا، اب میری سوچ کے تمام راستے اس حویلی کے سامنے آکر ختم ہورہے تھے، ہوسکتا تھا کہ یہاں سے مجھے کوئی ایسا کلیو مل جاتا جس سے کیس کو حل کرنے میں مدد مل جاتی۔

حویلی کے اندر اس انداز میں داخل ہونا بہت بڑا رسک تھا، مگر میں نے آخری حد تک کوشش کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا، اور اسی مقصد کے تحت میں پوری تیاری کے ساتھ یہاں موجود تھا۔

اصولی طور پر مجھے کور دینے کے لیے میرے ساتھ ایک دو ساتھی ہونے چاہیے تھے مگر تھانے میں کوئی ایک بھی ملازم ایسا نہیں تھا، جس پر اعتبار کیا جاسکتا تھا، اسی لیے یہ مہم مجھے اکیلے سر کرنی تھی۔

حویلی کے مرکزی گیٹ پر کئی مسلح محافظ موجود تھے مگر جب تک ان میں سے کوئی اس طرف نہ آتا تب تک کوئی خطرہ نہیں تھا، البتہ حویلی میں اترتے وقت چھت پر موجود کتوں کی نظر مجھ پر پڑ جاتی تو ان کے بھونکنے سے مسئلہ بن سکتا تھا اس کا میں نے یہ حل نکالا کہ کتوں کے اس طرف آنے کے ٹائم کو تسلسل نظر میں رکھے ہوئے تھا۔

اب کی بار وہ جوں ہی اس طرف آکر واپس پلٹتے تو میرے پاس چند لمحوں کی مہلت ہوتی تھی جس کا فائدہ اٹھا کر مجھے اندر داخل ہونا تھا۔

ابھی میں ذہن میں فائنلی ترتیب دہرا ہی رہا تھا، جب دونوں کتے ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے ہوئے چھت کی منڈیر پر لگی ہوئی سٹیل کی ریلنگ تک آکر واپس پلٹے تو میں نے اپنی پشت پر موجود بیگ کی زپ کھول کر اندر تہہ کر کے رکھی ہوئی لیدر کی چادر اور ایک رسی باہر نکال لی، رسی کے ایک سرے پر آنکڑہ بندہ ہوا تھا۔

لیدر کی چادر کو خاردار تاروں پر ڈالنے کے بعد میں نے آنکڑے کو دیوار پر موجود لوہے کے اینگل میں پھنسایا اور رسی کو حویلی کے اندر اچھال دیا، اس کے ساتھ ہی میں شاخ چھوڑ کر خاردار تاروں پر موجود لیدر کی چادر پر اتر آیا، اور پھر اگلے ہی لمحے رسی کو پکڑ کر حویلی میں اتر گیا۔

حویلی کی یہ باؤنڈری وال اصل عمارت سے کافی فاصلے پر تھی درمیانی جگہ میں باغیچہ تھا، جس میں مختلف قسم کے پھل اور پھولدار پودے لگے ہوئے تھے، انہیں پودوں کی اوٹ لیتے ہوئے میں اصل عمارت تک جا پہنچا۔ عقبی طرف سے باغیچے میں آنے کے لیے ایک دروازہ رکھا گیا تھا۔

میں نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالا تو وہ لاک تھا۔ میرا ہاتھ اپنے ٹراوزر کی پاکٹ میں رینگ گیا، جب باہر آیا تو ایک ہک نما تار میری انگلیوں میں دبی ہوئی تھی، اس تار کو میں نے کی ہول میں ڈال کر چند بار مخصوص انداز میں گھمایا تو ہلکی سی کڑک کی آواز کے ساتھ لاک کھل گیا۔

اس بار میں نے ہینڈل پر دباؤ ڈالا تو دروازہ بے آواز کھلتا چلا گیا۔

اندر داخل ہونے پر گھپ اندھیرے نے میرا استقبال کیا، میں دم سادھے وہیں کھڑا ہو گیا، کچھ دیر بعد میری آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو گئیں۔

یہ ایک راہداری تھی جس کے دونوں اطراف میں بیڈ رومز کے دروازے نظر آرہے تھے، یہاں کوئی دروازہ لاک نہیں تھا ایک کمرے میں دو بچے سورہے تھے، جبکہ باقی کمرے فرنشڈ ہونے کے باوجود خالی تھے۔

راہداری کا اختتام ٹی وی لاؤنج میں ہوا، لاونج کے مختلف اطراف میں مزید تین راہداریاں نظر آرہیں تھی۔ یہاں ایک کمرے میں چوہدری بشارت مل گیا وہ اپنی بیگم کے ساتھ لیٹا خراٹے مار رہا تھا۔

میں اس عورت کو داد دیئے بغیر نہیں نہ رہ سکا، چوہدری اس کے کان کے قریب خراٹے مار رہا تھا مگر وہ مزے سے سو رہی تھی۔ میں نے دروازے کو بے آواز بند کیا، اور آگے بڑھ گیا اگلے دو کمروں کے بعد ایک ایسے کمرے میں پہنچ گیا، جو دفتر کے انداز میں ڈیکوریٹ کیا گیا تھا، یہاں ریکوں میں بے شمار فائلیں موجود تھیں۔ دیکھنے پر معلوم ہوا زیادہ تر فائلیں زرعی زمینوں اور کاروبار سے متعلقہ تھیں، چند منٹوں میں ہی میں نے سارا دفتر کھنگال ڈالا مگر کوئی کام کی چیز ہاتھ نہیں لگی۔

میں یہاں بہت امید لے کر آیا تھا، مگر بے نیل و مراد کھڑا تھا، اب مزید یہاں ٹھہرنا خطرے کا موجب بن سکتا تھا، مایوسی سے میرے قدم عقبی باغیچے کی طرف جانے والی راہداری کی طرف اٹھنے لگے۔ پھر جیسے ہی عقبی دروازے کو کھول کر میں نے باہر جھانکا تو میرے اوسان خطا ہو گئے، میں نے دروازے کو فوراً واپس بند کر کے لاک کر دیا، میں جس رسی سے لٹک کر حویلی میں داخل ہوا تھا اس وقت بالکل اسی جگہ چار ہٹے کٹے مسلح گارڈز کھڑے تھے، ایک گارڈ رسی کو کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا، میرے لیے صورت حال گھمبیر رخ اختیار کر چکی تھی۔ اسی لمحے میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا، اس خیال کی تصدیق کرنے کے لیے میں دبے قدموں دوڑتا ہوا واپس ٹی وی لاؤنج میں پہنچا اور پھر وہاں سے گیراج میں آگیا۔ یہاں سے مرکزی گیٹ کے ایک طرف بنا ہوا سکیورٹی کیبن صاف نظر آرہا تھا۔ اس وقت وہاں کوئی گارڈ موجود نہیں تھا۔

میرے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ در آئی ان سے زیادہ بے وقوف گارڈ آج تک میری نظروں سے نہیں گزرے تھے، انہوں نے اپنا مین مورچہ ہی خالی کر دیا تھا۔

میرا اندازہ بالکل ٹھیک نکلا، کوئی ایک گارڈ حویلی کے گرد راؤنڈ لگانے گیا ہوگا، جب اسکی نظر دیوار سے لٹکتی ہوئی رسی پر پڑی ہو گی تو اس کی اطلاع پر سب ہی اس طرف بھاگ گئے ہوں گے۔

میں پھرتی سے گیٹ کے سامنے پہنچا اور پھر ذیلی دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

باہر نکلتے ہی بے اختیار میرے منہ سے ایک گہری سانس خارج ہو گئی۔ میں ایک یقینی تصادم سے بچ نکلا تھا۔ معروف راستے کی بجائے میں فصلوں سے ہوتا ہوا واپس اپنے کوارٹر پہنچ گیا۔

ناکام لوٹنے کی وجہ سے مجھ پر جھنجھلاہٹ سی طاری ہو رہی تھی۔ ایک ہی سانس میں آدھے سے زیادہ جگ پانی کا پی گیا۔

پھر خود کو پُرسکون کرنے کے لیے چند گہرے سانس لیے جس کا خاطر خواہ فائدہ ہوا۔ بستر پر لیٹ کر میں نے ایک بار پھر از سر نو سارے کیس کا تجزیہ کیا مگر کوئی بھی ایسا پوائنٹ ڈھونڈنے میں ناکام رہا جس سے کیس میں کوئی پیش رفت ہو سکتی۔

سوچتے سوچتے نہ جانے کب آنکھ لگ گئی۔

وہ سیل فون کی بھلی سی رنگ ٹون تھی جسے سن کر میری آنکھ کھلی تھی۔

کسلمندی سے اٹھتے ہوئے کھڑکی سے باہر جھانکا تو سورج کافی چڑھ چکا تھا۔

میں نے چونک کر وال کلاک کی طرف دیکھا تو وہ دس بجا رہا تھا۔ سیل فون پر کوئی اجنبی نمبر فلش کر رہا تھا، میں نے کال اٹینڈ کرتے ہوئے سیل فون کو کان سے لگا کر ہیلو کہا تو مجھے اپنی آواز کافی بھاری محسوس ہوئی۔

سر میں جمشید بات کر رہا ہوں ائیر پیس سے جمشید کی آواز برآمد ہوئی۔

ہاں جمشید بولو میں سن رہا ہوں، میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

سر آپ کے علم میں ایک انتہائی اہم بات لانی تھی، ہمارے قصبے سے چند فرلانگ کے فاصلے پر نہر کے بالکل سامنے چوہدری بشارت کا ایک بہت بڑا فارم ہاؤس ہے، وہاں پر چوہدری اکثر اشتہاری ملزموں کو پناہ دیتا ہے لیکن جب بھی اس نے اپنی عیاشی کا سامان کرنا ہو تو وہاں پر موجود لوگوں کو کچھ دنوں کے لیے دائیں بائیں بھجوا دیتا ہے، تب وہاں پر اس کے علاوہ بس اسکا ایک خاص بندہ ہوتا ہے۔

میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ جس دن رفعت غائب ہوئی تھی اس سے ایک دن پہلے چوہدری نے وہ فارم ہاؤس اشتہاریوں سے خالی کروا لیا تھا، اس کا تو یہی مطلب ہوا کہ وہاں پر رفعت یا کوئی اور لڑکی ضرور موجود ہے، جمشید نے پر جوش انداز میں اپنی بات مکمل کی۔

بالفرض اگر وہاں کوئی لڑکی موجود ہے تو پھر چوہدری وہاں جاتا کیوں نہیں، میری اطلاع کے مطابق وہ رات حویلی میں موجود ہوتا ہے، اور دن میں تو وہ ہر وقت لوگوں میں گھرا رہتا ہے۔

رات میں خود اپنی آنکھوں سے چوہدری کو حویلی میں دیکھ کر آیا تھا اسی کی بنیاد پر میں نے جمشید کی بات رد کر دی۔

سر جی چوہدری آج وہاں ضرور جائے گا، کیونکہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کی بیوی بچوں سمیت میکے گئی ہے، جمشید نے ایک اور انکشاف کیا۔

تمہیں کیسے معلوم ہوا، میں نے چونک کر پوچھا۔

چوہدری کا گھریلو ڈرائیور ہمارا پڑوسی ہے، اسکی بیوی اکثر امی کے پاس بیٹھی ان کے متعلق باتیں کرتی رہتی ہے، تو اتفاقاً کوئی نہ کوئی بات میرے کان میں بھی پڑ جاتی ہے۔

جمشید نے اپنا سورس بتایا تو میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔

ان سب باتوں سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ وہاں پر رفعت موجود ہے، میں نے سادہ سے لہجے میں کہا۔

سر میرا دل کہہ رہا ہے کہ رفعت ضرور وہیں ہے، اس نے زور دینے والے انداز میں کہا۔

یار میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ اپنے دل کو قابو میں رکھو، کہیں یہ تمہیں بے موت نہ مروا دے، اگر کوئی کام کی بات معلوم ہو تب مجھے ضرور

فون کرنا، میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دے کر کال منقطع کردی۔

اس کی بات میں وزن تھا مگر میں پہلے کی طرح مفروضوں کے پیچھے نہیں بھاگنا چاہتا تھا، ہلکا سا ناشتہ کرنے کے بعد میں تھانے میں آگیا، یہاں راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا، کرسی سنبھالتے ہی میں نے اے ایس آئی کو طلب کرلیا، کچھ پتا چلا۔ میں نے اس کے سیلوٹ کا جواب سر ہلا کر دیتے ہوئے پوچھا۔

سر جی میں نے سرتوڑ کوشش کی ہے مگر کچھ پتا نہیں چلا، میرے خیال میں تو لاش کو آبی مخلوق نے کھالیا ہے، ورنہ اتنے دنوں میں تو مل جانی چاہیے تھی، مجھے تو لگتا ہے یہ کیس داخل دفتر کرنا پڑے گا۔

اے ایس آئی نے اتنی بڑی بات سادہ سے لہجے میں اتنی آسانی سے کردی کہ میں اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

گاڑی نکلواؤ میں نے سرگودھا جانا ہے، میں نے خشک لہجے میں کہا تو وہ سیلوٹ کر کے واپس مڑ گیا۔

اب میرے پاس اپنی مین برانچ کے ایس پی ملک صفدر صاحب سے مل کر تمام حالات ڈسکس کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔

میں اپنی سروس کے شروع میں ان کے ساتھ کام کر چکا تھا، انتہائی بااصول اور شفیق انسان تھے، مجھے اپنا بیٹا کہتے تھے، طبعیت ملنے کی وجہ سے ہماری گاڑھی چھنتی تھی۔

اگلے دو گھنٹے بعد میں ان کے سامنے بیٹھا تھا، میری ساری بات کو انہوں نے انتہائی انہماک سے سنا تھا، اور اب وہ ریوالونگ چیئر سے ٹیک لگائے چھت میں کوئی چیز کھوج رہے تھے، یہ ان کے سوچنے کا مخصوص انداز تھا۔

جمشید نے بہت اہم انفارمیشن دی ہے، اب اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ چوہدری بشارت کو چیک کرلیا جائے، پہلے بھی وہاں سے کافی بچیوں کے اسی سے ملتے جلتے کیسوں کی اطلاعات ہیں، مگر چوہدری کا اثر ورسوخ اور سیٹ اپ کچھ ایسا ہے کہ لوگ تھانے کا رخ نہیں کرتے بحرحال اب مزید دیر نہیں ہونی چاہیے۔

مگر کیسے سر؟ میں نے بے بسی سے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔

میرے ذہن میں ایک پلان ہے اس پر عمل کرتے ہیں، انہوں نے پراسرار سے لہجے میں کہا۔

وہ کیا.....؟ میں نے اشتیاق سے پوچھا تو، وہ سرگوشی کے اندا میں اپنے ذہن میں موجود پلان مجھے بتانے لگے۔

سر اگر یہ پلان فیل ہوا، اور میں ایکسپوز ہوگیا تو چوہدری اور اس کا وزیر بھائی ہتھے سے اکھڑ جائیں گے۔ میں نے پلان سننے کے بعد اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

ڈونٹ وری میں تمہارا ٹرانسفر لیٹر پہلے سے تیار رکھوں گا، اگر ایسا کچھ ہوا تو تمہیں فوری منظر سے ہٹالیا جائے گا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

یہ ٹرانسفر لیٹر تو کسی بدروح کی طرح میرے پیچھے پڑا ہوا ہے، جہاں بھی جاتا ہوں یہ میرا پیچھا کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتا ہے، میں نے منہ بناتے ہوئے کہا، تو ایس پی صاحب کے قہقہے سے دفتر گونج اٹھا۔

☆......☆......☆

چوہدری بشارت کا وسیع وعریض پرشکوہ فارم

ہاؤس کسی شہزادے کی رہائش گاہ جیسا تھا۔
اس وقت رات اپنے آخری پہر میں داخل ہو چکی تھی جب میں فارم ہاؤس کی عقبی دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہوا۔ اندر داخل ہونے کے لیے مجھے کافی انتظار کرنا پڑا تھا، اس کی وجہ دو بلڈاگ تھے جو کسی ناگہانی بلا کی صورت راستہ روکنے کیلئے موجود تھے۔
بے ہوشی کی دوا ملا گوشت انہوں نے بہت ناک بھنویں چڑھانے کے بعد نوش کیا تھا، اب اس کے نتیجے میں بے ہوش پڑے تھے۔
میں نے حسب سابق اپنے چہرے کو نقاب سے کور کیا ہوا تھا، جس میں سے صرف آنکھیں نظر آرہی تھیں، بیرونی چار دیواری سے فارم ہاؤس کی عمارت تک کی درمیانی جگہ میں مختلف قسم کے پھلدار درخت لگے ہوئے تھے۔ فارم ہاؤس کی عمارت پر لگی ہوئی سرچ لائٹوں سے باغ بقعہ نور بنا ہوا تھا۔
میں درختوں کی اوٹ لیتا ہوا لمبا چکر کاٹ کر مین گیٹ کے ساتھ بنے ہوئے سکیورٹی کیبن کے پاس پہنچ گیا، پھر احتیاط سے اندر جھانکا تو اندر گارڈ موجود تھا، وہ کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا، جبکہ اس نے اپنی گن کو کرسی کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا کیا ہوا تھا۔
میں دبے قدموں اس کے سامنے پہنچا اور اس سے پہلے کہ اس کی آنکھ کھلتی، میرے ریوالور کے دستے کی نپی تلی ایک ہی ضرب سے اس کی کنپٹی پر آلو ابھر آیا۔ وہ بے ہوش ہوتے ہوئے کرسی سے نیچے گر گیا تھا۔
میں نے آگے بڑھ کر اسے سیدھا کیا تو چونک گیا، اس گارڈ کو تو میں نے اس دن حویلی میں دیکھا تھا، جب وہ میری لٹکائی ہوئی رسی کا معائنہ کر رہے تھے۔ گو میں نے اسے ایک نظر ہی دیکھا تھا مگر اس کا کیم شحیم وجود میرے ذہن میں رہ گیا تھا۔
میں نے اسی کے ازار بند سے اسکی مشقیں کس دیں، اور اپنے پاس موجود بیگ میں سے ٹیپ نکال کر اس کے منہ پر چپکا دی، اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اسے گھسیٹ کر دیوار کے سہارے بٹھا دیا، اور پھر پوری قوت سے اس کے چہرے پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔
کچھ ہی دیر میں اس نے آنکھیں کھول دی، ہوش میں آنے کے بعد اس نے لاشعوری طور پر اٹھنے کی کوشش کی، مگر بندھے ہونے کی وجہ سے صرف کسمسا کر رہ گیا۔ اس دوران میں بیگ میں سے خنجر نکال چکا تھا۔ اسٹین لیس اسٹیل کے خنجر کے ایک طرف تیز دھار جبکہ دوسری طرف آری کی طرز پر دندان بنے ہوئے تھے، چمکتے ہوئے خنجر پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں خوف کی وجہ سے حلقوں سے باہر آگئیں۔
میں تمہارے منہ سے ٹیپ ہٹا رہا ہوں اگر تم نے چیخنے کی کوشش کی تو ایک لمحے میں تمہاری شہ رگ کاٹ دوں گا۔ مجھے علم ہے یہاں تمہارے علاوہ اور کوئی گارڈ موجود نہیں ہے اور رہی بات چوہدری کی تو وہ یقیناً کسی ساؤنڈ پروف کمرے میں ہے وہاں تک تمہاری آواز جا ہی نہیں سکتی۔
اور اگر تم تعاون کرتے ہوئے چند سوالوں کے جواب دے دو گے تو تمہاری زندگی بخشی جا سکتی ہے تم بحر حال ایک مہرے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ بولو کیا کہتے ہو میں نے اس کے سامنے دو آپشن رکھے، تو وہ زور زور سے سر ہلا کر اپنی رضامندی ظاہر کرنے لگا۔
ٹھیک ہے میں ٹیپ اتارنے لگا ہوں، اب یہ

تمہارے ہاتھ میں ہے کہ تم زندہ رہنا چاہتے ہو کہ نہیں، میں نے ایک بار پھر سے اسے غلط حرکت سے باز رہنے کی وارننگ دی، اور ایک جھٹکے سے اس کے منہ پر لگی ہوئی ٹیپ کو کھینچ کر اتار دیا۔

ٹیپ کے ساتھ اس کی مونچھوں کے کافی بال بھی اتر آئے جس کی تکلیف سے وہ سسک کر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں خوف جیسے ثبت ہو گیا تھا، آج سے پہلے وہ بے بس اور مجبور لوگوں پر ظلم ہی ڈھاتا رہا ہو گا۔ مگر آج موت کو سامنے دیکھ کر بھیگی بلی بنا ہوا نظر آرہا تھا۔

میں پہلے چند ایسی باتیں پوچھوں گا جن کا جواب مجھے خود معلوم ہے، اگر تم نے ان سوالوں کے ٹھیک جواب دیے تو پھر اصل بات پوچھوں گا۔ یقین مانو جہاں مجھے محسوس ہوا کہ تم مجھے ڈاج دینے کی کوشش کر رہے ہو، اسی لمحے تم تڑپتے ہوئے نظر آؤ گے میں نے اسے نفسیاتی ٹریپ میں جکڑتے ہوئے کہا م میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔

اس کے گلے سے پھنسی پھنسی سی آواز برآمد ہوئی، اس کے لمبے تڑنگے جسم کو دیکھ کر لگتا نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی ڈر جائے گا۔ بحر حال موت کا خوف اس کے چہرے سے صاف عیاں ہو رہا تھا۔

تمہارا نام کیا ہے، تم کل رات چوہدری کی حویلی میں پہرہ دے رہے تھے، اسی دوران تم لوگوں نے اس رسی کو ٹریس کیا تھا جس کے ذریعے کوئی شخص حویلی کے اندر داخل ہوا تھا۔

ظاہر ہے تم لوگوں نے چوہدری کو آگاہ کیا ہو گا، تو اس کا ردِ عمل کیا تھا۔

میں نے خنجر اس کے حلق پر رکھتے ہوئے انتہائی سرد لہجے میں سوال کیا میرا سوال سن کر وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا، میں نقاب کیے ہوئے تھا اسے میری آنکھوں کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا، یقیناً اسے میری بات سن کر اسے کنفرم ہو گیا تھا کہ کل رات حویلی میں داخل ہونے والا شخص اس کے سامنے کھڑا ہے۔ میرا نام شیر علی ہے، چوہدری صاحب پیار سے شیرو کہتے ہیں۔

کل رات حویلی کے گرد راؤنڈ کرتے ہوئے میں نے ہی دیوار کے ساتھ لٹکتی ہوئی رسی کو دیکھا تھا اس کے بعد ہم سب سکیورٹی والوں نے اس شخص کو تلاش کرنا شروع کیا تو انکشاف ہوا کہ وہ مین گیٹ سے باہر نکل گیا ہے۔

اگر ہم اس واقعے کی اطلاع چوہدری کو دیتے تو وہ ہمارا خون پی جاتا، اسی خوف سے ہم نے کسی سے ذکر ہی نہیں کیا شیرو نے تھوک نگلتے ہوئے تفصیل بتائی۔

او کے ٹھیک ہے اب یہ بتاؤ اس وقت چوہدری کے ہمراہ کتنے لوگ موجود ہیں، میں نے بدستور جارحانہ لہجے میں پوچھا۔

وہ وہ مجھے جان سے مار دے گا، اگر میں نے بتایا تو اس نے گھگھیاتے ہوئے جواب دیا۔

وہ تو پتہ نہیں کب مارے گا، میں تو ابھی تمہارا نرخرہ کاٹ دوں گا، میں نے دانت نکوستے ہوئے کہا تو اس دوران غیر ارادی طور پر میرے ہاتھ کا دباؤ اس کی گردن پر بڑھ گیا جس سے اس کی گردن پر خون کی لکیر بہنے لگی۔

اس کے ساتھ ایک لڑکی ہے، مگر میں نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا، نہ ہی ہمیں کوئی سوال پوچھنے کی اجازت ہے۔ شیرو نے جواب دیا تو ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کہیں دور سے دوڑتا ہوا آرہا ہو، اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

تم نے ٹھیک جواب دے کر وقتی طور پر تو اپنی جان بچالی ہے۔

پہلے میں اس خبیث چوہدری سے نپٹ لوں ،اس کے بعد سوچتے ہیں تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے ۔ میں نے خنجر کو واپس بیگ میں رکھتے ہوئے کہا۔

اور پھر دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں کو ہک کی طرح موڑتے ہوئے پوری طاقت کے ساتھ اس کی کنپٹی پر دے ماری، وہ ایک لمحے کے لیے کسی ذبح کیے ہوئے جانور کی طرح تڑپا اور پھر اس کے ہاتھ پاؤں سیدھے ہو گئے۔

مجھے وہاں سے نکل کر فارم ہاؤس کی عمارت تک پہنچنے میں چند سیکنڈ سے زیادہ وقت نہیں لگا ،گیراج میں نئے ماڈل کی لینڈ کروزر کھڑی تھی ،اس کے قریب سے گذر کر انٹرنس کے دروازے تک پہنچا دروازہ اندر سے لاک تھا جسے کھولنے میں مجھے چند سیکنڈ لگے ،جیسے ہی میں دبے پاؤں سیٹنگ روم میں داخل ہوا تو میری توقع کے خلاف چوہدری نا صرف جاگ رہا تھا ، بلکہ اکیلا بیٹھا شراب پی رہا تھا۔اس وقت بھی اس کے ہاتھ میں بھرا ہوا گلاس تھا جبکہ سامنے موجود ٹیبل پر دو خالی اور ایک آدھی بوتل موجود تھی۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ ایسے ساکت ہوا، جیسے چلتے ہوئے کھلونے کی اچانک چابی ختم ہو گئی ہو۔

کون ہو تم اور تمھاری جرات کیسے ہوئی یہاں داخل ہونے کی۔

کچھ دیر بعد جب چوہدری کی حیرت کم ہوئی تو اس نے نشے سے چور لہجے میں رعب جھاڑنے کی کوشش کی، میں نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے اس کے سامنے رکھے ہوئے ٹیبل کو ایک جاندار ٹانگ رسید کی تو ٹیبل الٹ کر اس پر جا گرا جس سے گلاس اور بوتلیں فرش پر گر کر چکنا چور ہو گئیں۔

اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر نشے کی زیادتی کی وجہ سے لڑکھڑا کر واپس صوفے پر گر گیا، اس دوران میں نے آگے بڑھ کر اس کی کنپٹی پر نپی تلی سپین راؤنڈ کک جڑ دی تو وہ بے ہوشی کی وادی میں اترتا چلا گیا۔ اس کے بے ہوش ہوتے ہی میں نے ٹرانسمیٹر نکال کر ایس پی صاحب کی فریکونسی ملائی، کال فوراً ہی رسیو کر لی گئی۔

یس ۔اوور۔ رابطہ ملتے ہی ایس پی صاحب کی سپاٹ آواز سنائی دی۔

سر......راستہ کلیئر ہے......اوور...... میں نے انہیں مختصر سی رپورٹ دی۔

ویل ڈن بوائے ...... ہم آرہے ہیں......اوور اینڈ آل۔

رابطہ منقطع ہوتے ہی میں نے ٹرانسمیٹر واپس رکھا اور اطراف میں موجود کمروں کو چیک کرنے لگا کچھ ہی وقت کے اندر میں نے پوری عمارت کھنگال ڈالی ، مگر رفعت تو کیا کوئی اور لڑکی بھی برآمد نہیں ہوئی۔

کیا شیرو نے مجھے ڈاج دیا ہے ۔میں خود کلامی کے انداز میں بڑبڑاتا ہوا واپس سیٹنگ روم میں داخل ہوا تو ایس پی صاحب سپیشل فورس کے پانچ مسلح کمانڈوز کے ساتھ وہاں موجود تھے۔ان سب کے چہروں پر نقاب موجود تھے۔

لگتا ہے رفعت یہاں موجود نہیں ہے، ایس پی صاحب نے میری چال میں چھپی ہوئی مایوسی کو نوٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

واقعی سر پوری عمارت خالی پڑی ہے۔

مگر گیٹ پر موجود گارڈ شیر علی عرف شیرو نے تصدیق کی تھی کہ یہاں ایک لڑکی موجود ہے، گو کہ اس نے لڑکی کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔اور جس حالت میں اس نے یہ معلومات اُگلیں ہیں اس کنڈیشن

میں جھوٹ بولنا دل گردے کا کام ہے۔

میں نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔

ڈونٹ وری بوائے اب یہ شیطان کا چیلا خود ہی بتائے گا کہ اس نے رفعت کو کہاں چھپایا ہے۔

نمبر فور اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ہوش میں لے آؤ، انہوں نے مجھے تسلی دینے کے بعد ایک کمانڈو کو کوڈ نام سے مخاطب کرتے ہوئے نیا حکم دیا، تو اس نے چوہدری کی مشقیں کس دی اور پھر ایک ہی ہاتھ سے اس کا ناک اور منہ بند کر دیا، جب چوہدری کو آکسیجن ملنا بند ہوئی تو اس کے جسم میں حرکت کے آثار پیدا ہو گئے، پھر جیسے ہی اس کے جسم کو جھٹکے لگنے لگے تو نمبر فور پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

اسی لمحے چوہدری نے آنکھیں کھول دی ۔اس دوران ایک کمانڈو کچن سے پانی کا بھرا ہو جگ لے آیا اور چوہدری کے چہرے پر دھار کی صورت انڈیل دیا، چہرے پر پانی گرنے سے اس کا نشہ ہرن ہو گیا۔

اتنے سارے مسلح نقاب پوشوں کو دیکھ کر وہ ذرا سا بھی نروس نہیں ہوا تھا۔

شاید تم لوگ مجھے نہیں جانتے ہو اس لیے تم سے انجانے میں یہ حماقت ہو گئی ہے، میں تمھاری اس حرکت پر تمھیں تمھاری فیملیوں سمیت زمین میں گاڑ سکتا ہوں اگر تم لوگ خیریت چاہتے ہو تو مجھے کھول کر یہاں سے دفع ہو جاؤ ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہو گا۔

چوہدری نے دھاڑتے ہوئے کہا، اس کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے وہ نارمل حالات میں اپنے ملازموں سے مخاطب ہو۔

ایس پی صاحب چند لمحے غور سے اس کی طرف دیکھتے رہے پھر کمانڈوز کو ایک مخصوص اشارہ کیا تو وہ سب ایک ساتھ چوہدری پر پل پڑے،، انہوں نے چند منٹوں میں ہی مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیا، اس کے ناک اور منہ سے خون بہنے لگا تھا۔

تمھیں جو کچھ چاہیے یہاں سے لے جاؤ مگر پلیز مجھے مت مارو، اس نے ہانپتے ہوئے لہجے میں آفر کی ۔اسکے لہجے میں خوف در آیا تھا۔

رفعت کہاں ہے ۔ایس پی صاحب نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ڈائرکٹ سوال پوچھا۔

رفعت کا نام سن کر چوہدری کے جسم کو ایسے جھٹکا لگا جیسے اس کا ہاتھ بجلی کے ننگے تار سے چھو گیا ہو۔

آ......آ......آپ لوگوں کو کوئی شدید غلط فہمی ہوئی ہے وہ تو میرے استاد کی بیٹی ہے...... بھلا میں کیوں اسے اغوا کروں گا۔

چوہدری کی آواز پہلی بار لڑکھڑائی تھی، اس کا لہجہ چغلی کھاتا ہوا محسوس ہوا جیسے اس نے خود کو سنبھال لیا ہے۔

تمھارے سکیورٹی گارڈ شیرو نے ہمیں بتایا ہے کہ رفعت تمھارے ساتھ یہاں موجود ہے، اس لیے سیدھی طرح بتاؤ تم نے اسے کہاں چھپا رکھا ہے، ورنہ اس فارم ہاؤس کو شمشان گھاٹ ڈکلئیر کر کے یہیں تمھاری چیتا جلا دوں گا۔

میں نے اس بار ایس پی صاحب کے کچھ کہنے سے پہلے ہی جھنجھلائے ہوئے لہجے میں دھمکی دی۔

مجھے نہیں علم کہ شیرو یہ بہتان مجھ پر کیوں لگا رہا ہے۔

ہاں شاید اسے غلط فہمی ہوئی ہو گی، شام کے

وقت سرگودہا سے ایک ڈانسر لڑکی میرے ساتھ یہاں آئی تھی مگر پھر وہ واپس چلی گئی تھی۔جب وہ واپس گئی تھی تب شیرو کو میں نے ایک کام سے حویلی بھیجا تھا اس لیے اس نے لڑکی کو واپس جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

ہوسکتا ہے شیرو نے اسے رفعت سمجھا ہو۔یہ پوری عمارت آپ کے سامنے ہے،بے شک تلاشی لے لیں اس وقت یہاں کوئی لڑکی موجود نہیں ہے۔

چوہدری نے نارمل انداز میں جواب دیا،اس کا اعتماد بھرا جواب بتا رہا تھا کہ وہ اپنے اعصاب پر مکمل کنٹرول حاصل کر چکا ہے۔

یہ ایسے نہیں مانے گا اس ایک بار پھر تواضع کرو،ایس پی صاحب نے حکم دیا تو کمانڈوز نے اسے دوبارہ سے ٹھڈوں پر رکھ لیا۔

اگلے دو گھنٹوں تک ہم نے چوہدری کو تختہ مشق بنائے رکھا،اس دوران وہ کئی بار بے ہوش ہوا،مگر مان کے نہیں دیا تشدد کے باعث اس کا جسم شدید زخمی ہو چکا تھا پھٹے ہوئے ہونٹ سوج کر کپا بن گئے تھے،ایک آنکھ سوج کر بند ہو چکی تھی۔

اس وقت وہ فرش پر پڑا،درد کی شدت سے کراہ رہا تھا۔ایس پی صاحب سر پکڑے صوفے پر بیٹھے تھے،میرا اپنا دماغ بھی ماؤف سا ہو رہا تھا ،کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا،کیا جائے۔

ایک بار پھر عمارت کی باریکی سے تلاشی لو،ہو سکتا ہے کہیں کوئی خفیہ کمرہ نہ ہو،ایس پی صاحب نے کمانڈوز کو نئی ہدایات دیں،اور اٹھ کھڑے ہوئے۔اس سے زیادہ دباؤ مناسب نہیں ہے ،اب ہمیں یہاں سے نکلنا چاہیے،انہوں نے میرے قریب سے گزرتے ہوئے سرگوشی کی،اور صوفے پر پڑی ہوئی چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔

یہ وہ سامان تھا جو چوہدری کی جیبوں سے برآمد ہوا تھا،ایس پی صاحب سامان میں موجود ایک اینڈرائیڈ سیل فون کو اٹھایا اور چیک کرنے لگے۔

جس وقت انہوں نے سیل فون اٹھایا،مجھے چوہدری کے جسم میں بے چینی سی پھیلتی ہوئی محسوس ہوئی،ابھی میں اس کی اس حرکت کو نوٹ کر ہی رہا تھا کہ سیل فون سے کسی لڑکی کی آواز ابھرنے لگی۔

چوہدری صاحب آپ کو آپ کے بچوں کا واسطہ ہے مجھے یہاں سے نکال لیں۔

تم میں بہت نخرہ ہے نہ اب تھوڑا مزہ چکھو نخرے کرنے کا،سوچتا ہوں کچھ تمہارے بارے میں۔

چوہدری کی نشے میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی،اس کے ساتھ ہی کال ختم ہوگئی۔

یہ ریکارڈ شدہ کال تھی،اور بھی ہیں،ایس پی صاحب نے میری طرف دیکھتے ہوئے وضاحت کی اور دوسری کالیں سننے لگے،سب میں تقریباً ایک جیسی گفتگو تھی۔لڑکی منتیں ترلے کر رہی تھی مگر چوہدری فرعون بنا اسے نخرہ کرنے کی مزید سزا دینے پر مصر تھا۔

لڑکی والے نمبر پر بیک کال کی تو نمبر بند مل رہا تھا۔باری باری سب کمانڈوز واپس آگئے،وہ کسی خفیہ کمرے کو تلاش کرنے میں ناکام رہے تھے۔

اب تمہارے پاس انکار کی کوئی وجہ ہے،ایس پی صاحب نے زہریلے لہجے میں پوچھا،ان کا چہرہ غصے کی شدت سے پکے ہوئے ٹماٹر کی طرح سرخ ہو رہا تھا چوہدری پچھلے دو گھنٹوں سے

بہترین تربیت یافتہ لوگوں کو اپنی زبان کی تیزی سے بے وقوف بنا رہا تھا، اگر اتفاقاً ریکارڈ شدہ کالیں سامنے نہ آتیں تو، ہم تو بس واپس جا ہی رہے تھے۔

تم سے جو ہوتا ہے کرلو میں نہیں بتاؤں گا کہ وہ کہاں ہے اس نے میرے منہ پر تھوکا تھا، میں اسے بدلہ لیے بغیر نہیں چھوڑوں گا۔ اور تم لوگوں کو تو میں پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالوں گا۔

اگر تم لوگ ابھی یہاں سے چلے جاؤ تو ہوسکتا ہے کہ میں تمہیں معاف کر دوں۔ چوہدری نے نخوت بھرے لہجے میں جواب دیا، اس کے جواب سے لگ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ بندھا ہوا بے بس پڑا ہے۔

تم لوگ چاہے اس کے جسم کا ایک ایک ریشہ الگ کر دو یا تمام ہڈیاں توڑ دو، مجھے بس لڑکی چاہیے۔

ایس پی صاحب نے کمانڈوز سے مخاطب ہو کر کہا تو، وہ ایک بار پھر اس پر پل پڑے۔

میں قریب ہی کھڑا اسے پٹتا دیکھ رہا تھا کہ اچانک میرے ذہن میں شیرو کا خیال آیا تو میں باہر کی طرف دوڑا جیسے ہی میں سکیورٹی کیبن میں داخل ہوا ایک سایہ سا مجھ پر جھپٹا، اور اس نے میرے پیٹ میں جاندار مکا رسید کر دیا۔

شیرو نہ صرف ہوش میں آچکا تھا، بلکہ اس نے اپنے ہاتھ پاؤں بھی آزاد کروا لیے تھے۔

اس کے ہتھوڑے جیسے پنچ سے میرا سانس رک گیا اور آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے تارے گردش کرنے لگے، جبکہ اندھیرا بار بار میرے ذہن پر جھپٹ رہا تھا ایک لمحے کے لیے مجھے لگا کہ میں بے ہوش ہو جاؤں گا، میں نے سر کو جھٹک کر خود کو ہوش میں رکھنے کی کوشش کی اس جدوجہد میں میرا سانس بحال ہو گیا۔ مجھے زیر کرنے کیلئے شیرو کے پاس یہ بہترین موقع تھا، نجانے کیا وجہ رہی ہوگی کہ اس نے مجھ پر دوبارہ حملہ نہیں کیا۔

بلکہ وہ دروازے کی طرف بھاگا، وہ شاید فرار ہونا چاہتا تھا، جیسے ہی وہ میرے قریب سے گزرنے لگا، میں نے اپنی ٹانگ آگے کر دی جس سے الجھ کر وہ بری طرح گرا اس کے سنبھلنے تک میری حالت میں کافی بہتری آگئی تھی۔

جیسے ہی وہ اٹھ کر کھڑا ہوا، میں ہوا میں اچھلا اور میری جاندار جمپ بیک کک اس کی چھاتی پر لگی تو وہ عجیب سے آواز نکالتا ہوا کیبن کی دیوار سے جا ٹکرایا، اس کا سر بھی دیوار سے ٹکرایا تھا، اب وہ فرش پر پڑا بار بار سر کو جھٹک رہا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کی ٹانگ پکڑی اور اسے گھسیٹتے ہوئے کرسی کے قریب لے آیا اور پھر اس کی ٹانگ کو کرسی پر رکھ دیا، اس سے پہلے کہ اسے سمجھ آتا کہ میں کیا کرنے والا ہوں، میں ہوا میں اچھلا اور پوری طاقت سے پریشر کک اس کے گھٹنے پر دے ماری گھٹنے کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز اور اسکی تکلیف میں ڈوبی ہوئی چیخ بیک وقت بلند ہوئی تھی۔

وہ بلا مبالغہ ایسے تڑپا، جیسے مچھلی پانی سے باہر تڑپتی ہے۔

میں نے کہا تھا نہ میرے ساتھ جھوٹ بولنے کی کوشش بھی مت کرنا، میں نے اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو ایک طرف کیا اور اسکی دوسری ٹانگ پکڑ کر کرسی پر رکھتے ہوئے کہا۔ تو خوف اور دہشت سے اس کا رنگ گہرا زرد ہو گیا۔

م م میں مر جاؤں گا، خدا کیلئے مجھ پر رحم کرو میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں خدا کے لیے مجھ

پر رحم کرو، میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا، اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر گھگھیاتے ہوئے کہا، اس کا جسم جاڑے کے بخار میں مبتلا مریض کی طرح کانپ رہا تھا۔

میں تمہیں آخری موقع دے رہا ہوں، بتاؤ لڑکی کہاں ہے، ورنہ دوسری ٹانگ بھی توڑ دوں گا پھر ساری عمر گندی نالی کے کیڑے کی طرح رینگتے پھرو گے۔

میں نے زہریلے لہجے میں وارننگ دی۔

خدا کی قسم مجھے جو کچھ بھی معلوم تھا، میں نے سب تمہیں بتا دیا تھا، مجھ پر رحم کرو، اس نے ایک بار پھر اپنی بات پر اصرار کیا تو مجھے لگا کہ اسے واقعی اس سے زیادہ اور معلوم نہیں۔

یہاں کوئی ایسی بات ہوئی ہو جو معمول سے ہٹ کر ہوئی ہو، میں نے ایک اور زاویے سے پوچھا۔

تکلیف سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ ہاتھ باندھے ترحم آمیز نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

میری بات سن کر وہ چونک سا گیا، جیسے اسے کوئی بات اچانک یاد آ گئی ہو، ہاں یاد آیا آج دن میں چوہدری صاحب نے فارم ہاؤس کی عقبی جانب گلابوں کے باغیچے میں مجھ سے ایک گڑھا نکلوایا تھا۔ اور یہ کام وہ ہر پانچ چھ ماہ بعد ایک بار ضرور مجھ سے کرواتے ہیں۔

اور مجھے سختی سے منع بھی کیا ہے کہ اس بارے میں کسی سے کوئی بات نہیں کرنی۔

اس کی بات سن کر میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔

کیا ہر بار ایک ہی جگہ گڑھا نکالتے ہو، یا ہر بار مختلف جگہ ہوتی ہے، اور جو گڑھے تم نکالتے ہو کیا ان کو بند بھی تم ہی کرتے ہو۔ میں نے تیزی سے پوچھا، نہیں ہر بار جگہ مختلف ہوتی ہے۔

اور چوہدری صاحب مجھ سے صرف گڑھا نکلواتے ہیں، بند کبھی نہیں کروایا، اور نہ ہی مجھے علم ہے کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں، بس یہ بات روٹین سے ہٹ کر تھی، اسی لیے میرے ذہن میں آ گئی۔

ابھی شیرو نے اپنی بات مکمل کی ہی تھی جب میرا ہاتھ گھوما اور اس کی کنپٹی پر پٹاخہ چھوڑ گیا، اس کی آنکھیں ایسے بند ہوئیں جیسے کیمرے کا شٹر ڈاؤن ہو گیا ہو۔

میں واپس بھاگتا ہوا سیٹنگ روم میں داخل ہوا تو اس وقت چوہدری بے ہوش پڑا تھا جبکہ ایک کمانڈو اس پر جھکا ہوا اس کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔

کیا ہوا، کہاں گئے تھے، ایس پی صاحب نے مجھ سے پوچھا۔

اسے ابھی بے ہوش رہنے دو شاید مجھے پتا چل گیا ہے کہ رفعت کہاں ہے، میرے ساتھ آئیں وقت بہت کم ہے، میں نے جلدی سے جواب دیا، اور عمارت کے عقبی طرف دوڑ لگا دی۔

کچھ ہی دیر میں ہم گلابوں کے باغیچے میں کھڑے تھے، عمارت پر لگی ہوئی سرچ لائٹس کی روشنی میں ہر چیز واضح نظر آ رہی تھی، یہاں ایک جگہ مٹی نرم تھی، جیسے گڑھا کھود کر دوبارہ بند کیا گیا ہو، اور حیرت کی بات یہ تھی کہ مٹی میں سے ایک پائپ کا سرا باہر نکلا ہوا تھا، قریب ہی بیلچہ اور رسی پڑی ہوئی تھی۔

اس پائپ کو بچاتے ہوئے مٹی باہر نکالو، میں نے کمانڈوز کو کہا تو وہ فوراً اس کام میں جت گئے۔ اس دوران میں نے شیرو سے ہونے والی ساری

گفتگو ایس پی صاحب کو بتادی۔
کمانڈوز نے چند منٹوں میں ہی گڈھے میں سے ساری مٹی نکال لی۔ پانچ فٹ گہرائی میں ایک تابوت دفن تھا، تابوت پر ایک آکسیجن سلنڈر رکھ کر ایک پائپ کے ذریعے اسکا کنکشن تابوت میں کیا گیا تھا۔ جبکہ ایک اور بڑے قطر کے لمبے پائپ کو تابوت سے منسلک کر کے باہر فضا میں نکالا گیا تھا۔ یہ سارا انتظام جو کوئی بھی اس تابوت میں موجود تھا، اسے زندہ رکھنے کے لیے کیا گیا تھا شاید قیدی کو ڈرانے دھمکانے کے لیے یہ حربہ استعمال کیا گیا تھا۔
یہ سارا سسٹم دیکھ کر میرے ذہن میں چوہدری کے موبائل سے ٹریس ہونے والی کالز ریکارڈنگ گونجنے لگیں۔ تابوت میں یقیناً رفعت ہی تھی۔
جیسے ہی کمانڈوز نے تابوت باہر نکال کر اس کا ڈھکن کھولا تو میرا دل کانوں میں آکر دھڑکنے لگا۔
پولیس میں ہونے کی وجہ سے آئے روز نت نئے مظالم دیکھنے کو ملتے رہتے ہیں، مگر خدا کی پناہ یہ تو ظلم کی انتہا تھی ایک جیتے جاگتے انسان کو دفنا دیا جائے۔
میں رفعت کی تصویر دیکھ چکا تھا، یہ بدنصیب وہی تھی، اس کے چہرے پر موت کی سی زردی پھیلی ہوئی تھی غیر فطری انداز میں کھلی ہوئی آنکھیں اور ہونٹوں پر سفیدی کوئی اور ہی کہانی سنا رہی تھی، میں نے جلدی سے اس کی نبض ٹٹولی مگر وہ ساکت تھی۔
یہ نہیں ہوسکتا جب مسلسل آکسیجن مل رہی تھی تو اسے مرنا نہیں چاہیے تھا میں نے خود کلامی کی۔
سر یہ آکسیجن سلنڈر خالی ہو چکا ہے، لڑکی کی موت کی یہی وجہ بنی۔ ایک کمانڈو نے سلنڈر چیک کرتے ہوئے مسئلہ سلجھا دیا۔
ایس پی صاحب نے رفعت کی لاش پر جھکے ہوئے بار بار اس کی پیشانی چوم رہے تھے، میں نے اپنی زندگی میں ان سے زیادہ بااصول اور نرم دل انسان نہیں دیکھا تھا، اس وقت ان کی حالت دیکھ کر لگ رہا تھا کہ جیسے یہ حادثہ خود ان کی بیٹی کے ساتھ پیش آیا گیا ہو۔
میری بیٹی کو اس منحوس تابوت سے نکال کر باہر گھاس پر لٹاؤ اور ان دونوں درندوں کو یہاں لے کر آؤ۔
ان وحشی درندوں کو عدالت کے حوالے کرنے کا مطلب انہیں مزید موقع دینے کے مترادف ہے انہوں نے گلوگیر مگر چٹانوں جیسے اٹل لہجے میں کہا۔
کمانڈوز ان کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے دونوں کو وہاں لے آئے۔
وہ دونوں ہوش میں آچکے تھے، مگر تشدد زیادہ ہونے کی وجہ سے ہلنے کے قابل نہیں تھے۔
رفعت کی لاش پر نظر پڑتے ہی چوہدری کا چہرہ دھواں دھواں ہوگیا۔
ان دونوں درندوں کو اٹھا کر تابوت میں ٹھونسو اور واپس اسی جگہ دفن کردو، ایس پی صاحب نے آخری حکم دیا، جسے سن کر میرا پورا وجود سنسنا اٹھا۔
پلیز ایسا نہ کرو تمہیں جو چاہیے مجھے بتاؤ میں چند منٹوں میں تمہیں کروڑوں اربوں پتی بنا سکتا ہوں، میں یہ فارم ہاؤس اپنی حویلی زمین سب کچھ دینے کے لیے تیار ہوں مگر خدا کے لیے ایسے نہ کرو۔
میں چوہدری کے لہجے میں پہلی بار بے پناہ خوف محسوس کر رہا تھا وہ ہذیانی انداز میں آفر پر آفر کر رہا تھا اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس وقت پوری دنیا دے کر اپنی زندگی کی بھیک مانگ لیتا۔
قوم کی اس معصوم بیٹی نے بھی زندہ رہنے کے لیے بہت منتیں کی تھیں، مگر تم اس کی جان لیے بغیر نہیں

ٹلے، ایس پی صاحب نے ایک ایک لفظ چبا کر ادا کیا
۔

م م مجھے اندازہ نہیں تھا کہ سلنڈر اتنی جلدی ختم ہو جائے گا۔ اور پھر میں اسے نکالنے ہی والا تھا، مگر نشے کی زیادتی کی وجہ سے مجھ سے سستی ہو گئی، پلیز مجھے معاف کر دیں۔

معاف کرنا یا نہ کرنا رفعت کے ہاتھ میں ہے ، اور وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے تم دونوں اس کے پاس جاؤ اگر وہ تمہیں معاف کر دے تو ضرور واپس آ جانا، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

ایس پی صاحب نے کمانڈوز کو اشارہ کرتے ہوئے چوہدری کو جواب دیا۔

کمانڈوز نے ان دونوں کو الٹا سیدھا تابوت میں ٹھونس کر ڈھکن بند کر دیا۔ اور پھر تابوت کو گڑھے میں دھکیلنے کے بعد سلنڈر اور پائپ بھی گڑھے میں گرا دیے۔

وہ دونوں رو رو کر معافیاں مانگ رہے تھے جب کمانڈوز نے گڑھے میں مٹی ڈالنی شروع کی تو ان کا رونا بے ڈھنگی چیخوں میں بدل گیا، ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ اپنا ذہنی توازن کھو چکے ہوں۔

چند منٹ میں ہی گڑھے میں مٹی ڈال کر اسے ہموار کر دیا گیا، اور قریب موجود گلابوں کی کئی شاخیں کاٹ کر گڑھے والی جگہ لگا دی گئیں۔

وہ جگہ پہلے ہی گلابوں کی کیاری کے درمیان میں تھی، اب اس جگہ نئی قلمیں لگانے سے ساری کیاری ایک جیسی ہو گئی۔

نمبر ون تم گیراج میں موجود لینڈ کروزر کو کسی دوسرے شہر میں چھوڑ آؤ، اور نمبر فور اور فائیو تم یہاں پر ہماری موجودگی کا ہر نشان ختم کرو، ایس پی نے باری باری حکم دیا تو وہ فوراً کام پر لگ گئے۔

نہر پر موجود جال یہاں سے کتنی دور ہے۔ انہوں نے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

سر زیادہ دور نہیں ہے چند فرلانگ کا فاصلہ ہے بس۔

میں نے مستعدی سے جواب دیا۔

میری بیٹی مجھے معاف کر دینا، ابھی تمہیں تھوڑی سی تکلیف اور برداشت کرنا ہو گی۔

نمبر ٹو اور تھری میری بچی کو بہت احترام اور پیار سے لے جا کر نہر کے پانی میں بہا دو۔ امید ہے صبح تک جال پر موجود جال تک پہنچ ہی جائے گی۔

اور جب یہ دریافت ہو جائے تو اس کا پوسٹمارٹم مت ہونے دینا اور جلدی تدفین کروا دینا۔

ہم سب رفعت کی لاش کے ساتھ نہر تک آئے ، اور اسے پانی کے حوالے کر دیا، پھر ایک کمانڈو جا کر فصلوں میں چھپی ہوئی فور بائے فور جیپ لے آیا۔

سر رفعت کو دفنانے کے بعد میرے لیے کیا حکم ہے، میں نے مودبانہ لہجے میں پوچھا۔

تمہیں آج دن میں ہی سپیشل ڈاک سے تمہارا ٹرانسفر لیٹر مل جائے گا، اور ساتھ ہی کچھ چھٹیاں بھی۔

اور کل تک یہاں نیا انسپکٹر بھی تعینات کر دیا جائے گا، ایس پی صاحب نے اچھل کر جیپ کی پسنجر سیٹ سنبھالتے ہوئے کہا۔

اگلے ہی لمحے تیز رفتار جیپ دھول کے بادل میں گم ہو گئی۔

میرے ذہن میں بار بار ٹرانسفر لیٹر کے الفاظ گونج رہے تھے۔ شاید میرے نصیب میں کہیں ایک جگہ ٹک کر ڈیوٹی کرنا لکھا ہی نہیں تھا۔

آج مجھے ایک اور ٹرانسفر لیٹر ملنے والا تھا، میں نے مایوسی سے مشرق کی طرف دیکھا تو صبح کی پھوٹتی ہوئی سحر میں سے ایک اور امید افزا منظر ابھرتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

☆☆......☆☆



کبیروالا سے ارسال کردہ دو عاشقوں کی داستان

بڑی دیر کی مہرباں...

وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو چاہتے تھے مگر

پہلے آپ' پہلے آپ میں گاڑی چھوٹ گئی......

شاہد رفیق سہو

آج یونیورسٹی میں میرا پہلا دن تھا کیونکہ میری کزنز نے مجھے بہت ڈرایا تھا جب ان کو پتہ چلا کہ میں نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا ہے۔

''دیکھنا وہاں تمہارے ساتھ کیا ہوتا ہے وہاں نیو ایڈمیشن لینے والوں کو بہت تنگ کیا جاتا ہے سب کے سامنے اُن کا مذاق بنایا جاتا ہے۔'' پہلی نے آنکھیں نچا نچا کر کہا۔

''دیکھنا تمہارا کیا حال کرتے ہیں اس لیے تو میں نے ایڈمیشن نہیں لیا وہاں میں تو اب پرائیویٹ ہی ایم اے کروں گی بھئی میرا کوئی دماغ خراب ہے جو وہاں جا کے دوسروں کا مذاق بنوں۔'' دوسری نے ایکٹنگ کی بھرپور کوشش کی پر میں ان کی باتوں میں نہیں آئی' میں جانتی تھی یہ سڑتی ہیں مجھ سے جل ککڑیاں نہ ہو تو میں ان کی ساری چالبازیاں سمجھتی ہوں۔

''اچھا یہ سب ہوتا وہاں اچھا کیا تم لوگوں نے بتا دیا میری توبہ بھئی جو اب میں یونیورسٹی جاؤں۔'' وہ دونوں خوش ہوگئی میری ایکٹنگ دیکھ کر میں دل ہی دل میں مسکراتی گھر واپس آ کر کل یونیورسٹی جانے کی تیاری کرنے لگی اور تصور میں ہی ان کے حیران چہرے دیکھ کر مسکرانے لگی۔

''ایکسکیوز کیا آپ مجھے ہسٹری پارٹ ون کی کلاس کہاں ہو رہی ہے بتائیں گی؟'' لڑکی نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔

''ہاں کیوں نہیں یہاں سے سیدھا جا کے پھر لیفٹ سامنے ہی آپ کی کلاس نظر آ جائے گی۔'' پھر وہ لڑکی اپنے دوستوں کی طرف منہ کر کے ہنسنے لگی۔

''آج کا بکرا مل گیا۔'' اس نے اتنی آہستہ آواز میں کہا کہ ہانیہ سن نہیں سکی یہ لاہور کی پنجاب یونیورسٹی تھی ہی اتنی بڑی کہ اسے کسی نہ کسی سے پوچھنا ہی تھا۔ یہاں اتنے بلاکس تھے جانے کون سے بلاکس میں ان کی کلاس ہونی تھی۔ خیر وہ اس کے بتائی ہوئی جگہ پر جب پہنچی تب سامنے ٹائلٹ فار وومن لکھا دیکھ کر اسے اپنی کزنز کی باتیں یاد آ گئیں۔ دل تو کیا اس لڑکی کو کھری کھری سنا کے

آئے پر کیا فائدہ؟ وہ رو دینے کو تھی تبھی اسے کسی نے پکارا۔

''آپ پریشان لگ رہی ہیں۔'' ایک نرم سی آواز اس کے کانوں میں پہنچی اس نے سر اٹھا کر دیکھا ایک لڑکا سامنے کھڑا تھا جو دیکھنے میں شریف سا لگ رہا تھا لبوں پر نرم مہربان سی مسکراہٹ لیے وہ اسے پہلی نظر میں ہی اچھا لگا دل کیا اس انسان سے مدد لینے کو مگر پھر دماغ نے کہا۔ کسی پر بھروسہ نہ کرنا۔

''مس میں آپ سے مخاطب ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے پھر پوچھا۔

''میں پریشان نہیں اور مجھے کسی کی مدد نہیں چاہیے آپ کی تو بالکل نہیں۔'' اتنا کہہ کر دو آنسو اس کے گالوں پر پھسل گئے۔

''ارے کیا بات ہے بیٹا؟'' اس نے بیٹا کہنے پر حیرانی سے دیکھا۔

''کیا ہوا ارحان ......'' وہ ابھی کچھ کہنے ہی والی تھی اتنے میں ایک لڑکی نے آ کر اسے پوچھا۔

''یہ بچی ہمیں پریشان لگی ہم اُن کو پوچھ رہے تھے کہ کیا مسئلہ ہے پر یہ ہمیں بتا ہی نہیں رہی آپ ہماری مدد کریں مہمل اور اُن کو پوچھیے۔''

''پوچھتی ہوں۔'' مہمل نے پیار سے کہا پھر ہانیہ اس سے اپنی کلاس پوچھنے لگی ارحان اور مہمل نے اسے کلاس دکھائی اور اُسے یہ بھی کہا تھا کہ جب بھی کچھ پوچھنا ہو یا کوئی مسئلہ ہو تو ہمیں بتائے وہ ان دونوں سے مل کر بہت خوش تھی اور یہ





سوچ رہی تھی شاید کوئی نیکی ہوگی جو یہ دونوں ملے پر اسے وہ لڑکی یاد آئی تو دل کیا جا کے ایک رکھوں اس کے کان کے نیچے خیر وہ اب اپنی کلاس لینے چلی گئی تھی۔

''ارحان لگتا ہے آپ نے سب کی مدد کرنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔'' مہمل نے ارحان کو کہا۔

''ایسی بات بھی نہیں ہے اب ہم نے دیکھا تھا اس بچی کی آنکھوں میں آنسو اگر آپ نا آتیں تو وہ شاید اپنی پریشانی نہ بتاتی اور یونہی پریشان ہوتی رہتی۔'' ارحان نے فکرمندی سے کہا۔ وہ تھا ہی ایسا ہر کسی کے دل میں آسانی سے جگہ بنا لیتا ہے آدھی سے زیادہ یہاں کی لڑکیاں اس کے پیچھے پاگل تھیں مگر مہمل کی جگہ کوئی نہیں لے سکی۔ ارحان کا چھوٹا سا دل تھا جو کسی کو مصیبت میں نہیں دیکھ سکتا تھا سب وہاں اس کی اسی عادت کی وجہ سے بہت عزت کرتے تھے سب ٹیچرز بھی ارحان کو بہت پسند کرتے تھے سب اسٹوڈنٹس ارحان کو ارحان بھائی کہہ کر بلاتے تھے۔

ہانیہ بھی ارحان بھائی کہنے لگ گئی تھی وہ بہت جلد مہمل اور ارحان کی قریبی دوست بن گئی تھی ارحان کو اپنی چھوٹی بہن کی طرح عزیز ہوگئی تھی یہ وہی ہے بھائی یہ ہانیہ نے سویٹی کو دیکھتے ہی کہا۔

سویٹی کو چاہے وہ یاد نہ ہو پر وہ اسے کبھی نہیں بھول سکتی تھی کون ہے وہ کاکو ارحان ہانیہ کو پیار سے کاکو کہا کرتے تھے۔

''بھائی یہ وہی ہے جس نے مجھے اس دن غلط راستہ بتایا تھا آپ آیئے میرے ساتھ......'' وہ ارحان کا ہاتھ پکڑے اس کے پاس لے گئی سویٹی کی پشت ان کی طرف کر کے بیٹھی تھی۔

''اوہ ارحان آپ کیسے ہیں؟'' وہ ارحان کا ہاتھ پکڑ کر ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی جسے دیکھتے ہی سویٹی نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات سے کہا کیونکہ ارحان کم کم ہی اُن کے گروپ کی طرف آیا کرتا تھا جب سے اسے پتہ چلا تھا کہ سویٹی اسے پسند کرتی ہے یہ حال بس سویٹی کا ہی نہیں یونیورسٹی کی آدھی سے زیادہ لڑکیاں ان پر مرتی تھیں ایک تو وہ ہینڈسم تھے دوسرا اُن کا اخلاق بے حد اچھا تھا۔

''اللہ کا شکر ہے سویٹی آپ کیسی ہیں؟'' ارحان نے جواباً پوچھا۔

''میں پہلے جیسی خوبصورت......'' سویٹی نے کہا۔ وہ ایسی ہی تھی خود کو دنیا کی خوبصورت ترین لڑکی سمجھتی تھی اس کے جواب میں ارحان نے بس مسکرانے پر اکتفا کیا۔

''یہ لڑکی کون ہے ارحان۔'' سویٹی نے ہانیہ کو دیکھتے ہی پوچھا۔

''یہ کاکو آئی مین یہ ہانیہ ہیں اور آپ نے ہماری بہن کو تنگ کیوں کیا تھا جب اِن کا پہلا دن تھا آپ نے اِن کو کلاس بتانے کے بجائے ٹوائلٹ کا راستہ دکھا دیا چلیں سوری کریں میری سسٹر کو......'' سویٹی کو سر سے اشارہ کر کے سوری کرنے کا کہا۔ کیونکہ وہ ہانیہ کو اپنی حقیقی بہن سمجھنے لگ گئے تھے اور سویٹی نے سوری نہیں کرنی تھی اس لیے انہیں اشارہ کرنا پڑا ہانیہ کی گردن فخر سے اکڑ گئی تھی۔

''آئی ایم سوری فرینڈ......'' سویٹی نے دوستی کے لیے آگے ہاتھ بڑھایا ہانیہ نے اپنا ہاتھ آگے نہیں کیا وہ ارحان کی طرف دیکھنے لگ گئی۔

''ہاتھ آگے بڑھایئے کاکو......'' ہانیہ نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ آگے کر دیا ایسے ہی ان سب کی دوستی گہری ہوتی چلی گئی یہ لوگ ہر روز ملتے خوب مستی کرتے اور ساتھ پڑھائی بھی

کرتے ایسے ہی بہت سارے دن گزر گئے پھر ایک دن ہانیہ اور ارحان کینٹین میں بیٹھے سموسے اور پیپسی کی بوتل کے ساتھ ڈھیر ساری باتیں کر رہے تھے۔ ساتھ سموسہ پارٹی بھی انجوائے کر رہے تھے۔

''کاکو ایک بات پوچھیں آپ سے؟'' ارحان نے کچھ سوچتے ہوئے اُسے کہا۔

''بھائی پوچھ کے پوچھیں گے کیا جو بھی بات ہوتی ہے کہہ دیا کریں۔'' ہانیہ نے مسکراتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

''کاکو یہاں سب سے اچھی لڑکی کون سی لگتی ہے؟''

''مہمل آپی۔'' اُس نے سموسے کھاتے ہوئے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔

''سویٹی نہیں......'' ارحان نے نا جانے کیا سوچتے ہوئے سویٹی کا پوچھا۔

''نہیں۔'' اس کا سموسہ کھاتا ہاتھ کچھ لمحوں کے لیے ساکت ہوا پر وہ پھر سنبھل کر نہیں کہہ پائی۔

''وہ ہر وقت ارحان ارحان کرتی رہتی ہے وہ ارحان ارحان کرنا چھوڑ دے اس میں کوئی برائی نہیں ہے بھائی......'' وہ اس کی بات سن کے زور سے قہقہہ مار کر ہنسنے لگ گئے۔

''آپ ہنس رہے ہیں اور جب وہ ایسا کرتی ہے مجھے چڑ ہوتی ہے بھائی آپ شادی کر لیں نہیں تو منگنی کر لیں تا کہ سب لڑکیوں کو پتہ چل جائے کہ اب ارحان اُن کا نہیں ہو سکتا۔'' وہ سموسہ چھوڑ چھاڑ کے اب سیریس ہو کے بیٹھ گئی۔

''کاکو اب ماما بھی کہتی ہیں شادی کر لو......''

''ہاں اگر کاکو بھائی کے لیے کوئی لڑکی ڈھونڈنے گی تو وہ ضرور کریں گے۔'' ارحان نے شرارت سے کہا۔

''سچی بھائی اگر یہ بات ہے تو مہمل آپی آپ کے لیے پرفیکٹ ہیں۔'' ہانیہ نے خوشی سے اپنی موسٹ فیورسٹ آپی کا نام لیا۔

کاکو یونیورسٹی کے علاوہ جہاں کہو گی بھائی وہیں شادی کر لیں گے۔'' ارحان یہ کہہ کر ایکسکیوز کرتا اٹھ کے چلا گیا۔

''بھائی مہمل آپی اچھی ہیں۔'' ہانیہ نے منہ پھلا کر مصنوعی ناراضگی سے کہا۔

''وہ بہت اچھی ہیں کاکو بس یہ کہوں گا وہ بھائی کی کبھی نہیں ہو سکتی ابھی ہم چلتے ہیں۔ ارحان مہمل سے بہت محبت کرتا تھا یہ بات اس نے مہمل سے بہت بار کہنے کی کوشش کی مگر مہمل نے ہمیشہ کوئی ایسی بات کر دینی ہوتی تھی جس سے یہ بات بیچ میں ہی رہ جاتی ارحان کو لگتا وہ جان بوجھ کر ایسا کرتی ہے اس لیے وہ دل کی بات دل میں ہی دبا لیتے مگر ہانیہ ان دونوں کے دلوں کا حال سمجھ گئی تھی۔ اور وہ دل سے چاہتی تھی کہ اُن کی محبت کو کنارہ مل جائے ورنہ یہ سمندر کی لہروں کی طرح دل میں بھٹکتی رہے گی اور دل کا سکون برباد کر دے گی اور ہلچل مچائے رکھے گی۔ پھر سالانہ پیپر شروع ہو گئے سب اپنے ایگزام میں بزی ہو گئے پتہ ہی نہیں چلا دو سال کیسے گزر گئے ہانیہ بہت خوش تھی کیونکہ اسے یہاں سے ارحان اور مہمل جیسے اتنے اچھے دوست ملے سب کے ہی ایگزام بہت اچھے ہوئے یونیورسٹی کے بعد بھی ہانیہ کا ارحان اور مہمل سے موبائل پر رابطہ تھا۔

23 فروری 2017 جب وہ سو کر اٹھی تو عادت کے مطابق سب سے پہلے اس نے اپنے موبائل کو تکیے کے نیچے تلاش کیا کچھ کوشش کے بعد موبائل اس کے ہاتھ لگ ہی گیا اس کے لبوں پر

دھیمی سی مسکان آ گئی اور موبائل آن کر کے سب سے پہلے ہمیشہ کی طرح اس نے ان باکس ہی چیک کیا۔

سب سے پہلا میسج مہمل آپی کا تھا اس نے جلدی سے میسج کو کھولا۔

''مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے فری ہو کر مجھے کال یا میسج کرنا۔'' ہانیہ نے باقی میسیجز دیکھ کر موبائل سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور فریش ہونے باتھ روم میں چلی گئی فریش ہو کر وہ ناشتہ کرنے چلی گئی جب واپس آئی تو اسے مہمل کا خیال آیا اور جلدی سے اُس نے موبائل اٹھایا تاکہ مہمل آپی سے بات کر سکے پر اسکرین پر دو اور میسج آئے ہوئے تھے۔ جب اس نے وہ کھولے تو وہ ارحان بھائی کے میسج تھے۔ وہ مسکرا کر پڑھنے لگی۔ جونہی وہ میسج پڑھتی گئی اس کے لبوں سے مسکراہٹ غائب ہوتی گئی۔

''کاکو کیسی ہیں بھائی ٹھیک نہیں ہے کاکو بھائی کل بہت روئے۔'' یہ ایک میسج تھا جسے اُس نے پڑھا پھر وہ دوسرا میسج دیکھنے لگی۔

''کاکو کو ایک بات بتائیں جسے آپ سب سے زیادہ چاہتے ہیں وہی آپ کو ہر بار اگنور کرے تو کیسا لگے گا وہ آپ کی کسی بات کو اہمیت نہ دے تو کیسا لگے گا۔'' وہ یہ میسج پڑھ کر فوراً جواب دینے لگ گئی اس دوران وہ مہمل کے میسج کو بھول چکی تھی۔

''بھائی کیا ہوا اور آپ کیوں روئے ہیں اور کون ہے وہ جس نے آپ کو اگنور کیا مجھے بتائیں میں اس کو پوچھتی ہوں۔''

''کاکو ہم نہیں جانتے وہ ایسا کیوں کرتی ہیں پر ہم اتنا ضرور جان گئے ہیں کہ اب وہ ہماری کبھی نہیں ہو سکتی ہم کسی کام سے باہر جا رہے ہیں آ کر بات کرتے ہیں اپنا خیال رکھنا اللہ حافظ۔''

''ٹھیک ہے بھائی اللہ حافظ۔'' ارحان سے بات کر کے وہ پریشان ہو گئی تھی وہ اسی بارے میں سوچ رہی تھی جب اسے مہمل کا خیال آیا اور اس نے فوراً اُسے میسج کیا کچھ دیر بعد اس کے موبائل پر بیپ ہوئی وہ ڈریسنگ کے سامنے بیٹھی بال بنا رہی تھی تب اُس نے موبائل اٹھا کر دیکھا تو مہمل کا میسج تھا اس نے جلدی سے اوپن کیا۔

''ہاں مجھے یہ کہنا تھا کہ کل میں نے ارحان کو پوچھا کہ کیا وہ میرے ساتھ پوری لائف گزارنا چاہے گا۔ اس کے لیے آج حیرتوں کا دن تھا اسے لگتا تھا کہ ان دونوں میں کچھ نہ کچھ خاص ہے پر وہ پیار ہوگا اس نے سوچا نہیں تھا تو بھائی آپی کی بات کر رہے تھے اس نے خود سے سوال کیا وہ ہیئر برش سائیڈ پر رکھ کے میسج ٹائپ کرنے لگی۔

''آپی آج بھائی بہت پریشان تھے روئے بھی وہ بولے آپ اُن کو اگنور کرتی ہو؟'' وہ میسج ٹائپ کر کے بال بنا کر اٹھ کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''ارحان نے کہا کہ مہمل دل کرتا ہے ایک تھپڑ لگاؤں آپ کے زور سے اتنی دیر سے کیوں کہا پہلے کیوں نہیں کہا؟''

''تم ہی بتاؤ میں نے لڑکی ہو کر کہا اس نے کیوں نہیں کہا اور میں اس کو اگنور کرتی تھی بہت پہلے اب تو کبھی نہیں کیا۔''

''آپی اب میں بات کرتی ہوں بھائی سے آپ پریشان نہ ہوں۔'' وہ مہمل کو میسج کر کے اب ارحان کو کال کرنے لگی پر کال اٹینڈ نہیں ہوئی اس نے پھر اسے میسج کر دیا تب تک مہمل کا میسج آ چکا تھا۔

''نہیں اب کوئی فائدہ نہیں ارحان کا رشتہ اس کے ماموں کے ہاں پکا ہو گیا ہے میں نے دیر

کر دی اب کچھ نہیں ہو سکتا وہ اپنی امی سے بہت محبت کرتے ہیں وہ کبھی بھی یہ رشتہ توڑ کے ان کا دل نہیں توڑیں گے۔" وہ میسج پڑھ کے فوراً جواب ٹائپ کرنے لگی۔

"آپی اب میں نے ان کو میسج کر دیا فری ہوتے ہی بات کریں۔ کال کی تھی اٹینڈ نہیں ہوئی رہی بات رشتے کی جانتی ہوں وہ کبھی انکار نہیں کریں گے پر میں ان کی امی سے بات کروں گی سب ٹھیک ہو جائے گا آپ پریشان نہ ہوں ہانیہ میسج کر کے جواب کا انتظار کرنے لگی کچھ لمحوں بعد ہی اس کے موبائل کی بیپ ہوئی۔

"ارحان کا میسج آئے تو بتانا۔" ہانیہ اوکے کا میسج کرتی اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی اِدھر ارحان ڈرائیو کے دوران مسلسل مہمل کی بات ہی سوچے جا رہا تھا۔

"ارحان کیا میرے ساتھ پوری زندگی گزارو گے؟" یہ الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے اور اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا رات کا اندھیرا تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا یہ اندھیرا اس کی زندگی سے کالا تو نہیں تھا آنسو اس کے چہرے کو غسل دے رہے تھے وہ جس سے وہ خاموش محبت کرتا تھا وہ اسے ملی بھی کب جب وہ کسی اور کے ساتھ جڑ چکا تھا اس کا وجود چھلنی ہو گیا تھا۔ دل تھا کہ پھٹا جا رہا تھا کہ اچانک ہی اس کی آنکھوں کے سامنے تیز روشنی آئی اور ہارن کی آواز بھی اس نے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیے اور پھر ایک زوردار دھماکہ ہوا اس کے حواس مجتمع ہونے میں کچھ لمحے لگے اس کو جو پہلا احساس ہوا وہ درد کا تھا اس کے پورے جسم میں شدید قسم کا درد ہو رہا تھا اس نے دیکھنے کے لیے اپنے بازوؤں کو حرکت دی مگر اس کا بازو کسی وزن یا چیز کے نیچے تھا اس کا پورا وجود ہل نہیں رہا تھا بس اس کی آنکھیں حرکت کر رہی تھیں اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی ماں کا چہرہ آ رہا تھا وہ امی کہہ کر رونے لگا پھر اسے مہمل کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا وہ اسے دیکھ کر مسکرا دیا کچھ دیر بعد اسے لوگوں کی ملی جلی آوازیں سنائی دیں یہ زندہ ہے یہ کوئی چیخ رہا تھا پھر اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

کچھ دن یونہی گزر گئے ارحان کا کچھ پتا نہیں تھا۔ مہمل بار بار ہانیہ کو کبھی کال کبھی میسج کر کے ارحان کا پوچھتی مگر دونوں ہی کو ارحان کا نہ میسج نا کال آئی۔ پھر دونوں نے سویٹی کو پوچھا پر سویٹی بھی اس کی غیر موجودگی سے لاعلم تھی مہمل ہر روز اس کو میسج کرتی مگر کوئی جواب نہیں آتا ارحان ایسا نہیں تھا وہ ضرور کسی مشکل میں ہو گا جو جواب نہیں دیتا اسی دوران مہمل کا رشتہ بھی پکا ہو گیا پر ارحان کا کچھ پتا نہ تھا 14 مارچ کو مہمل جب اپنی منگنی کی شاپنگ سے واپس آئی تو اس نے گھر آ کر اپنا موبائل دیکھا تو اس پر ارحان کا میسج دیکھ کر حیران رہ گئی اس نے جلدی سے میسج پڑھنا شروع کیا۔

"مہمل کیسی ہو 23 فروری کو میرا روڈ ایکسیڈنٹ ہوا تھا میرے سیدھے بازو اور بیک بون اور گردن پر چوٹ آئی بازو کا آپریشن کامیاب ہو گیا پر بیک بون اور گردن کا آج ہے دعا کرنا آپریشن ٹھیک ہو۔" میسج پڑھتے ہوئے مہمل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اس نے فوراً کال کی پر نمبر آف تھا اس نے ہانیہ کو بھی بتایا اب دونوں اس کی زندگی کے لیے دعا گو ہیں مہمل اور ارحان دونوں اب بھی ایک نہیں ہو سکتے کیونکہ دونوں کی بات پکی ہو چکی ہے انسان قسمت کے ہاتھوں کتنا مجبور ہے کہ وہ اس سے لڑ نہیں سکتا۔

☆☆......☆☆

میاں چنوں سے ارسال کردہ تحریر

نازو کہاں چلی گئی؟

''حماد صاحب بات یہ ہے کہ جب میں نے آپ کو پہلی دفعہ دیکھا تھا جب آپ نوجوانوں کے ساتھ راشن تقسیم کروا رہے تھے۔ تو اس وقت نجانے مجھے کیا ہوا کہ میرا بار بار آپکی طرف دیکھنے کو دل کرنے لگا۔ میں نے اپنے آپ کو بہت سمجھایا کہ اب آپکی طرف نہیں دیکھوں گی۔ لیکن اس کے بعد......

مقصود احمد بلوچ

یہ قصہ غالباً ۱۹۹۲ کا ہے۔ اور دادا جی نے مجھے اتنی دفعہ بتایا ہے کہ مجھے اب تک پوری جزئیات کے ساتھ یاد ہے۔ دادا جان نے بتایا تھا کہ اس وقت شدید سیلاب نے مختلف علاقوں میں تباہی مچادی تھی۔ پورے کے پورے گاؤں سیلاب کی زد میں آگئے تھے۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ ویسے بھی اس ملک پاکستان پر جب بھی کوئی مصیبت آتی ہے تو افواجِ پاکستان ہی سب سے آگے ہوتی ہے۔ دہشت گردی ہو، یا پھر کوئی اندرونی بیرونی خطرات ہوں، افواج پاکستان ہی سینہ سپر ہوتی ہے۔

کیپٹن حماد کو آرڈر ملا کہ وہ اپنے یونٹ کے جوان لے کر سیلاب زدہ علاقوں میں جائیں اور ان کی مدد کریں۔ کیپٹن حماد نے اپنے جوانوں کو کہا اپنی ضرورت کا سامان اور سیلاب زدگان کے لیے راشن لے کر تیار ہو جائیں کیونکہ انہیں اگلے دن وہاں پہنچنا ہے۔ اگلے دن وہ سب مطلوبہ گاؤں پہنچ گئے۔ وہاں انہوں نے ایک اس کول میں قیام کیا۔ اور سیلاب زدہ علاقوں میں جا کر لوگوں کی مدد کرنے لگے۔ راشن، کپڑے، پینے کا صاف پانی، اودیات اور رہنے کے لیے جگہ کا انتظام۔

۱۹۹۲ میں جب سیلاب آیا تھا، تو اس وقت دیگر کے ممالک نے بھی پاکستان کے سیلاب زدگان کے لیے بہت سامان بھیجا تھا۔ اس کے علاوہ پاکستان کے مختلف علاقوں سے بھی کافی امدادی سامان دیا گیا۔ امدادی اشیاء میں جو بھی سامان آتا وہ متعلقہ یونٹ اپنی زیر نگرانی وہاں تقسیم کروا دیتا۔ اسی طرح ایک روز ایک ٹرک تقسیم کیا جا رہا تھا۔ معمول کے مطابق کیپٹن حماد اپنے نوجوانوں کے ساتھ امدادی اشیا بانٹ رہے تھے۔ بوڑھے، بچے، جوان، لڑکیاں، بوڑھی عورتیں سب لائن میں لگے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ اور باری آنے پر سامان لے کر خوشی خوشی دعائیں دیتے ہوئے جا رہے تھے۔ اس دوران کیپٹن حماد نے محسوس کیا کہ وہ کسی کی نظروں کے حصار میں ہے۔ اس نے ڈھونڈنا چاہا تو ایک لڑکی بار بار حماد کی طرف دیکھتی۔ لیکن حماد نے یہ سوچ کر اس لڑکی کی طرف توجہ نہ دی کہ ہوسکتا ہے

اس لڑکی کو مجھ میں اپنے بھائی کی شبہات نظر آ رہی ہوں یا اسے فوجی پسند ہوں اس لیے دیکھ رہی ہوگی۔ حماد یہ سوچ کر اپنے جوانوں کے ساتھ مصروف رہا۔

مگر یہ معمول بن گیا۔ وہ لوگ جہاں بھی جاتے، وہ لڑکی وہاں موجود ہوتی اور چوری چوری حماد کو دیکھتی تھی۔ اور سب کے جانے کے بعد آخر میں آ کر راشن لیتی۔ اس بات کو ایک ہفتہ گزر گیا تو حماد نے فیصلہ کیا کہ وہ موقع دیکھ کر اس لڑکی سے بات کرے گا اور اس سے یوں دیکھنے کی وجہ پوچھے گا۔ چند دن بعد حماد کو موقع مل گیا۔ وہ لڑکی اس دن بھی دور سے کیپٹن حماد کو دیکھ رہی تھی، سب راشن لینے میں مصروف تھے، کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا اس لیے حماد کو یہ موقع صحیح لگا اور وہ دبے قدموں اس لڑکی کے پاس پہنچ گیا۔

''کیا بات ہے؟ آپ راشن نہیں لے رہی؟''

''جی جی۔ میں وہ ۔۔ ابھی لے لیتی ہوں۔ تھوڑا رش ہے اس لیے رک گئی۔'' وہ حماد کو دیکھ کر یقیناً گھبرا گئی تھی۔

''تم مجھے یوں چھپ چھپ کر کیوں دیکھتی ہو؟ کیا وجہ ہے؟'' حماد نے بنا گھمائے سیدھا سوال کیا۔

اس لڑکی نے سر اٹھا کر دیکھا اور کوئی بھی جواب دیے بنا چلی گئی۔

حماد اس کے اس ردعمل پر حیران ہوا اور نا چاہتے ہوئے بھی اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ چند دن وہ لڑکی اسے نظر نہ آئی۔ کافی دن گزر گئے، سیلاب کا پانی کم ہو گیا تھا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ پھر بھی چند لوگ منتظر تھے اپنے گھر کیلیے کیونکہ ان کے گھر کے آس پاس ابھی بھی کافی پانی کھڑا تھا۔

حماد اور اس کے جوانوں کو آرڈر آ گیا کہ وہ اگلے ہفتے اپنے یونٹ واپس لوٹ جائیں۔ حماد کے دل



میں اس لڑکی کو دوبارہ دیکھنے کی خواہش رہ گئی۔
اس دن وہ لوگ شام میں اپنے کیمپ لوٹے۔
حماد تھکا ہونے کے باعث لیٹ گیا۔ کچھ ٹائم ہی گزرا تھا کہ ڈیوٹی پر کھڑا ایک جوان حماد کے پاس آیا۔
''ہاں جوان خیریت تو ہے؟''
''وہ سر گیٹ پر ایک بزرگ آدمی آیا ہے۔ اور بہت پریشان ہے۔''
''کیوں؟''
''اس کی بیٹی بیمار ہے اور ڈاکٹر تک لے جانے کی کوئی سہولت نہیں ہے۔''
''چلو میں چل کر دیکھتا ہوں۔''
باہر جاتے ہی حماد ان بزرگ سے احترام سے ملا اور بولا۔
''بابا جی آپ پریشان نہ ہوں۔ آپکی بیٹی بلکل ٹھیک ہو جائے گی۔ میں گاڑی لے کر آپکے ساتھ چلتا ہوں۔ آپ کی بیٹی کو کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس شہر لے چلتے ہیں۔''
اگلے دس منٹ بعد حماد اس بزرگ کے ساتھ ان کے کیمپ میں موجود تھا جہاں سیلاب زدگان کے لوگ تھے۔
''سر یہ ہے میری بیٹی۔ پچھلے سات دن سے بسترِ مرگ پر پڑی ہے، نہ کھاتی ہے نہ کچھ بولتی......'' وہ بابا جی بول رہے تھے۔ مگر حماد کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ بت بنا سامنے لیٹی لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ جس لڑکی کو وہ دیکھ رہا تھا وہ وہی تھی جسکی نظریں اس کا تعاقب کرتی تھی۔ اس نے لڑکی نے حماد کو دیکھا تو بیماری کے باوجود بھی اٹھ کر بیٹھ گئی، اور دوپٹہ سر پر ڈال لیا۔ بخار کی وجہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھی۔
''بابا جی آپ انہیں اٹھا کر گاڑی میں لے آئیں۔''
پندرہ سے بیس منٹ کی مسافت کے بعد وہ شہر میں ایک ڈاکٹر کے پاس پہنچ گئے۔ حماد کی ہدایت کے مطابق ڈاکٹر نے اس لڑکی کا اچھی طرح چیک اپ کیا۔ اور ساتھ ہی ٹیسٹ وغیرہ لکھ کر دیے اور کہا۔
''اس لڑکی کو ٹائی فائیڈ ہو گیا ہے۔ اس کو کچھ دن یہیں ایڈمٹ کرنا پڑے گا۔''
''ٹھیک ہے آپ انہیں ایڈمٹ کر لیں۔'' حماد نے ڈاکٹر سے کہا۔
ڈاکٹر نے ایک پرچی پر دوائیں لکھ کر بابا جی کو دے دیں۔ حماد اور وہ لڑکی وہاں اکیلے رہ گئے۔
حماد نے غور سے اُسے دیکھا، وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ بخار کی [illegible]۔ اس کے لال گال اس کے حسن میں اضافہ کر رہے تھے۔
''آپ کا نام کیا ہے؟''
''نازو نام ہے۔''
''نازو آپ کیوں دیکھتی تھی مجھے؟ اور آپ بیمار تھی اور مجھے بتایا کیوں نہیں؟''
''میں آپ کو سب بتاؤں گی مگر میری ایک شرط ہے۔''
''کیا؟''
''کہ آپ مجھ سے ناراض نہیں ہوں گے۔ مجھے فوجیوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ وہ پکڑ کر لے جاتے ہیں۔''
حماد ہنسا۔ ''آپ کو کس نے کہا کہ فوجی پکڑ کر لے جاتے ہیں؟ ہم لوگ تو آپ لوگوں کی مدد کے لیے آئے ہیں۔''
''آپکا نام کیا ہے فوجی صاحب۔''
''ارے آپکو اب تک میرا نام نہیں پتہ۔ یہ تو لکھا ہوا میری وردی پر، کیپٹن حماد۔''
''مجھے پڑھنا نہیں آتا۔'' وہ سر جھکا کر بولی۔
''چلو کوئی بات نہیں۔'' وہ مسکرایا۔
اتنے میں نازو کے بابا دوائیں لے کر آگئے۔
''بابا جی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپکی بیٹی جلد ٹھیک ہو جائے گی۔ میں اب چلتا ہوں انشاء اللہ میں کل آپ لوگوں کے پاس آؤں گا۔''
''ٹھیک ہے بیٹا آپ جاؤ آرام کرو آپکا بہت شکریہ۔''

حماد نازہ کی طرف الوداعی نظروں سے دیکھ کر چلا گیا۔اور گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔آدھی رات تو ویسے ہی گزر چکی تھی، باقی آدھی رات اس نے نازو کے خیالوں میں گزاری۔وہ یہی سوچ رہا تھا کہ پتہ نہیں نازو کے دل میں کیا ہے۔بس ایسی ہی سوچوں میں رات کا آخری پہر بھی بیت گیا۔صبح حسب معمول وہ ڈیوٹی پہنچ گیا۔وہاں بھی نازو کے خیالوں نے چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ڈیوٹی سے فارغ ہوتے ہی وہ شام میں سیدھا نازو کے پاس پہنچ گیا۔نازو اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔

''کیا حال ہے آپکا؟اب طبیعت کیسی ہے؟''

''میں ٹھیک ہوں۔اور آپکو دیکھ کر تو بلکل ہی ٹھیک ہوگئی ہوں۔''

''یہ تو اچھی بات ہے، آپکے بابا کہاں ہیں؟نظر نہیں آرہے۔''

''بابا نماز پڑھنے گئے۔''

''اچھا نازو میری بات غور سے سنیں۔ہمیں اسی ہفتے واپس جانا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آج آپ مجھے اپنے دل کی بات بتادو۔تاکہ میرے دل میں یہ ارمان نہ رہ جائے کہ میں آپکے دل کی بات نہیں سن سکا۔''

حماد کی یہ بات سن کر نازو کچھ لمحے خاموش رہی۔اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اپنے دل کی کہاں سے شروع کرے۔آخر خاموشی کو توڑتے ہوئے وہ بولی۔

''حماد صاحب بات یہ ہے کہ جب میں نے آپ کو پہلی دفعہ دیکھا تھا جب آپ نوجوانوں کے ساتھ راشن تقسیم کروا رہے تھے۔تو اس وقت نجانے مجھے کیا ہوا کہ میرا بار بار آپکی طرف دیکھنے کو دل کرنے لگا۔میں نے اپنے آپ کو بہت سمجھایا کہ اب آپکی طرف نہیں دیکھوں گی۔لیکن اس کے بعد میری حالت ایسی ہوگئی کہ اگر آپ کی طرف نہ دیکھوں تو دل ڈوب سا جاتا۔اس دن جب آپ مجھ سے وجہ پوچھی تھی تو میں سب بتانا چاہتی تھی مگر مجھے ہمت نہ ہوئی۔بات دراصل یہ ہے کہ آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔میرا دل کرتا ہے کہ اپنی پوری زندگی آپکے نام کردوں۔لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ ایک پردیسی ہیں، ایک نہ ایک دن یہاں سے چلے جائیں گے۔لیکن اس کے باوجود بھی میں خود کو آپکے بارے میں سوچنے سے روک نہیں پائی اور میری ان ہی سوچوں نے مجھے بیمار کردیا۔''

حماد نے بہت غور سے نازو کی بات سنی۔اس کا دل ڈوب سا گیا کہ یہ لڑکی کتنی پاگل ہے کہ مجھ جیسی پردیسی سے محبت کر بیٹھی ہے۔پردیسی تو ایک پنچھی کی مانند ہوتا ہے اور پھر اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔بہر کیف اس نے نازو سے بس اتنا کہا۔

''نازو آپکے دل کی بات سن کر آج مجھے بہت خوشی ہوئی۔اب میرے دل میں بھی کوئی بھی ارمان نہیں ہے۔بس آپ اب جلدی ٹھیک ہوجائیں۔''

''جی آپکی دعاؤں سے میں اب میں ٹھیک ہوں۔آپ ڈاکٹر صاحب سے میری چھٹی کی بات کریں۔میں اب یہاں رہنا نہیں چاہتی۔''

''میں نے ڈاکٹر سے بات کرلی ہے۔آپ کو ایک دن یہیں ٹھہرنا ہے۔کل آپکو چھٹی مل جائے گی تو ساتھ واپس جائیں گے۔میں اب چلتا ہوں اگر آپ کی اجازت ہو تو۔۔''

''جی سر آپ جاسکتے ہیں۔''نازو شرما کر بولی۔

''او کے اللہ نگہبان!''وہ کہہ کر آگیا۔ویسے اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا نازو کے پاس سے جانے کا اور سچ یہی تھا کہ وہ بھی نازو کے سامنے اپنا دل ہار چکا تھا۔لیکن اس نے اظہار نہیں کیا تھا۔

اگلے دن وہ ڈیوٹی کے بعد نازو کے پاس چلا آیا۔نازو اب بلکل ٹھیک ہوگئی تھی۔حماد کا دل اداس سا تھا اور یہ اس کے چہرے پر بھی واضح تھا۔

”کیا بات ہے سر؟ آپ پریشان لگ رہے ہیں۔“ نازو نے پوچھا۔

”ہم لوگ یہاں سے اب دو دن میں چلے جائیں۔ اور سچ یہ ہے کہ آپ بھی میرے دل میں بس گئی ہو، مجھے بھی آپ سے محبت ہوگئی تھی۔ کیونکہ آپ بہت معصوم اور سادہ لڑکی ہیں۔ آپکی یہ معصومیت مجھے بہت اچھی لگی ہے۔ پتہ نہیں زندگی میں دوبارہ ملن ہو یا نہ ہو۔ لیکن آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ آپ مجھے کبھی نہیں بھولو گی۔“ کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اسے نازو کی جدائی کا بہت دکھ تھا۔

”میری طرف سے یہ چھوٹا سا تحفہ ہے۔“ اس نے کہہ کر ایک نازک سا لاکٹ نکالا۔ ”اسے میری نشانی سمجھ کر رکھ لیں۔“

حماد کی باتیں سن کر نازو کی بھی آنکھیں بھر آئی۔ اس کے آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”نازو آپ اپنا دل چھوٹا کریں۔ اگر زندگی رہی تو ہم ضرور ملیں گے۔“ اس نے نازو کو تسلی دی۔

حماد نازو اور اس کے بابا کو گھر چھوڑ آیا۔ اگلے دن وہ اپنے جوانوں کو لے کر واپس چلا گیا۔ اور یوں دو محبت کرنے والے جدا ہوگئے۔ جدائی کی آگ دونوں طرف جلنے لگی۔ حماد کو کبھی نازو کی روئی روئی آنکھیں یاد آتی تو کبھی شرماتی ہوئی نظریں۔

اس کے جانے کے بعد نازو بھی اداس رہنے لگی۔ مگر ان دنوں ان کے پاس رابطہ کو کائی طریقہ نہ تھا۔ موبائل کا دور نہیں تھا۔ اور خط لکھنا نازو کے بس کی بات نہیں تھی کیونکہ وہ پڑھی لکھی نہیں تھی۔ بے رحم وقت پر لگا کر اڑنے لگا۔ اور حماد اور نازو کو جدا ہوئے پانچ سال بیت گئے۔ لیکن ان پانچ سالوں میں نازو حماد کی محبت کو نہ بھلا سکی۔ اور اتنا عرصہ گزارنے کے باوجود بھی نازو کسی سے بھی حماد کا ذکر نہ کر سکی۔ اس وقت تک نازو کے بابا بھی اپنی زندگی کے آخری حصے میں پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے بہت دفعہ نازو سے شادی کے لیے کہا مگر اس نے ہر بار انکار کر دیا۔

حماد کو شروع میں تو نازو کو بہت یاد رکھتا تھا مگر آہستہ آہستہ وہ اسے بھول گیا۔ وہ کیپٹن سے میجر بن گیا۔، میجر بننے کے بعد اس نے شادی کر لی۔ اور اپنی زندگی میں مصروف ہوگیا۔

کچھ عرصہ گزرنے کے بعد نازو کے بابا کا انتقال ہوگیا۔ باپ کی موت کا نازو کو بہت دکھ تھا۔ کیونکہ اس دنیا میں اس کے بابا ہی اس کا واحد سہارا تھے۔ نازو اب بلکل اکیلی رہ گئی تھی۔ نہ اسے کھانے کا ہوش تھا نہ پینے کا۔ سارا دن چارپائی پر بیٹھی رہتی۔ کوئی کھانے کو کچھ دے دیتا تو کھا لیتی ورنہ اسے کھانے کے ضرورت بھی نہیں محسوس ہوتی تھی۔ اس کے پاس اب کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اس کے دکھوں کا مداوا کرتا۔ حماد اور بابا کی یادوں کی وجہ سے آہستہ آہستہ وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی۔ اسے اپنا کوئی ہوش نہ رہا، وہ بکھرے بالوں اور پھٹے کپڑوں کے ساتھ ہر جگہ گھومتی رہتی تھی۔ جس جگہ سے بھی گزرتی وہاں کے بچے اسے پاگل پاگل کہہ کر پکارتے تھے۔ اور وہ ان کے پیچھے پتھر لے کر دوڑتی، یا پھر کبھی بیٹھ کر اس لاکٹ کو دیکھتی رہتی۔ وقت گزرتا رہا اور اس کے بالوں میں چاندی کی جھلک نمایاں ہوتی گئی۔

سترہ سال بعد ۲۰۰۹ میں دوبارہ سیلاب نے ہر طرف تباہی پھیلا دی۔ اس سترہ سال کے عرصے میں حماد کیپٹن سے میجر بن چکا تھا، پھر اس کے بعد ترقی کرتے ہوئے وہ ایک کرنل کے فرائض سرانجام دنے لگا۔ سیلاب آنے کی صورت میں فوج پھر سے حرکت میں آ گئی۔ اور فوراً ہی سیلاب شدہ علاقوں

میں فوج کو تعینات کر دیا گیا۔ کرنل ہونے کی حیثیت سے وہ ایک یونٹ کو کمانڈ کر رہا تھا۔ ایک دفعہ معمول کے مطابق وہ اپنے جوانوں سے ملنے جا رہا تھا کہ اس کا گزر ایک گاؤں سے ہوا۔ ابھی اس کی گاڑی اس راستے پر نکلی ہی تھی کہ اس راستے میں ایک عورت زمین پر بیٹھی ہوئی نظر آئی سارے بچے اس کے گرد جما ہو کر اسے پاگل پاگل پکار رہے تھے اور اسے پتھر مار رہے تھے۔ جب حماد نے یہ سب دیکھا تو اس نے ڈرائیور سے گاڑی رکوادی۔

اس کے گاڑی سے اترنے پر سارے بچے بھاگ گئے۔ وہ اس کے پاس آیا اور پوچھا کہ وہ کون ہے اور یہ بچے اس پریشان کیوں کر رہے ہیں مگر وہ جواب میں خاموش رہی۔ اتنے میں وہاں گاؤں کا ایک آدمی آگیا اور اس نے حماد کو بتایا کہ وہ ایک پاگل عورت ہے۔ سارا دن گاؤں اور سڑکوں پر گھومتی رہتی ہے، اپنے باپ کی موت کے بعد یہ اس دنیا میں اکیلی رہ گئی ہے اور اس حال میں پہنچ گئی ہے۔ اس کے آدمی کے بتانے پر حماد نے بغور اس لڑکی کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ اس کے گلے میں لاکٹ ہے۔ حماد کو ہو لاکٹ جانا پہچانا سا لگا۔

"یہ تمہارے گلے میں کیا ہے۔ دکھاؤ؟" اس نے عورت سے لاکٹ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"نہیں میں یہ نہیں دوں گی کسی کو۔" وہ بدکی۔

مگر کچھ لمحے بعد ہی اس نے لاکٹ اتار کر دے دیا۔ حماد نے لاکٹ کو غور سے دیکھا اور فوراً اس کے دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا۔ اسے یاد آگیا کہ یہ وہی لاکٹ تھا جو اس نے اپنی محبت کے نام کیا تھا۔ اس کی رنگت پیلی پڑ گئی۔ اسے سب سمجھ آگیا تھا۔ اس نے پہلی فرصت میں اس عورت کو اپنے ساتھ بٹھایا اور ہسپتال لے آیا۔ ڈاکٹر نے نازو کے چیک اپ کے بعد حماد کو بتایا کہ یہ در یہ صدموں کی وجہ سے وہ اس حال تک پہنچ گئی ہے۔ اگر اسے محبت، توجہ اور اپنے پن کا احساس ملے تو وہ ٹھیک ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر کی بات پر حماد کو پشیمانی نے گھیر لیا، وہ جانتا تھا کہ نازو کو اس حال تک پہنچانے کا ذمہ دار وہی ہے۔ مگر اس نے تہیہ کر لیا کہ اب ہر صورت نازو کو صحت یابی اور زندگی کی طرف واپس لے آئے گا۔ اس کے بعد حماد نے نازو کا بہت خیال رکھا۔ اور ہر وقت اس کی دلجوئی میں لگا رہتا۔ چند مہینوں بعد اس کی محنت رنگ لے آئی اور نازو بہت بہتر حال میں ہو گئی، اس نے حماد کو بھی پہچان لیا اور آہستہ آہستہ اپنی زندگی میں گزرے واقعات بھی یاد آنے لگا۔ جس دن اس سب یاد آگیا۔ اسی دن حماد نے نازو کو شادی کو پرپوز کر دیا۔ اور وعدہ کیا کہ اس نے زندگی میں بہت دکھ برداشت کیے ہیں، میں اب تمہاری زندگی میں کوئی دکھ نہیں آنے دوں گا۔ نازو تھوڑے سے پس و پیش کے بعد مان گئی کیونکہ اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا، وہ اس دنیا میں اکیلی تھی۔ حماد کے سہارے کی اسے ضرورت تھی۔ اور سب سے اہم بات وہ حماد سے بے پناہ عشق کرتی تھی۔

حماد اسے شادی کر کے اپنے ساتھ گھر لے آیا۔ وہاں اس نے نازو کو اپنی پہلی بیوی صائمہ سے ملوایا۔ اور اسے نازو سے متعلق ایک ایک بات سچ بتادی۔ صائمہ تو بظاہر بہت خوش اخلاقی اور خلوص سے نازو سے پیش آتی رہی مگر اندر ہی اندر غصہ اور نفرت سے برا حال تھا۔ مگر فی الحال وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی، اس سب برداشت کرنا پڑا۔

حماد نے نازو کو پہلی منزل پر شفٹ کر دیا۔ اور خود بھی وہیں شفٹ ہو گیا۔ صائمہ نے اس بات پر احتجاج کیا، بچوں کی حساسیت کا بہانہ کیا، اپنے اکیلے پن کا غم سنایا مگر حماد کے سر پر بس نازو کی

دیوانگی کا بھوت سوار تھا۔ اس نے صائمہ کے کسی بہانے کا خاطر میں نہیں لایا۔ اور نازو کے ساتھ رہنے لگا۔ صائمہ کے دل میں نفرت اور بڑھ گئی۔
چند مہینوں کے بعد حماد کی سلیکشن آؤٹ کنٹری سواڈن میں ہوگئی۔ اس کی واپسی ایک سال متوقع تھی۔ وہ سب کو تسلی دے کر اور سمجھا کر چلا گیا۔ حماد کے جاتے ہی صائمہ کو اپنی نفرت اور جلن نکالنے کا موقع مل گیا۔ وہ بہانے بہانے سے نازو کو زچ کرتی، کبھی باتھ روم کے باہر سے دروازہ بند کردیتی اور گھنٹوں نہ کھولتی۔ کبھی نازو کے فلور کی بجلی بند کردیتی۔ اور مختلف آوازوں سے اسے ڈراتی رہتی۔ اور بعد میں یہ کہہ کر اپنی جان چھڑالیتی کہ میں نے تو بس مذاق کیا تھا۔ کبھی کبھی طعنے دے کر اسے بدکردار اور پاگل ہونے کا احساس دلاتی۔ وہ نازو کو حماد سے بات کرنے کا موقع بھی نہ دیتی، اور خود حماد سے نازو کی شکایتیں لگاتی، حماد تو پہلے پہل دھیان نہ دیتا مگر آہستہ آہستہ دوری کے باعث اس کے دل میں نازو کے لیے بدگمانی آنے لگی، اب اگر اس کی نازو سے کبھی فون پر بات ہوتی تو وہ اس پر غصہ کرتا یا ناراض رہتا۔ آہستہ آہستہ نازو کو ذہنی حالت خراب رہنے لگی۔ وہ یہ سب نہیں برداشت کر پا رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ حماد کے جانے کا یہ ایک سال اسے سو سال کے برابر کیوں محسوس ہونے لگا ہے۔ صائمہ اس ہر وقت یہی جتاتی رہتی کہ اسے یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ اس کے آنے سے پہلے سب ٹھیک تھا، حماد کی زندگی، اس کی بیوی اور بچے۔ اگر سب خراب ہوا تو اس کی وجہ وہ تھی۔ ورنہ حماد ایک مکمل زندگی گزار رہا تھا۔ اسے نازو کی ضرورت نہیں تھی۔ اور اب اگر وہ چلی جائے تو شاید اسے فرق بھی نہ پڑے، وہ چند دن بعد بھول جائے گا کہ کوئی نازو بھی تھی۔ جیسے وہ پہلے بھول گیا تھا۔ صائمہ کی انہی باتوں کی وجہ سے نازو نے فیصلہ کرلیا اور وہ فیصلہ تھا یہ گھر چھوڑنے کا۔ اپنے اسی ارادے کے تحت ایک رات وہ اپنا سامان سمیٹ کر اس گھر سے چلی گئی۔
صائمہ کو اگلے دن نازو کا جانے کا پتہ چلا تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اس نے جو چاہا وہ اسے مل گیا۔
حماد نے فون کر کے جب نازو سے بات کرنے کا کہا تو صائمہ نے لاپرواہی سے بتا دیا کہ وہ اب نہیں ہے اور گھر چھوڑ جا چکی ہے۔ حماد کو یہ بات سن کر دھچکا سا لگا۔ وہ یقین نہیں کرسکتا تھا کہ نازو ایسا کرسکتی ہے۔ اس نے صائمہ سے وجہ پوچھی تو وہ لاعلمی کا اظہار کرتی رہی۔ حماد سب چھوڑ کر واپس پاکستان آیا۔ اس کے دل میں آئی کہ صائمہ کٹہرے میں کھڑا کر ہر چیز کی وجہ پوچھے۔ اس کا دل کہتا تھا کہ اس سب کے پیچھے کہیں نہ کہیں صائمہ ہی کا ہاتھ ہے۔ مگر چونکہ صائمہ نے کبھی [illegible] کے سامنے نازو کے ساتھ برابر تاؤ نہیں کیا اس لیے وہ اس پر کوئی بھی الزام لگانے سے قاصر تھا۔
اس نازو کی تلاش کے لیے بہت کوشش کیں، ہر جگہ کھنگال لیا۔ اپنے جوانوں کے ساتھ اسے مختلف شہروں میں ڈھونڈا مگر وہ کہیں نہ ملی۔ سمجھ نہیں آتا تھا کہ اسے زمین نگل گئی یا آسمان۔ اس کی ہر کوشش بے کار جا رہی تھی۔ اور صائمہ کی بھی ہر کوشش بے کار گئی تھی۔ اس نے حماد کو پانے کے لیے یہ سب کیا تھا مگر حماد تو کبھی اس کا تھا ہی نہیں، وہ تو صرف نازو کا تھا اور اس کا ہی رہا۔
حماد سارا دن اپنے یونٹ میں مصروف رہتا اور باقی کا بچا کچھا دن نازو کا ڈھونڈنے یا اس کی یادوں میں گزار دیتا۔ کوئی نہیں جان سکا کہ وہ کہاں گئی۔ اور میں بھی نہیں جان سکا کہ میرے دادا جان کرنل حماد کی پہلی محبت میری دادی نازو کہاں چلی گئی۔ کیا وہ ابھی اس ہی دنیا کے کسی کونے میں موجود ہے یا میرے داد کی طرح منوں مٹی تلے سو چکی ہے۔

☆☆......☆☆

ہیمانی بیوٹی کریم

ہیمانی گروپ 1947 میں قائم ہوا اور اس کے دفاتر پاکستان UAE اور USA میں موجود ہیں ابھی یہ اپنے مصنوعات دنیا دنیا کے 60 ملکوں میں برآمد کر رہے ہیں۔

ہیمانی گروپ آف کمپنی کو حکومت پاکستان کی طرف سے مختلف ایوارڈز جیسے برانڈ آف دی ایئر ایوارڈ اور ISO 14001 اور ISO 9001' 1800 سرٹیفکیٹ حاصل ہے۔

ہیمانی گروپ نے خواتین کے بڑھتے ہوئے رجحان کو دیکھ کر جس میں وہ چاہتی تھیں کہ ان کے لیے کوئی ایسی کریم ہو جو نہ صرف جلد کو خراب ہونے سے بچائے بلکہ رنگ کو گورا اور چہرے کو پرکشش بنادے۔

ہیمانی بیوٹی کریم اپنی طرز کی پہلی بیوٹی کریم ہے جس میں بہت سی خوبیاں موجود ہیں جو رنگ گورا کرتی ہے' آنکھوں سے حلقے' جھریاں ختم کرتی ہے اور چہرے سے کیل مہاسے دور کرتی ہے۔ ڈیڑھ سال کی کڑی محنت سے ہمارے ماہرین نے آپ کے لیے ہیمانی بیوٹی کریم بنائی ہے جو آپ کی جلد کو قدرتی دلکشی بخشتی ہے۔ ہم دنیا بھر سے بہترین کوالٹی کے اجزا لے کر اس کریم کو بناتے ہیں تاکہ اس کی بہترین کوالٹی برقرار رہے اس میں موجود اجزاء مثلاً پرکلی پیئر آئل' شیابٹر' آرگن آئل آپ کے چہرے کو صرف سات دن میں گورا اور پرکشش بناتی ہے۔ ہیمانی بیوٹی کریم سو فیصد قدرتی اجزا سے بنی ہے جو ہر قسم کے مضر اثرات سے پاک ہے۔

ہیمانی بیوٹی کریم کو اس میں موجود قدرتی حلال اجزا کی وجہ سے 'انٹرنیشنل حلال انگریٹی' ملیشیاء اور امارات اسٹینڈرڈ اتھارٹی' متحدہ عرب امارات' سے حلال سرٹیفکیٹ بھی حاصل ہے۔

زیادہ تر ڈاکٹرز سے کیا جانے والا سوال یہ ہے کہ کریمز کے اندر مرکری اور ہائیڈروکوئینون کیوں استعمال کیا جاتا ہے اور کیا یہ جلد کے لیے مضر ہے؟ ڈاکٹروں کے مطابق مرکری بہت ہی خطرناک کیمیکل ہے جس کے استعمال سے جلد پر بہت سے ہولناک اثرات مرتب ہوتے ہیں' درحقیقت مرکری کا استعمال آپ کی پرانی جلد کو جلا دیتا ہے اور نئی جلد گوری اور صاف آتی ہے' لیکن اس کے استعمال کو چھوڑنے سے جلد خراب اور مرجھا جاتی ہے اور جلد کے خطرناک امراض جیسے کینسر کے خدشات بھی بڑھ جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے ایسی کریمیں جن میں مرکری استعمال ہوتی ہے وہ کریمیں بین الاقوامی طور پر بنانے پر پابندی ہے۔ ہمارا مقصد ہے جلد سے لے کر بالوں تک ہر چیز کے لیے قدرتی حل موجود ہو اس لیے تو ہم کہتے ہیں۔ 'ہربل ہر بل' اگر آپ پہلے سے کوئی ایسی کریم استعمال کر چکے ہیں جس میں مرکری موجود تھا تو پہلے آرگن آئل استعمال کریں اور اس کے بعد ہیمانی بیوٹی کریم استعمال کرنا شروع کریں۔

ہیمانی بیوٹی کریم کراچی' حیدرآباد' ملتان' لاہور' اسلام آباد اور پشاور کی تمام بڑی دکانوں پر موجود ہے اور بہت جلد پاکستان کے تمام شہروں میں دستیاب ہوگی۔ ہیمانی بیوٹی کریم ہماری ویب سائٹ www.hemaniharbal.pk پر بھی دستیاب ہے اور ساتھ کیش آن ڈلیوری کی سہولت بھی موجود ہے۔



ملتان سے ارسال کردہ سچی داستان

نادانیاں

احمد تنہا ہو گیا، اب اُس نے شادی کرنی تھی۔ میں نے ایک دن احمد سے کہا۔ احمد! اب تم تنہا ہو گئے ہو کیوں ناں ہم شادی کر لیں...... میرا خیال تھا جب میں یہ کہوں گی اُس کی باچھیں کھل جائیں گی، لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ جیسے میں کسی پتھر کے ساتھ محو گفتگو ہوں۔ میں نے......

مجید احمد جائی

یہ اُن دِنوں کی بات ہے ساون ٹوٹ کے برس رہا تھا اور میں کالج کی کینٹین میں بیٹھی چائے کی چسکیاں لے رہی تھی۔ کینٹین کا ماحول قدرے گرم اور جوشیلا تھا کیوں کہ عاشقان عشق اور محبوبائیں کونوں کھدروں میں بیٹھے عشق کے لیکچر لے، دے رہے تھے۔ کئی کبوتروں کی طرح غرغوٹوں، غرغوٹوں کر رہے تھے اور اپنی محبوبہ کو دانہ ڈال رہے تھے۔ آنکھیں اشارے کنایہ میں مصروف تھیں۔

ہاتھوں میں ہاتھ تھے اور ان میں جنبش ہو رہی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے یہ کالج نہیں...... عاشقوں کی درس گاہ ہے اور عشق و محبت کے پریکٹکل کرائے جا رہے ہوں۔

اِن عاشقوں اور محبوؤں کی کلاس میں، میں بھی شامل تھی لیکن مجھے عشق کی کلاس میں آئے چند روز ہی ہوئے تھے اور آپ کو تو پتا ہے کہ ہر چیز کے شروعات کے دن بڑے جوشیلے، پُر مسرت اور جذباتی ہوتے ہیں اور اگر عشق کی شروعات ہو تو کیا کہنے۔ دُنیا کے تمام تر خرافات بالائے طاق رکھ کر عشق کیا جاتا ہے اور جو اس عمر میں عشق نہ کرے وہ انسان کے زمرے میں نہیں آتا۔ میرا اشارہ جوانی کے دن ہیں۔ میں بھی اُن دِنوں جوان تھی اور حُسن کے ساتھ ساتھ شباب خوب چڑھ آیا تھا۔

موسم سہانہ ہو یا ساون بھادوں چل رہا ہو تو سونے پہ سہاگہ ہے جیسے دسمبر عاشقوں کے ہجر کا موسم ہوتا ہے اِسی طرح ساون کی رُت عشق کا جوبن کہلاتی ہے۔ انسان تو انسان چرند پرند حتیٰ کہ حشرات، نباتات بھی عشق کرنے بلکہ لڑانے لگتے ہیں۔ بھنورے شمع کے گرد منڈلاتے ہیں تو کوے ٹائیں ٹائیں کر کے اپنی اپنی کے متلاشی ہوتے ہیں اور چڑے چڑیوں کو دانہ دُنکا کے چکروں میں لائن مار رہے ہوتے ہیں۔

کیکر ٹاہلی کے درختوں کے ساتھ آنکھ مٹکا کرنے لگتے ہیں اور بیری کے درخت تو عشق کے سردار ہوتے ہیں۔ تمام نباتات عشق کے لیکچر اُسی

سے لیتے ہیں۔ اشرف المخلوقات میں جیسے لڑکیاں عشق کی ماہر ہوتی ہیں۔ مزے کی بات تو یہ ہے جو عشق کے سردار ٹھہرے وہی فنا بھی ہوتے ہیں ۔ اکثر عشق میں لڑکیاں ہی ناکامی کا منہ دیکھتی ہیں اور پھر گھٹ گھٹ کر مر جاتی ہیں۔ اِسی طرح بیری کے درخت بھی عشق میں فنا ہو جاتے ہیں۔ لمبے لمبے درختوں کی شاخوں پہ گلہری پھدک پھدک کر پہلے جشن مناتے ہیں اور پھر عشق پہ قربان بھی ہو جاتے ہیں۔

عشق نامراد نے ہر جاندار کو فنا کرنے کی ٹھان رکھی ہے۔ عشق بیماری ہے اور خود عشق کو کوئی بیماری لاحق نہیں ہوتی۔ ہر مرض کا علاج ممکن ہے لیکن عشق واحد مرض ہے جس کا علاج ہی موت ہے۔ یہ واحد بیماری ہے جسے ہر جاندار بڑے شوق سے اپنے سینے میں پال لیتا ہے۔

ہاں تو میں کہہ رہی تھی۔ میں کینٹین میں بیٹھی چائے کی چسکیاں لے رہی تھی اور اپنے دلبر ،محبوب کا انتظار کر رہی تھی۔ جانے ہر محبوب میرے محبوب کی طرح تڑپاتے ہیں یا صرف میرا محبوب تڑپاتا ہے۔

یہ عاشق بھی بڑے سیانے ہوتے ہیں، پہلے مجھ جیسی لڑکیوں کو اپنا گرویدہ بناتے ہیں اور پھر تڑپنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ لمحہ لمحہ تڑپا کر امتحان لیتے ہیں۔ بڑے بے مروت ہوتے ہیں عاشق۔ میں اپنی قیاس آرائیوں میں مگن تھی کہ کینٹین کے داخلی دروازے میں وہ نظر آئے



۔میری نظریں اُسے دیکھ رہی تھیں اور وہ مجھے تلاش کر رہا تھا۔اُس کی نظریں مجھے ڈھونڈنے میں مگن تھیں اور کینٹین میں بیٹھی لڑکیاں اپنے عاشقوں کونظر انداز کر کے کن اکھیوں سے اُسے دیکھ رہی تھیں اور میرے تن بدن میں آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔

ہمارے معاشرے میں یہ وباء بڑی پھیل چکی ہے کہ ساتھ بیٹھے شخص کونظر انداز کر کے ہم نئے آنے والے شخص کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں ۔جس طرح مرد حضرات اپنی بیوی کونظر انداز کر کے ہمسائے کی بیوی کو تکتے بلکہ اُس کے قصیدے پڑھتے ہیں۔حقیقت تو یہ ہے ہم لڑکیاں بھی کسی سے کم نہیں ہوتیں۔جس طرح مرد اپنی کو چھوڑ کر دوسرے کی دیکھتے ہیں یہی حال بیوی کا بھی ہوتا ہے اور وہ اپنے شوہر کو چھوڑ کر سہیلی کے شوہر پہ فدا ہو رہی ہوتی ہے۔

بلکہ کہیں کہیں آنکھ مٹکا بھی ہو رہا ہوتا ہے اور اس طرح دونوں فریق اپنی اپنی جگہ مطمئن ہوتے ہیں کہ میں جو بھی کر رہا ہوں یا کر رہی ہوں اُسے خبر نہیں ہے۔

میرے عاشق کا نام احمد ہے اور احمد چلتے چلتے میرے سامنے پڑی کُرسی پہ آ کر بُر جمان ہو گیا۔

ہائے ایمان۔۔۔

سوری! یار، راستے میں گاڑی خراب ہو گئی تھی تبھی تو لیٹ ہو گیا۔ ایم ویری سوری یار! اب موڈ ٹھیک کرلو۔

میرا موڈ آف تھا لیکن اُس کی مسکراہٹ اور کن اکھیوں سے مجھے دیکھنا سب ناراضگی رفو چکر کر گیا۔ اُس کی ادائیں اور باتوں کی چاشنی ایسی تھی کہ میں پُور پُور اُس پہ فدا ہو گئی۔احمد اور میرا عشق نیا نیا تھا۔میں عشق کی کلاس میں ابھی ابھی آئی تھی۔یہ جوانی کا نشہ تھا یا عشق کا وقت آن پہنچا تھا۔عشق ہر شخص کرتا ہے۔کوئی امر ہو جاتا ہے اور کوئی۔۔۔؟

میں فیشن ایبل لڑکی ہوں۔امیر گھرانہ سے تعلق رکھتی ہوں۔میرے والدین کھاتے پیتے فیملی سے تعلق رکھتے ہیں۔روپے پیسے کی کمی نہیں ہے۔گھر میں ہر شئے موجود رہتی ہے بلکہ وافر ہوتی۔جو چیز حد سے زیادہ ہو تو اُس کی قدر بھی نہیں رہتی۔پیسا بے بہا تھا۔

دولت ہی وہ چیز ہے جس سے ہر چیز خریدی جا سکتی ہے۔یہ حقیقت بھی ہے اور خوش فہمی بھی کیونکہ کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو دولت سے کہیں بڑھ کر ہوتی ہیں۔اُنہیں خریدا نہیں جاسکتا نہ ہی وہ کسی بازار میں بکتی ہیں۔

ہم دو بہن بھائی ہیں۔بھائی بڑا اور میں چھوٹی ہوں اور یہ تو آپ کو پتا ہے کہ اولاد میں جو چھوٹا ہو چاہے لڑکی یا لڑکا، لاڈلا ہوتا ہے۔میں بھی والدین کی لاڈلی تھی اور رشتے دار مجھے ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔

اُس کی وجہ میری نظر میں یہ تھی کہ اِسے پیار کرنے سے نوٹوں کی بارش ہوتی اور یہ برسات ہوتی بھی تھی۔میرے ابو جب بھی کوئی فنکشن ،پارٹی کرواتے تو بے بہا روپیا خرچ کرتے ، غریبوں کو خیرات دیتے، رشتے داروں کونوازتے اور اِس طرح میرے ابو کی بلے بلے ہوتی۔جو میرے قریب زیادہ ہوتا اُسے تو نوٹوں میں تولا جاتا تھا۔

میرا بچپن لاڈ پیار سے گزرا۔پھولوں کی طرح میری پرورش ہوئی۔مجھے مٹی نے کبھی چھوا تک نہیں تھا۔ایک اُٹھا رہا ہے دوسرا اُٹھانے کے لیے انتظار میں ہے۔میں نے رونا بھی نہیں سیکھا

تھا۔کوئی غم بھی تو نہیں تھا۔میرے لیے ہر خوشی خریدی جا سکتی تھی۔بچپن سہانہ تھا۔لاڈ پیار نے مجھے خودغرض بنا دیا۔میں نک چڑھی مغرور لڑکی ثابت ہوئی۔

اپنے جیسی لڑکیوں سے دوستی رکھتی۔ہر نیا فیشن سب سے پہلے میں کرتی۔یوں سمجھیں فیشن کا آغاز ہی مجھ سے ہوتا تھا۔آزاد ماحول،آزاد زندگی تھی۔کوئی فکر فاقہ نہ تھا۔میں نے سر پہ دوپٹہ کبھی نہیں لیا تھا۔بلکہ میرے لیے یہ سب معیوب تھا،کیا خود کو چھپاؤ،ڈھانپو۔اُس سے پردہ کرو،اِس سے چھپو۔وہ آرہا ہے،اندر جاؤ،پردہ کرو۔وغیرہ وغیرہ۔ان باتوں پہ میرا دھیان ہی نہیں تھا۔میں پاپا کے ساتھ گھومتی پھرتی تھی۔کبھی کہیں تو کبھی کہاں۔

بچپن گزرا،لڑکپن آیا پھر جوانی کی دہلیز پہ قدم رکھا۔جوانی آئی،اُمنگیں جاگیں۔میں بلا کی حسین تھی اور کچھ کریموں کا کمال بھی تھا۔مہنگی مہنگی کریمیں،پرفیوم میرے لیے آتیں۔شباب عروج پہ تھا۔جسم کا انگ انگ حسین تھا اور دعوت نظارہ دیتا تھا۔میں ہمیشہ پینٹ شرٹ میں ملبوس رہتی۔وہ بھی ہاف بازو۔اور پینٹ چست جسم کے ساتھ چپکی ہوئی۔بال کٹے ہوئے۔عام دیکھنے والا نہیں پہچان سکتا تھا کہ لڑکی ہے یا لڑکا۔میں لڑکوں کے ساتھ بھی لڑکیوں کی طرح ملتی اور پھر کالج کا زمانہ آیا۔کالج یونیورسٹی میں علم کم اور عشق زیادہ پروان چڑھتا ہے۔عشق یہاں سے شروع ہوتا ہے۔یہی وہ جگہ تھی جب احمد میری زندگی میں آیا۔ایک وہی تو تھا جو میرے دل و دماغ پہ حاوی ہو گیا تھا۔احمد کو حاصل کرنا میری مجبوری بن گیا تھا۔بات ہی کچھ ایسی ہو گئی تھی اور حالات یہی کچھ کرنے کو کہہ رہے تھے۔

احمد والدین کا اکلوتا تھا لیکن غریب خاندان سے تھا۔پاکستان میں جانے کیسے امیر اور غریب کے بیٹے بیٹیاں ایک ہی کالج میں پڑھتے ہیں۔احمد بھی اپنی تعلیمی کیئر کی بنا پر یہاں تک رسائی حاصل کر چکا تھا۔

کلاس میں ہر دل عزیز تھا۔بلا کا ذہین تھا۔اساتذہ بھی اس کے دیوانے تھے۔ہر لڑکی اُس پہ مرتی تھی لیکن وہ کسی کو لفٹ نہیں کراتا تھا اور یہی بات مجھے ناگوار گزرتی تھی۔میں نے اُسے قابو کرنے کے لیے جال پھینکا اور یہی میری مجبوری تھی۔میں چاہتی تھی وہ صرف مجھے دیکھے،مجھے چاہے میرے آگے پیچھے گھومے،میرے ترانے گائے،میرے اشاروں پہ ناچے لیکن اُس نے مجھے نچا دیا۔

احمد کسی کو لفٹ نہیں کراتا تھا۔اپنی پڑھائی میں مگن رہتا تھا۔اُس میں روکھا پن تھا۔شاید اُس کی غربت اُسے اِن خرافات میں پڑنے نہیں دیتی تھی۔وہ مجبوریوں کی چکی میں پس رہا تھا۔اُس کی ایک بہن کنواری بیٹھی تھی اور اُس کا خواب تھا کہ میں اعلیٰ سے اعلیٰ نوکری حاصل کر کے بہن کی شادی بڑی دھوم دھام سے کروں۔

یہ غربت بھی کتنی ظالم شئے ہے۔انسان کو کمینہ بنا دیتی ہے۔انسان غربت کے ہاتھوں تنگ ہو کر حیوان تک بن جاتا ہے۔ایسے کام کرتا ہے جس سے انسانیت بھی شرما جاتی ہے۔

احمد ماں کی خدمت کرتا،بہن سے بہت پیار کرتا تھا۔میں اُس کی اس مجبوری سے فائدہ اُٹھانے لگی،اُس کی غربت مٹانے لگی۔دوستی کا ہاتھ بڑھایا جو وہ نا چاہتے ہوئے بھی مان گیا۔

یونیورسٹی کی لڑکیاں مجھ سے خار کھانے لگیں۔میری سہیلیاں میرا مذاق اُڑاتی۔کبھی کہتی

بڑی خوش قسمت ہو جس چیز پہ ہاتھ رکھو، تمہاری ہی ہو جاتی ہے۔ہمیں دیکھو ماری ماری پھر رہی ہیں، کھوٹی قسمت جس کو من میں سجانے کی سوچو وہی بے وفا ہو جاتا ہے۔ہمیں کوئی گھاس تک نہیں ڈالتا اور تم ہو ہر کوئی تمہی پہ فدا ہے۔احمد تو کسی کو لفٹ نہیں کراتا تھا، جانے تم نے کیسا جادو کیا ہے کہ تم پہ مرمٹا ہے۔تمہارے ترانے گانے لگا ہے ۔تمہارا انتظار کرنے لگا ہے ۔اُس کے لبوں پہ تمہارا نام مچلتا ہے، اُس کی آنکھوں میں تمہاری تصویر نظر آتی ہے۔وہ تمہاری پوجا کرنے لگا ہے۔

میں اُن کی باتوں سے مسحور ہوتی، اپنی تعریف سُن کر میرا رواں رواں کھل اُٹھتا۔میں ہواؤں میں اُڑنے لگتی ۔میری روح تک سرشار ہو جاتی انسان کو اپنی تعریف بڑی بھلی لگتی ہے۔

یہی تو اپنا کمال ہے ۔ہم جس چیز کو ایک نظر دیکھ لیتے ہیں وہ ہماری ہو جاتی ہے۔اگر ہماری نہ ہو تو کسی کی بھی نہیں ہوتی۔

میں جواب دیتی اور سہلیاں دانتوں میں اُنگلیاں دبائے محو حیرت ہو جاتیں۔اور سب لڑکیاں ایک زبان ہو کر کہتیں۔

ہاں یہ تو ہے۔

عشق کی پتنگیں اُڑ رہی تھیں ۔احمد مجھ میں دلچسپی لینے لگا اور جہاں عشق وارد ہو جائے وہاں اور کوئی چیز داخل نہیں ہو سکتی۔ہمارا زیادہ وقت کینٹین میں گزرتا تھا۔احمد پڑھائی میں زیرو اور عشق میں ہیرو بن گیا تھا۔سب اُسے دیوانہ مجنوں کہنے لگے اور وہ مسکرا دیتا۔دوستی کی لگام پکڑ کر ہم عشق و محبت کے میدان میں اُتر گئے اور عشق وہ سمندر ہے جس کی گہرائی کوئی جان ہی نہیں سکا۔جو اِس میں ایک بار ڈوب گیا وہ ڈوبتا ہی جاتا ہے ساحل پہ نہیں نکلتا۔اُسے کنارہ نہیں ملتا۔وہ اِس سے جتنی نجات چاہتا ہے اُتنا ڈوبتا چلا جاتا ہے۔

میں باپ کی دولت احمد پہ لُٹاتی رہی اور وہ مجھے پیار دیتا رہا۔میں یونی جاتی ہی انجوائے کرنے کے لیے تھی۔پڑھائی نے مجھے کیا دینا تھا ۔جس چیز کی طلب ہوتی ،دولت سے خرید لو ،ڈگریاں خریدی جا سکتی ہیں ،عہدے بکتے ہیں ۔ضمیر خریدے جاتے ہیں ۔۔ایمان فروخت ہوتے ہیں ۔۔بے ضمیروں کی منڈیاں لگتی ہیں ۔اِنسان بکتے ہیں، میں نے بھی احمد کو خرید لیا تھا ۔لیکن میرے خریدنے کا انداز نرالا تھا۔ہر دُوسرے تیسرے دن اُسے ہزاروں دے دیتی ۔پھر یہ ہزاروں والی کہانی لاکھوں میں بدل گئی۔

احمد کی ماں مر گئی اور بہن کی شادی میری دولت سے بڑے دھوم دھام سے کر دی گئی لیکن میں شادی میں شریک نہ ہو سکی ۔غریبوں کی شادیوں میں جانا بھی بیوقوفی ہے۔میں اُن کی بستی میں جانا نہیں چاہتی تھی۔

یہ غریب بھی دھرتی پہ بوجھ ہوتے ہیں، بچوں کی لمبی لائنیں لگی ہوتی ہیں اور کسی کے تن پہ کپڑے نہیں ہیں تو کسی کے پاؤں میں جوتی تک نہیں۔ جانور اور غریب اکٹھے ہی زندگی بسر کرتے ہیں ۔بلکہ جانور پھر بھی ٹھاٹھ باٹھ سے زندگی بسر کرتے ہیں اور غریب روز مرتا روز جیتا ہے ۔اُس کی معاشرے میں کوئی عزت نہیں ہوتی اور اُس کی عزتیں جاگیرداروں کے بیٹوں سے بے مول لٹتی رہتی ہیں۔نہ کوئی فریاد اور نہ کوئی اِن کی فریاد سننے والا ہوتا ہے۔

احمد تنہا ہو گیا، اب اُس نے شادی کرنی تھی ۔میں نے ایک دن احمد سے کہا۔احمد !اب تم تنہا

ہو گئے ہو کیوں ناں ہم شادی کر لیں ۔۔۔ میرا خیال تھا جب میں یہ کہوں گی اُس کی باچھیں کھل جائیں گی ،لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔جیسے میں کسی پتھر کے ساتھ محو گفتگو ہوں۔میں نے اُسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

ہوں۔۔۔نہیں ابھی نہیں۔۔۔

اُس نے مجھے ٹال دیا۔

یار!ابھی انجوائے کرنے کا وقت ہے۔زندگی کو انجوائے کرو۔تم بھی انجوائے کرو۔میں بھی انجوائے کرتا ہوں۔کتنی پیاری زندگی ہے۔اِسے یوں قید کیوں کریں۔۔کھاؤ، پیئو،موج اُڑاؤ۔شادی کر کے زندگی کو گھن کیوں لگائیں ۔زندگی کو برباد مت کرو۔۔۔کیوں قید ہونا چاہتی ہو۔سمجھ دار ہو بے وقوفی والی باتیں مت کیا کرو۔

یوں مہ و سال گزرتے چلے گئے ۔ہماری ملاقاتیں ہوٹلوں میں ہونے لگیں۔ہم زندگی کو انجوائے کرنے لگے۔شراب میرے لیے مشروب بن گئی۔مرد تو ویسے بھی شراب کے رسیا ہوتے ہیں ۔احمد بھی شراب کا دیوانہ بن گیا تھا۔اور ہمیں ہوٹل کے کمرے میں شراب با آسانی مل جاتی تھی۔آپ تو جانتے ہیں قانون اندھا ہوتا ہے اور ہم جیسے قانون کو اندھا کانا کر دیتے ہیں ۔ہم جیسے، قانون کو اپنی لونڈی بنا لیتے ہیں ۔قانون ہمارا غلام بن جاتا ہے ۔قانون ہمارے سامنے گھٹنے ٹیک دیتا ہے۔

شراب اور شباب کا نشہ بُرا ہوتا ہے۔شراب پینے سے اِنسان ،انسان نہیں حیوان بن جاتا ہے ۔ہم بھی شراب کے نشے میں دھت ہو جاتے اور ہوس کا کھیل شروع ہو جاتا۔شراب کا نشہ اُترتا تو شباب ماند پڑ جاتا پھر ندامت کے دو آنسو بہا کر کمرے سے باہر نکل جاتے۔

اپنی تنہا راتوں کا احوال سہیلیوں کو ہنس ہنس کر سناتی تو وہ بھی انجوائے کرتیں اور یوں عشق میں ،میں اُن کی استاد بن گئی۔روز اُن کو نئے مشورے ،نئے طریقے بتلاتی۔وہ بھی انجوائے کرتیں اور اپنے عاشقوں کے ساتھ خوب گھل مل جاتیں۔

یوں جوانی دیوانی کے نشے میں والدین کی انمول عزت کے پرخچے اُڑ رہے تھے اور ماں باپ بے دھیانی میں لٹ رہے تھے۔اُن کی عزتوں کو گھن لگ رہا تھا۔اُن کے سر جھک رہے تھے اور اُنہیں خبر تک نہیں تھی۔اِدھر ہم مستی میں جھوم رہی تھیں۔

یہ والدین بھی کتنے نادان ہوتے ہیں۔پہلے بچوں کو آزاد چھوڑ دیتے ہیں اور جب وہ گل کھلا دیتے ہیں تب بھی اُن کی غلطی پہ پردا ڈالتے ہیں ۔شاید بدنامی بہت بُری بلا ہے۔جگ ہنسائی کے ڈر سے اندر ہی اندر مر جاتے ہیں۔بدنامی سے بچنے کے لیے روز اندر ہی اندر جیتے مرتے ہیں اور پھر ایک دن لحد میں اُتر ہی جاتے ہیں۔بیچارے والدین ایک ناک کٹ جانے کے ڈر سے کئی بار ناک کٹوا بیٹھتے ہیں۔

احمد اور میں عشق کو خوب انجوائے کر رہے تھے ۔احمد کے والدین تھے نہیں اور میں اپنے والدین کی لاکھوں کی عزت کو بے مول لٹا رہی تھی۔کتنی نادان تھی......

ابھی دو تین ماہ گزرے تھے کہ میرے جسم میں تبدیلیاں شروع ہو گئیں۔ہماری انجوائے منٹ کا نتیجہ میرے پیٹ میں پل رہا تھا۔میں کنواری لڑکی ماں بننے لگی تھی۔سہیلیوں سے ذکر کیا تو ۔۔۔بچہ ،گرا دو۔۔تم تو سب کچھ کروا سکتی ہو۔۔اُنہوں نے مشورہ دیا۔۔لیکن میرا دماغ کچھ اور سوچ رہا تھا۔

جب ہم دونوں نے انجوائے کیا تھا تو اِس کو

نام بھی دیں گے۔ لیکن یہ میری بھول تھی۔ میں نے احمد سے بات کی کہ اب وقت آگیا ہے۔ ہم شادی کر لیں۔۔۔ ہمارا تنہائی کا ملنا رنگ لا رہا ہے۔۔۔ تم پاگل ہو گئی ہو۔۔۔ یہ پہلے ختم کروا دیتی۔۔۔ انجوائے ۔۔۔ صرف انجوائے تمہیں کہا بھی تھا۔۔۔ احمد کے رنگ اُڑ گئے۔

آج پہلی بار احمد نے مایوس کیا تھا۔ میں کینٹین کی اُسی کرسی پہ بیٹھی تھی، جہاں ہم اکثر اوقات بیٹھتے تھے، چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ احمد کب کا چلا گیا تھا۔ میرا انتظار کرنا۔۔۔

یہ اُس کا آخری جملہ تھا۔۔۔ میں اُس کا انتظار کرتی رہی اور وہ پاکستان ہی چھوڑ گیا۔ وہ برطانیہ چلا گیا۔۔۔ مجھے جب یہ خبر ملی تو میں زمین میں دھنستی چلی گئی، مجھے بے حد افسوس ہوا کیوں کہ میری ہی دولت سے، اُس نے مجھے لوٹا اور میری ہی دولت سے باہر چلا گیا۔ اُس کے پاس پھوٹی کوڑی تک نہیں تھی۔ اور میں جوانی کے نشے میں والدین کی لاکھوں کروڑوں کی عزت بھی بے مول لٹا بیٹھی۔ میں لٹ چکی تھی، میری مٹھی میں سب کچھ ہونے کے باوجود بھی کچھ بھی نہ تھا۔

اِنسان کے پاس عزت ہی ہوتی ہے جس کی لاج برسوں نبھاتا رہتا ہے۔ عزت کی خاطر کیا سے کیا کرتا ہے۔ جب یہ نادانی، بے دھیانی میں چلی جائے تو رونا تو آتا ہے، مر جانے کو جی چاہتا ہے۔ میں بھی خود کو ختم کرنا چاہتی تھی لیکن نہیں خود کو ختم تو کر دو، میرے پیٹ میں ایک ننھی سی جان پل رہی تھی۔ اُسے دُنیا میں آنے سے پہلے کیسے ختم کر سکتی تھی۔ آخر اب میں ماں تھی۔۔۔ مائیں کب اپنے بچے مارتی ہیں۔ وہ اپنے بچوں کو پھولوں سے بھی زیادہ سنبھال کر رکھتی ہیں۔ میرے پیٹ میں میرے گناہوں کی نشانی پل رہی تھی۔ اب میں اُسے ختم نہیں کرا سکتی تھی کیوں کہ اب وقت بیت چکا تھا۔ کافی دیر ہو چکی تھی۔ اِنہی دِنوں میرے والدین حج کرنے چلے گئے۔ بھائی کو کوئی پروا نہیں تھی۔ گھر میں کیا ہو رہا ہے، کیوں ہو رہا ہے، کیسے ہو رہا؟ اُسے کوئی غرض نہیں تھی۔

وہ بھی میری طرح عیاش تھا۔ آخر وہ بھی میرا بھائی تھا۔ عورتوں کا رسیا۔۔۔ روز نئی سے نئی لڑکی اُس کے بیڈروم پہ ہوتی۔ شراب کا شیدائی۔ اکثر اوقات ہم دونوں بہن بھائی اکٹھے شراب پیتے تھے۔ ہم اُس کو انجوائے منٹ کا نام دیتے تھے۔ گناہ در گناہ ہوتے جا رہے تھے اور ہمیں معلوم نہیں تھا۔۔۔

دھیانی بے دھیانی میں، میں گناہوں کی دلدل میں پھنستی چلی گئی اور اِس کو عشق کا نام دیا۔ آج کے معاشرے میں یہی عشق تو چل رہا ہے۔ جس کو دیکھو عاشق۔۔۔ ہر گلی میں ہزاروں عاشق نکل رہے ہیں۔ یوں سمجھیں عشق میاں ریڑھی پہ بکتے آلو ہیں، جو ہر گلی، محلے میں ہر روز بکتے ہیں۔ بڑے زور شور سے بکتے ہیں۔

آج ایم بی بی ایس ڈاکٹر کم عاشق زیادہ بنتے ہیں۔ عشق کی ڈگریاں بھی سستی ہیں۔۔۔ محنت نہ دشواری، بس شیو بڑھی ہوئی ہو، بال اُلجھے ہوئے ہوں، ہونٹوں میں سگریٹ، نہیں تو ہاتھوں میں ضرور ہو۔ منہ میں پان لازمی ہے۔ کلائی میں چاندی کے کنگن، گلے میں لاکٹ وہ بھی سنہری۔ چال مستانی، آنکھیں شرارتی، یہی کچھ شرائط ہیں عشق میاں کی۔ جس کو دیکھو دیوانہ ہوا جا رہا ہے۔ عشق ہر کوئی کرتا ہے۔ عشق حقیقی تو کوئی نصیب والا ہی کرتا ہوگا، یا نصیب والے کو نصیب ہوتا ہے۔ اور شاید یہ عشق بڑھاپے میں ہوتا ہے، جوانی کا

عشق تو ہوس پرستی ہے۔ جوانی میں نشہ ہوتا ہے اور نشے میں انسان، انسانیت بھول جاتا ہے، تب تو شیطان کا بھی شہنشاہ بن جاتا ہے۔ شیطان اُس کا غلام ہو جاتا ہے، بس سر پیس سر کی گردان کرنے لگتا ہے۔ اور انسان نما شیطان کا سر اور فخر سے اونچا ہو جاتا ہے۔ آنکھوں پہ ہوس کی پٹی بندھی ہوتی ہے تب دل دیوانہ اور آنکھیں مستانی ہو جاتیں ہیں۔ چال ہرن جیسی اور ادائیں شوخیانہ ہو جاتیں ہیں۔ عشق کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے اور نصیب والے ہوتے ہیں جو عشق کو داغ دار نہیں ہونے دیتے، عشق کی پاکیزگی کو قائم رکھتے ہیں۔ ایسا عشق اور عاشق چراغ لے کر ڈھونڈنے سے نہیں ملتا۔

احمد کے برطانیہ جانے کے بعد میں نے ایک فیصلہ کیا۔ فیصلہ کیا انتقام۔۔۔ امی ابو حج پہ چلے گئے تھے اور بھائی اپنی دُنیا میں مست تھا۔ میں ہمیشہ کے لیے اپنا آبائی گھر کو الوداع کر آئی۔ شہر سے گاؤں آ گئی۔ جس گاؤں کو، یہاں کے باسیوں کو کیڑے مکوڑے سمجھتی تھی۔ اُن میں آن بسی تھی، اُنہوں نے عزت دی، اُنہوں نے مان دیا۔ اپنانیت دی۔ محبت دی۔

یہ گاؤں شہر سے بہت دور تھا۔ گاؤں جا کر کرایہ کا مکان لیا اور وہاں کی باسی عورتوں کو گھی لپٹی داستان غم سنا کر اُن کے دِل جیت لیے۔ یوں مجھے اُن کی ہمدردی اور گھر مل گیا۔ میں شہر کی زندگی اور شہر کا ماحول بھول گئی۔ جو زخم لگے تھے وہ اندر ہی اندر ہرے تھے۔

ابھی چند ماہ گزرے تھے کہ ماہ نور کی صورت حسین گوری چٹی بیٹی کو جنم دیا۔ دِل کیا کہ اِس گناہوں کی نشانی کا گلہ دبا دوں، لیکن جب اُس کے معصوم چہرے کو تکتی تو ماں کی ممتا جوش میں آ جاتی اور اُسے سینے سے لگا لیتی۔ اِس میں اُس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اپنے گناہوں کی سزا اُسے کیوں دیتی۔ گاؤں والوں کو کیا خبر تھی کہ میری کوکھ سے جنم لینے والی ناجائز ہے۔ اس کا باپ تو ہے لیکن۔۔۔۔۔

اِس معصوم کلی میں میری جان اٹکی تھی۔ میں اُس کا چہرہ دیکھتی تو سب کچھ بھول جاتی۔ میں اُس کی پرورش جی جان سے کرنے لگی۔ گاؤں والے جان چھڑکنے لگے۔ عورتیں کہتی، ایمان بی بی۔ جوان ہو، دوسری شادی کرلو۔۔ لیکن میرا ایک جواب ہوتا۔۔۔ نہیں۔۔۔ مرد ذات کا کیا اعتبار کب چھوڑ کے بھاگ جائے۔ یوں میں سب کو ٹال دیتی۔ میری زندگی ماہ نور تھی اور ماہ نور دن بدن بڑی ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے اُس کی فکر ستاتی کہیں یہ بھی میری طرح۔۔۔۔ نہیں۔ نہیں۔ میں اپنی بیٹی کی پرورش ایسی نہیں کروں گی۔ اِسے پیار دوں گی۔۔۔ اِسے زمانے کی گرم ہواؤں سے بچا کے رکھوں گی۔۔۔

ماہ نور بڑی ہوتی گئی اور میرے بالوں میں چاندی اُترنے لگی۔ چہرے پہ جھریاں چھانے لگیں۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے۔ ہڈیاں کمزور ہونے لگیں اور جوانی ڈھل گئی۔ بڑا مان تھا جوانی پہ ظالم نے آخر بدلہ لے ہی لیا۔۔۔ بڑھاپے نے اپنی قید میں لے لیا۔

گھر سے نکلتے ہوئے اچھی خاصی رقم اور زیورات لے آئی تھی۔ میرے اکاؤنٹ میں بھی کروڑوں کی رقم پڑی تھی۔ یوں میرا گزر بسر اچھا ہونے لگا۔ مہینے بعد شہر جاتی۔ اکاؤنٹ سے ضرورت کے مطابق رقم نکلواتی اور اشیاء خورد نوش خرید لاتی۔ گاؤں میں، میں نیک خاتون کے نام سے مشہور تھی۔ ہر کسی سے اخلاق سے بولتی، محبت

سے ملتی، یوں میرے گھر رات گئے تک عورتوں کا ہجوم لگا رہتا۔ اُن کی نظروں میں شوہر کے ستم کی ڈسی ہوئی، اپنوں کی ستائی ہوئی تھی۔ عورتیں میرے شوہر پہ تھوتھو کرتی تھیں۔ اُن کو کیا پتا تھا کہ میں بنا شوہر کے ماں بن گئی تھی۔ میرے ہاتھ پیلے ہوئے نہ لال جوڑا پہنا۔ ڈولی اُٹھی، نہ شہنائی بجی۔ سہلیوں نے گیت گائے نہ پیا کے سپنے سجائے۔ بس میں ماں بن گئی تھی۔ کیا کرتی، جھوٹ کے سہارے ہی سہی، دُنیا میں جینا تو تھا۔

ماہ وسال بیتتے چلے گئے۔ احمد کی بہن کی بھی کوئی خبر نہیں تھی اور نہ ہی میں نے کبھی دیکھی تھی۔ میری اُن سے ملاقات کیسے ہوتی، میں دیہاتی لوگوں کو پسند ہی نہیں کرتی تھی۔ سہلیاں اپنے اپنے گھر بسا گئیں اور کسی سے رابطہ نہ رہا تھا۔ یوں میرے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔۔۔ جانے جب امی ابو حج سے واپس آئے ہوگے تو اُن پہ کیا گزری ہوگی۔ آئے بھی ہوں گے یا میری خبر سنتے ہی وہاں رہ گئے ہوں گے۔ یا میرے غم میں گھٹ گھٹ کر مر کھپ گئے ہوں گے۔ بھائی بھی تو لاپرواہ تھا۔

میں احمد کی کھوج میں لگ گئی۔ یہاں چپے چپے پہ مخبر مل جاتے ہیں۔ میرے پاس دولت ابھی بھی تھی۔ گاؤں کی ایک عورت کو اِس کام پہ لگا دیا۔ وہ بڑی چالاک تھی۔ گاؤں، گاؤں پھرتی تھی۔ شہر شہر جاتی تھی۔ ماسی کے نام سے مشہور تھی (دیہات میں ماسی رشتے کروانی والی عورت کو کہتے ہیں) اُس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ آگے پیچھے میری طرح کوئی بھی نہ تھا۔ شوہر کب کا فوت ہو چکا تھا۔ وہ گاؤں والوں، شہر والوں کے رشتے کرواتی تھی اور اپنی فیس لیتی تھی جس سے اپنا گزر بسر کرتی تھی۔ کئی بار مجھے بھی کہا تھا کیوں کہ ماہ نور جوانی میں قدم رکھ چکی تھی۔ لیکن میں کسی خاص لمحے کے انتظار میں تڑپ رہی تھی۔ اپنے تئیں ماسی کے ذمے لگا دیا کہ کوئی اچھا رشتہ ہو تو کروانا۔ وہ اپنی فیس لے کر اِس کھوج میں لگ گئی۔

ماہ نور اسکول سے کالج اور پھر یونیورسٹی پہنچ گئی۔ لیکن وہ میری طرح گندی نہیں تھی۔ سیدھی سادی، سادگی پسند، اُس کی پرورش دیہات میں ہوئی تھی۔ فرمانبردار۔۔۔ لیکن اُسے بھی یونیورسٹی کی ہوا لگ گئی اور فیصل نامی لڑکے سے محبت کر بیٹھی۔

جب مجھے خبر ملی تو میں پیچ پا ہوئی۔ پہلے پہل اُسے ڈانٹا لیکن آخر ماں تھی۔۔ چاہے میرے انگ انگ سے گناہوں کی بُو آتی تھی۔ لیکن رب تعالیٰ معاف کرنے والا ہے۔ توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔ میں اپنی اولاد کو ایسا نہیں بنانا چاہتی تھی۔ اِنسان بھی کتنا کم ظرف ہے۔ خود گناہ در گناہ کرتا جاتا ہے لیکن اولاد کو نیک پارسا بنانا چاہتا ہے۔

میں نے ماہ نور کو حکم دیا کہ فیصل کو گھر لے آؤ۔ میں اُسے دیکھنا چاہتی ہوں۔ دین اسلام کے طور طریقے سے اُس سے شادی کر دوں گی۔ ماہ نور خوش ہوگئی اور پھر ایک دن بعد فیصل، ماہ نور کے ہمراہ گھر آ گیا۔۔۔

جب میں نے فیصل کو دیکھا تو مجھے دھچکا سا لگا کیوں کہ فیصل کی شکل وصورت احمد سے ملتی تھی۔ ہو بہو احمد لگتا تھا اور میری نظریں دھوکہ نہیں کھا سکتی تھیں۔ لیکن میں دھوکہ کھا گئی۔ میں نے فیصل سے اُس کے والد کا نام پوچھا تو۔۔

مرتضیٰ

مرتضیٰ احمد۔

فیصل نے بتایا۔

کیا کرتے ہیں؟
اپنا بزنس کرتے ہیں۔شہر میں چمڑے کا کاروبار کرتے ہیں، اور چمڑا بیرون ممالک بھیجتے ہیں۔برطانیہ میں ایک عرصہ گزار کر آئے ہیں۔۔برطانیہ۔۔۔؟
میں خیالوں کی مست نگری سے واپس لوٹی کیوں کہ اُس کا نام احمد تھا۔۔احمد علی۔۔۔اُس نے بتایا تھااور اُس کے ڈاکومنٹ میں بھی یہی لکھا تھا۔۔۔
فیصل اچھالڑکا تھا، ہینڈسم،خوبصورت، وجیہ شکل وصورت کا مالک۔۔میں نے فیصل سے کہا۔
بیٹا!کسی دن ماں باپ کو لاؤ۔پھر بات کرتے ہیں۔۔۔وہ خوش ہو گیا۔ماہ نور بھی چہک اُٹھی۔فیصل کی خوب خاطر تواضع کی گئی۔یوں فیصل تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد خوشی خوشی واپس چلا گیا۔۔فیصل کے جانے کے بعد ماہ نور میرے گلے میں بانہیں ڈال کر لاڈ کرنے لگی۔میں اپنے خدشات دُور کر کے ماہ نور کی قسمت پہ اللہ تعالیٰ کا شکر کرنے لگی۔فیصل کو اُس کا سر تاج مان لیا تھا۔
کئی دِنوں بعد فیصل اپنی ماں اور خالہ کو لے آگیا۔اُس کا باپ کام کے سلسلے میں دوسرے شہر گیا ہوا تھا۔۔فیصل کی طرح اُس کی ماں بھی بہت اچھی تھی۔ملنسار،خوش اخلاق،۔وہ ماہ نور پہ صدقے واری ہونے لگی اور بیٹے کی پسند پہ رشک کرنے لگی۔جانے ساس بہو کو گھر لے جانے سے پہلے قربان کیوں ہوتیں ہیں۔حالانکہ رشتوں میں بگاڑ ساس، بہو کے جھگڑے سے ہی ہوتا ہے۔خاندان کے خاندان تباہ ہو جاتے ہیں۔۔
تھوڑی سے تگ و دو کے بعد میں نے ماہ نور کا ہاتھ اُن کو تھما دیا۔اور چٹ منگنی پٹ بیاہ کا کہہ دیا۔۔اُن کو بھی جلدی تھی۔دونوں طرف شادی کی تیاری شروع ہو گئیں۔پندرہ دنوں کے اندر اندر شادی کی تیاریاں عروج پکڑ گئیں۔تاریخ مقررہ پہ بارات آگئی۔گاؤں میں جشن کا سماں تھا۔ارد گرد کے لوگ شادی میں شریک ہوئے تھے۔خوب رنگ جما تھا۔عورتوں سے میرے گھر کا صحن بھر گیا تھا۔سبھی ماہ نور کے نصیب پہ خوش ہو رہی تھیں اور دُعائیں کر رہی تھیں۔
بارات آچکی تھی۔فیصل دُلہے کے روپ میں شہزادہ لگ رہا تھا۔باراتیوں کی خاطر تواضع کی گئی۔شام کے سائے ڈھلنے لگے تو وقت رخصتی آن پہنچا۔۔رسم نکاح ہو چکی تھی۔فیصل نے ماہ نور کو اور ماہ نور نے فیصل کو قبول کر لیا تھا۔منہ میٹھے ہوئے، مٹھائیاں بانٹی گئیں۔۔دیگیں اُتاری گئیں۔
وقت رخصتی میرے سماعتوں سے آواز ٹکرائی۔جلدی کرو ۔۔جلدی کرو دیر ہو جائے گی۔۔اور یہ آواز۔۔۔
یہ آواز احمد کی تھی۔جس کی سانسوں کی گرمی تک سے میں واقف تھی۔۔میری نظریں اُٹھ گئیں۔۔۔سامنے ظالم کھڑا تھا۔۔کمر جھکی ہوئی، سفید بال، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی، گالوں سے چمڑی لٹکتی نظر آتی تھی۔۔۔میں چکرا سی گئی۔بمشکل میرے حلق سے آواز نکلی ۔۔۔رُک جاؤ۔۔یہ رخصتی نہیں ہوگی۔۔۔؟
اس کے بعد کیا ہنگامہ ہوا میری بیٹی رخصت ہونے سے پہلے ماتھے پر طلاق کا ٹیکہ سجائے ہوش وخرد سے بے نیاز پڑی تھی۔فیصل کی آنکھیں لال انگارہ تھیں اور کاندھے جھکے ہوئے تھے اور میں......میں جس کو اپنی ہر چال پر بڑا گھمنڈ تھا اس کو ہی شہ مات ہو چکی تھی۔

☆☆......☆☆



کراچی سے ارسال کردہ مزاحیہ تحریر

میاں چھوڑو

ہمارے آس پاس اکثر ایسے لوگ ہویتے ہیں جو باتوں کا بتنگڑ بنانے
کے فن سے بخوبی واقف ہوتے ہیں ایسے ہی کرداروں کی کہانی......

سید ابو محمد آزاد

لطافت و مزاح کے لیے شیریں الفاظ و جملے کی ضرورت ہوتی ہے مگر رائی کا پہاڑ اور باتوں کا بتنگڑ بنانے کے لیے باکمال ہنر اور مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے صفات کے لوگ ہر دور میں ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔

زیر تحریر کہانی ان ہی جیسے لوگوں کی روداد ہے جو قارئین کی دلچسپی کے لیے پیش کی جارہی ہے۔

میں گیا شہر صوبہ بہار میں پیدا ہوا۔ یہاں سے پھلگو ندی بہتی ہے۔ اس کے چاروں طرف کالے کالے پہاڑ ہیں۔ یہاں دو ڈھائی سو سال پرانا برگد کا درخت ہے۔ اس کو یہ عظمت حاصل ہے کہ اس کے سائے میں اللہ کے برگزیدہ بندہ گوتم بدھ کو نروان حاصل ہوا تھا۔ ان کے دنیا میں لاکھوں پیروکار ہیں۔ درخت بھی پھلگو ندی کے کنارے ہے۔ یہاں پر بدھ مت کا منکٹھ یعنی خانقاہ ہے۔ یہاں بدھ مت کا درس دیا جاتا ہے۔ لاکھوں زائرین دنیا سے آتے ہیں۔

پھلگو ندی کی اہمیت دو باتوں کی وجہ سے بہت ہے۔ ایک تو اس ندی کے کنارے درخت کے نیچے ایک عظیم ہستی گوتم بدھ کو نروان حاصل ہوا دوسرے اس ندی میں سیلاب بہت آتا ہے۔ جس سے اس کے کنارے آباد لوگوں کو بڑی تباہی کا سامنا رہتا ہے۔ وہیں منچلے بپھرے چنگھاڑتے سیلاب کو اپنی شوخ طبع کے لیے ذرائع وسائل سمجھتے ہوئے اس سے من گھڑت قصہ کہانی گڑھ لیتے ہیں۔ ان ہی میں ایک گوالن میرے بچپن میں ہمارے یہاں دودھ دیتی تھی۔ آئے ہوئے سیلاب کے متعلق میری والدہ سے یوں ہمکلام ہوتی۔

"متاں (صوبہ بہار میں یہ لفظ قابل احترام کو کہتے ہیں) آپ یقین کریں یا نہ کریں' سیلاب کے پانی سے یہ آواز سنی جارہی ہے۔

"جلدی کروا اپنے سب سے پیارے کا جلد سے جلد بلیدان دے دو ورنہ ہم تم سب کو برباد کردیں گے۔" یہ سن کر گھر کی عورتیں سکتے میں آگئیں۔ میں اس وقت چھ سال کا تھا' میں نے

اماں سے کہا۔
"آپ سنی ان سنی کردیں یہ عورت چھوڑو معلوم ہوتی ہے۔"
سیلاب کیا آیا ایک بھونچال آ گیا۔ ہر طرف سیلاب کا چرچا زد عام تھا۔ مال مویشی کی تباہی کے متعلق ہر عام وخواص کی زبان پر تھا۔ محلے کا ماحول خوف وہراس میں ڈوبا ہوا تھا۔ سرشام لوگ اپنے اپنے گھروں میں بند ہوجاتے ۔ رفتہ رفتہ سیلاب کا پانی اترتا گیا لوگوں میں اعتماد بحال ہونا شروع ہوگیا۔ ندی اس پار سے لوگوں کا دوسری طرف آنا شروع ہوگیا۔ وہ جو باتوں کا بتنگڑ اور رائی کا پہاڑ بنانے کا ہنر جانتے تھے اُن کا کاروبار اب بھی ماند نہیں پڑا تھا۔ اب کی میاں چھوڑو نے لوگوں میں یہ بات مشہور کردی کہ ندی کے اُس پار سے گھٹنے گھٹنے پانی سے اس طرف ایک گوالا دودھ بیچنے اپنی گوالن کے ساتھ آرہا تھا کہ راستے میں مگر مچھ نے گوالن کو پکڑ لیا۔ اس کے چیخ چلاہٹ پر گوالے نے ڈنڈے مار کر مگر مچھ سے گوالن کو چھوڑا لیا۔ گوالن تو بچ گئی مگر پانی سے کالی مائی کی آواز نکلی۔
"تم لوگوں کو تنبیہ کی تھی کہ جلد سے جلد تم لوگوں نے اپنے پیارے کا بلیدان اگر نہیں دیا تو ہوش میں آجاؤ اگر اب کی تم لوگوں نے میرا حکم نہ مانا تو ہم تم لوگوں کو نشٹ کردیں گے۔" لوگوں میں پھر خوف و ہراس پیدا ہوگیا۔ کچھ لوگ گھر چھوڑ کر دوسری جگہ منتقل ہوگئے۔ اسی افراتفری



میں ایک شام میرے گھر کے سامنے درخت پر اُلو بیٹھا ہوا نظر آیا۔ بس کیا تھا لوگوں میں کھلبلی مچ گئی جتنے منہ اتنی باتیں شروع ہوگئیں۔ کسی نے کہا۔

"یہ پرندہ بہت منحوس ہوتا ہے اگر یہ اڑوس پڑوس میں نظر آ جائے تو سمجھیں کسی کی موت یقینی ہونے والی ہے، اللہ خیر کرے۔" پھنے میاں نام کے ایک شخص وہیں پر رہتے تھے وہ بہت باکمال آدمی تھے رائی کا پہاڑ بنانا اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اس لیے ان کو میاں چھوڑو کہتے تھے۔ اتفاق سے مذکورہ درخت پھیکو میاں نام کے ایک شخص کے گھر کے سامنے تھا۔

اُن دنوں پھیکوں میاں بیمار تھے عام طور پر لوگوں میں یہ بات عام تھی کہ رات میں ایک پرندہ انسان کی طرح کراہتے ہوئے اڑتا ہوا دیکھا جارہا ہے جس کے منہ سے خون ٹپکتا ہے۔ جس گھر پر سے وہ گزرتا ہے۔ وہاں موت یقینی واقع ہوجاتی ہے پھنے میاں کے لیے ایسی خبریں باعث تفریح سے کم نہ تھیں وہ پلک جھپکتے آناً فاناً خبروں کو بی بی سی لندن بن کر اس چھوٹی سی بستی تک پہنچادیتے۔ لوگ خوف زدہ سہمے ہوئے ایک دوسرے سے پوچھتے۔

"کیا بھائی! اس موت کے پروانے پرندے کو اڑتے ہوئے تو نہیں دیکھا؟" حسن اتفاق وہ موت کا پروانہ پرندہ ایک رات بیمار پھیکو میاں کے گھر پر سے گزرتا ہوا دیکھا گیا تھا۔ لوگ خبروں سے گوناگوں کی حالت میں تو تھے ہی اب مذکورہ تازہ خبروں سے آنے والی خبروں کا شدت سے انتظار کرنے لگے۔ لوگوں کے لیے آنے والی خبروں کا شدت سے انتظار کیا جانے لگا۔ اگلی خبریں لوگوں کو چونکا دو پریشان کرنے والی تھی یعنی پھیکو میاں اس دنیا سے گزر گئے ۔ افواہ ایک حقیقت بن کر بستی والوں پر قیامت بن کر ٹوٹ پڑی۔

میاں چھوڑو کا کاروبار کبھی اور کہیں بھی بند ہونے والا نہیں شہر شہر، گاؤں گاؤں قریہ قریہ ہر ملک بس ان کی نسل اپنی جدی پشتی آباؤ اجداد کے طریقہ زندگی کو قائم و دائم رکھے ہوئے ہے۔ برصغیر ہندو پاک کی تقسیم ہوئی تو میں اپنے والدین کے ہمراہ نئے ملک پاکستان آ گیا۔ ہمارے بھائی صاحب ریلوے کے ملازم تھے۔ ان کی پوسٹنگ راجتنا میں ہی ہوئی۔ یہ مشرقی پاکستان کا ایک شہر تھا۔ مشرقی پاکستان دریا اور گھنے جنگلات سے بھرا ہوا تھا۔ اس ملک کے پرانے باسی کی اپنی ایک طرز زندگی تھی۔ قریب قریب ہر غریب و امیر کے رہائشی گھروں کے سامنے ایک تالاب کا ہونا لازم تھا۔ میں نئی جگہ کے حسن و جمال کو دیکھنے کے لیے اِدھر اُدھر نکل جاتا۔ ریلوے اسٹیشن سے ایک کچی سڑک صاحب بازار نام کی طرف جاتی تھی۔ سڑک کے دونوں جانب تھوڑی تھوڑی آبادی تھی زیادہ تر علاقے گھنے جنگلات سے اٹے ہوئے تھے۔ مذکورہ اسٹیشن کی بائیں جانب سے کچی سڑک آگے جا کر صاحب بازار سے مل جاتی تھی۔ یہ سارا علاقہ جنگلات سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس راستے میں ایک بہت بڑا گہرا تالاب تھا ارد گرد جنگلات کے درختوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ درخت اتنے گھنے تھے کہ سورج کی روشنی زمین پر نہیں پہنچتی تھی۔

رفتہ رفتہ یہاں کے لوگوں سے واقفیت ہوتی گئی ان میں ایک شخص جس کا نام ذو ولیل (یعنی جلیل) تھا۔ وہ کوئی کام کاج نہیں کرتا تھا زیادہ تر وہ ریلوے اسٹیشن پر لوگوں کے ساتھ گپ شپ کر کے گزارتا تھا۔ اس کی باتیں بہت لمبی رائی کا پہاڑ معلوم ہوتی تھیں مگر اس اجنبی جگہ دل بہلانے کے لیے اس سے کوئی بہتر صورت نظر نہیں

آتی تھی۔ میاں چھوڑو کی نسل صرف کہنے کے لیے نہیں حقیقت میں پوری دنیا میں آباد ہے۔ میری محبت ذولیل بھائی سے ہوگئی۔ میں ان کی تصوراتی دل کو چھونے والی باتوں کو خوب انجوائے کرتا رہا۔ ایک دن وہ مجھ سے کہنے لگے۔

''تم جانتے ہو یہ علاقہ پہلے ایک راجہ کی ملکیت تھا وہ ہاتھی بھی پالتا تھا۔ ایک دن اُس کا ہاتھی مستا گیا اپنی جگہ چھوڑ کر اس تالاب کی طرف جس کو تم دیکھ چکے ہو اس طرف غائب ہوا کہ تلاش بسیار کے باوجود اُس کا کوئی اتا پتہ نہیں چلا۔ تب سے اس تالاب کو ہاتھی ڈوبا تالاب کہتے ہیں ہاں سال کی ایک رات جب چاند کی چاندنی سارے آسمان پر چھائی رہتی ہے تو وہ ہاتھی ڈوبا تالاب کے پانی کی اوپری سطح پر چلتا ہوا نظر آتا ہے جیسے وہ زمین پر چل رہا ہے۔ وہ لوگ جو پہلے اس تالاب میں ڈوب کر مر چکے تھے وہ سب زندہ ہاتھی کی پشت پر بیٹھے نظر آتے ہیں۔ ایسی ہی دلفریب اور دل نشین باتوں کو سننے کے بعد اب مجھ میں تاب نہ تھی کہ میں میاں چھوڑو ذولیل بھائی کی باتوں کو سنتا۔ اللہ حافظ کہہ کر میں وہاں سے چل پڑا راستے بھر میں سوچتا چلا گیا کہ بھائی میاں چھوڑو کی ساری باتیں ہیں تو جھوٹی گڑھی ہوئی مگر ہیں تو دلچسپ' آئندہ کے لیے کوشش کرتا کہ ان سے کم کم ملوں پھر بھی دل ان کی چٹکلی باتوں کو سننے کے لیے بے قرار رہتا۔

وقت بہت تیزی سے گزر رہا تھا اس نئی جگہ ہجرت کر کے آئے ہوئے تقریباً سال گزر گیا تھا۔ پڑھائی لکھائی ندارت تھی۔ یہاں کوئی اردو میڈیم اسکول نہیں تھا ملک نئی تبدیلی سے گزر رہا تھا میرے بزرگ ہمیشہ وعدہ کرتے کہ بہت جلد مجھے اس جگہ پڑھنے کے لیے بھیج دیں گے جہاں اردو میڈیم اسکول ہے مگر ایسا کبھی نہ ہوا۔ بالآخر میں خود ہی اس جگہ پہنچ گیا جہاں اردو اسپیکنگ کی آبادی تھی۔

بات تو یہ ہے کہ میری روح کو تعلیم کی وابستگی نے طمانیت بخشی ہے مگر دل کی چاشنی کے لیے میاں چھوڑو یعنی ذولیل بھائی کی دلفریب چٹکیلی باتوں سے میں محروم ہو گیا تھا۔ یہ محرومی وقتی ہے میاں چھوڑو کی نسل ضرور ہر جگہ آباد ہے۔ یہ میری وابستگی کا خیال کرتے ہوئے مجھ سے ضرور آملے گی اور روایت کو قائم رکھے گی۔

میری تعلیمی درسگاہ کا نام جناح ہائی اسکول ہے۔ یہ پاربتی پور مشرقی پاکستان میں تھا۔ میری تعلیم جہاں شدومد کے ساتھ رہی وہاں تفریحی تقریب یعنی تمثیلی مشاعرہ میں اور اسکول میں دیگر موضوع پر بحث ومباحثہ میں حصہ لینا میری زندگی کا شعار تھا۔ میرے دوستوں میں پڑھا کو طالب علم انبیا حسین تھے۔ ان کے والد کا ریلوے اسٹیشن پر مسلم ریسٹورنٹ نام کا ایک ریسٹورنٹ تھا۔ متذکرہ مشغولیت کے سوا ایک عرصہ تک کسی میاں چھوڑو کی خصوصیت کے حامل شخص سے شناسائی نہیں ہوئی تھی میاں چھوڑو ذولیل بھائی کی چٹکیلی اور تصوراتی باتوں کو سننے کے لیے دل چاہتا تھا۔ باتوں کو گڑھنا رائی کا پہاڑ بنانا یہ سب کے بس کی بات نہیں ہے کچھ مخصوص لوگ ہوتے ہیں جن میں ایسی مہارت ہوتی ہے۔

یوں تو دور انگریز سارے ہندوستان میں ریلوے لائن بچھی ہوئی تھیں ریلوے اسٹیشن اور کوارٹرز بنے ہوئے تھے۔ ان میں تقسیم ہند کے بعد پاکستان کے حصے میں بھی ریلوے آئی۔ جہاں میں تعلیم حاصل کر رہا تھا وہاں ریلوے اسٹیشن اور ملازمین کے لیے کوارٹرز اور افسران کے لیے ٹینس

کورٹ بنے ہوئے تھے۔ اس نئی جگہ میں ہندوستان سے آئے ہوئے مہاجرین اور ریلوے ملازمین آباد تھے۔ اس جگہ کا نام پاربتی پور تھا۔ اب تک مجھے یہاں کوئی میاں چھوڑو کے خصائل کے لوگ نہیں ملے تھے۔ البتہ نعیم نام کے ایک شخص میرے پاس آتے تھے۔

میری رہائش رفیع صاحب آئی او ڈبلو کے بنگلے میں تھی۔ یہ دو منزلہ بنگلہ تھا۔ اس بنگلے کے سامنے باغیچہ تھا ان میں طرح طرح کے خوبصورت پھول اُگے ہوئے تھے۔ اس باغیچے کے سامنے ٹینس کورٹ تھا۔ ایک دن نعیم بھائی بہت رازدارانہ انداز میں مجھ سے کہنے لگے۔

''تمہارے بنگلے کے سامنے جو ٹینس کورٹ ہے اس میں آدھی رات کو انگریز عورتوں کو ٹینس کھیلتے دیکھا گیا ہے۔ آپ ذرا ہوشیار رہیں۔'' متذکرہ بنگلے کی بالائی منزل میں آئی او ڈبلو صاحب اور زیریں منزل میں میں رہتا تھا۔ میں نے کبھی بھی کوئی شے نہیں دیکھی تھی۔ اکثر و بیشتر نعیم بھائی ڈر خوف کی باتیں کرتے تھے مگر ان کی باتوں میں وہ تجسس وغیرہ نہیں تھا جو سابقہ میاں چھوڑو کی باتوں میں تھیں۔

میرا میٹرک کا فائنل امتحان ہونے والا تھا۔ میں اس کی تیاری میں محو تھا۔ میرے بڑے بھائی جو ڈھاکہ میں ماموں جان کے یہاں قیام پذیر تھے ان کی علالت کا ٹیلی گرام موصول ہوا۔ میرے امتحانات کے دن بالکل قریب تھے مجھے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں۔ بالآخر حالت سے مجبور ہو کر مجھے ڈھاکہ جانا پڑا۔

وہاں پہنچا تو کہانی اور تھی۔ میری زندگی کا ایک نیا باب کھل گیا۔ نئی زندگی کے آغاز میں میری پسندیدہ ہستی میاں چھوڑو مل گئے۔ ان کی ملاقات اور تعلقات نے میری زندگی کا خون کر دیا۔ وہ منزل جس کو پانے کے لیے میں تنہا بے وسیلے اپنے عزم و استقلال کی طاقت سے برسوں سے رواں دواں تھا میاں چھوڑو نے مجھے سبز باغ دکھا کر میری منزل کا سودا کیا۔ میاں چھوڑو کوئی غیر نہیں تھے وہ ماموں جان کے سسر تھے۔ اور جن بھائی صاحب نے مجھے ٹیلیگرام بھیجا تھا وہ ماموں جان کے ساتھ ان کے یہاں قیام پذیر تھے۔

ہر شخص میں کوئی نا کوئی کمزوری ہوتی ہے۔ مجھ میں سب سے بڑی کمزوری تعلیم کی چاہت تھی۔ میں اس پیاس کو بجھانے کے لیے سب کچھ کر گزرنے کو تیار تھا۔ میری یہ کمزوری میاں چھوڑو حبیب صاحب کو معلوم تھی۔

ایک شام میں ماموں جان بھائی صاحب اور حبیب صاحب کے ساتھ بیٹھا تھا حبیب صاحب ماموں جان کی طرف مخاطب ہو کر فرمانے لگے۔

''گزشتہ دن سلمان صاحب سے ملاقات ہوئی تھی وہ اپنی بیٹی کے لیے ایک ایسا لڑکا تلاش کر رہے ہیں جو زیر تعلیم ہو وہ اس کی پڑھائی کا سارا خرچ برداشت کریں گے وہ لندن بھیج کر بھی پڑھا سکتے ہیں۔ یہ پیسے والے ہیں ان کے پاس کلکتہ میں اپنی کار تھی یہاں بھی کار خریدنے والے ہیں۔ سلمان صاحب اُن کی بھانجی کے شوہر تھے۔ جب میرا سودا ہو گیا اور میں صیاد کے جال میں پھنس گیا تو باتیں سامنے آئیں ایک تو حبیب میاں سب سے بڑے میاں چھوڑو ثابت ہوئے دوسری بات دورانِ تعلیم ایک ڈیڑھ ماہ میں سسرال کا دسترخوان خالی تھا۔

لیکن سودا میرے لیے مہنگا ثابت نہیں ہوا۔ اللہ نے مجھے نیک صفت فرمانبردار اور محبت کی مجسمہ بیوی عطا کی اللہ میاں چھوڑو عرف حبیب صاحب کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے آمین۔

☆☆......☆☆



منچن آباد سے ارسال کردہ تحریر

خالہ تندور والی

جو قسمت میں ہوتا ہے وہ مل کر ہی رہتا ہے جنید کو
بھی اس کی قسمت اسپتال تک لے آئی تھی......

طاہر مقصود احمد ہاشمی

جیسے ہی چھٹی کی گھنٹی بجی۔ بچے اپنے اپنے بستر اٹھائے کسی گن کی گولی کی طرح اسکول سے نکلے اور اپنے اپنے گھروں کے راستوں پر سیل رواں کی طرح بھاگم بھاگ دوڑنے لگے۔

ہماری کالونی کی داخلی گلی کے بائیں ہاتھ ایک خاتون کا تندور تھا جو خالہ تندور والی کے نام سے مشہور تھا۔ گرمیوں کے موسم میں ایک بجے دن کے بعد خوب گہما گہمی ہوتی۔ خالہ تندور والی کی ایک بیٹی جو کلاس نہم کی طالبہ تھی۔ وہ جب اسکول سے فارغ ہوتی تو تندور پر والدہ کے پاس چلی آتی۔ وہ پیڑے بناتی جاتی اور اس کی والدہ روٹیاں بناتی جاتیں۔ یوں قریب ڈیڑھ یا دو گھنٹے اپنی والدہ کا ہاتھ بٹاتی۔ پھر گھر چلی جاتی شام مغرب کے بعد وہ دوبارہ تندور پر آتی اور اپنی والدہ کے کام میں معاونت کرتی۔

کوئی اِدھر سے آواز لگا رہا ہے تو کوئی اُدھر سے

''خالہ میری چار روٹیاں کڑک لگانا......'' وہ لڑکی جس کو اس کی والدہ شنو کہتی ایک بار آواز کی سمت دیکھتی پھر روٹیوں کے پیڑے بنانے میں مصروف ہو جاتی۔ ایک مسکان اس کے ریشمی لبوں پر رہتی۔

چودہ سے اٹھارہ بیس سال کے لڑکے شنو کو دیکھنے کے لیے تندور پر آتے روٹیوں کا صرف ایک بہانہ ہوتا پھر کن انکھیوں سے پہلے دائیں پھر بائیں دیکھتے پھر شنو کو دیکھتے پھر آپس میں ایک دوسرے کو دیکھتے کبھی ہنستے کبھی آواز کستے۔

ایک رات تقریباً نو بجے ہمارے گھر مہمان آ گئے تو والدہ صاحبہ نے مجھے حکم دیا۔

''جنید جاؤ اور تندور سے روٹیاں لے آؤ۔''

جب میں تندور پر گیا تو وہ دونوں ماں بیٹی تندور سمیٹنے والی تھیں۔ میں نے کہا۔

''خالہ جی مجھے دس روٹیاں چاہیں۔''

''آٹا گوندھ کر لگا دیتی ہوں کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے......'' اس نے شنو سے کہا۔

''جلدی جلدی دس بارہ روٹیوں کا آٹا گوندھو۔''

شنو نے تھیلے سے آٹا نکال کر پرات میں ڈالا اور پانی ملا کر گوندھنے میں مصروف ہو گئی میں نے پہلی مرتبہ

اس کے ہاتھوں کو غور سے دیکھا جو بڑے ہی نرم ملائم اور لمبے تھے۔ سکن سونے کی طرح چمکدار تھی۔ بائیں ہاتھ کی چھنگلیا کے نیچے ایک سیاہ تل تھا۔ جو ایسے لگ رہا تھا جیسے بلیک مارکر یا پوائنٹر سے بنایا گیا ہو مگر وہ حقیقی تھا قدرتی تھا۔

خیر خالہ نے روٹیاں لگائیں اور میں لے کر گھر آ گیا۔ کچھ دنوں بعد میرے والد صاحب کا ٹرانسفر ہو گیا۔ اور ہم بہاولنگر چلے گئے۔ تندور والی باتیں بھول بھال گئیں بیس سال گزر گئے میں اپنے باپ کے محکمے میں تعلیم مکمل کر کے جاب کرنے لگا۔ ایک دن میں دفتر سے باہر نکلا تو مجھے چکر آ گیا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ مجھے بہاولپور کارڈیالوجی میں پہنچایا گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے دائیں بائیں دیکھا۔

مجھے معلوم ہوا کہ مجھے عارضہ قلب کا مسئلہ درپیش ہو چکا ہے اور مجھے تقریباً ایک ہفتہ یہاں گزارنا ہوگا۔ تھوڑی دیر بعد ایک برقعہ پوش نرس آئی جس کے ہاتھوں کے علاوہ مکمل طور پر خود کو ڈھانپا ہوا تھا۔ اس نے مجھے انجکشن لگایا۔ اچانک میری نظر اس کے بائیں ہاتھ کی چھنگلیا پر پڑی جس کے نیچے سیاہ تل تھا بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

''میڈم آپ کا نام شنو ہے؟'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور کہا۔

''جی نہیں......''

اگلی شام وہ پھر آئی چارٹ دیکھ کر انجکشن لگایا۔

''آپ نے مجھے شنو کیوں کہا تھا؟''

''سوری مجھ سے پہچاننے میں غلطی ہو گئی۔'' وہ چلی گئی۔ پھر تیسری شام آئی میں نے اسے سلام کیا۔ اس نے جواب دیا اور گزشتہ شب والا پھر وہی جملہ دہرایا کہ میں نے اسے شنو کیوں کہا۔ میں نے پھر اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بتایا کہ میں بھول گیا آپ وہ نہیں ہیں تو کوئی بات نہیں۔ چھٹے دن وہ پھر آئی اور کہنے لگی۔



’’صبح آپ اسپتال سے ڈسچارج ہورہے ہیں جاتے جاتے مجھے شنو کے بارے میں کچھ ضرور بتائیے گا۔‘‘

’’میڈم وہ بیس سال پہلے کی بات ہے۔‘‘ پھر میں نے اسے تندور والی بات بھی بتائی۔ تو وہ ساری بات سن کر خاموشی سے چلی گئی۔ اگلی صبح مجھے اسپتال سے ڈسچارج کردیا گیا تب وہ میرے پاس آئی اور ایک کاغذ پر اپنے گھر کا ایڈریس لکھ کر دیا اور کہا۔

’’آئندہ جب بھی بہاولپور چکر لگے تو میرے غریب خانے پر ضرور چکر لگانا۔‘‘ میں اُسے دعائیں دیتا ہوا اسپتال سے رخصت ہوا۔

چھ ماہ بعد مجھے محکمے کی طرف سے تین دن کے لیے بہاولپور جانا پڑا۔ میرے دل میں اس نرس کا خیال آیا۔

’’یار کیسی عجیب عورت ہے ہر وقت سیاہ پوش بنی رہتی ہے چلتے ہیں اس کے گھر دیکھتے ہیں کہ گھر میں وہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے۔‘‘ چنانچہ میں نے اچھی قسم کے دو جوڑے کپڑوں کے، کچھ پھل اور مٹھائی خریدی اور گاڑی کا رخ اس کے بتائے ہوئے ایڈریس کی طرف کردیا۔

جیسے ہی میں مطلوبہ جگہ پر پہنچا کیا دیکھتا ہوں کہ صف ماتم بچھا ہوا ہے اور گھر سے رونے دھونے کی آوازیں آرہی ہیں میرے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہاں ایک ڈاکٹر صاحبہ رہتی ہیں ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا ہے۔ مجھے بڑی پریشانی ہوئی سامان میں نے گاڑی میں رکھا اور خود دھڑکتے دل کے ساتھ جیسے ہی گھر کے اندر قدم رکھا۔ میری نگاہیں شنو کی نگاہوں سے ٹکرائیں۔ جو ماں کی میت کے ساتھ سر لگائے رو رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی کھڑی ہوگئی۔ اگلے ہی لمحے عورتوں کو پھلانگتے ہوئے میری چھاتی سے آلگی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

’’جنید میری امی فوت ہوگئی میں بے سہارا ہوگئی میرا چھپر چھاؤں تنکا تنکا ہوگیا۔ جنید میں تنہا ہوگئی۔‘‘

میری سمجھ میں کوئی بات نہیں آرہی تھی کہ میں اس کو کیسے دلاسا دوں کیسے حوصلہ دوں کئی لمحے وہ میرے ساتھ لپٹ کر بچوں کی طرح روتی رہی۔ میرا نام اسے کیسے یاد رہا مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔

اسپتال کی ایک کولیگ نے آگے بڑھ کر شنو کو مجھ سے جدا کیا شنو اپنی کولیگ سے کہنے لگی۔

’’جنید صاحب کو اندر کمرے میں بٹھاؤ میں ابھی کچھ دیر بعد آتی ہوں۔‘‘ شنو کی دوست میرے ساتھ کمرے میں آئی اور بٹھا کر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد شنو اندر آئی تب تک میں اپنے حواس بحال کرچکا تھا۔ کہنے لگی۔

’’کیسے آنے ہوا؟‘‘ میں نے جواب دیا۔

’’بس ایک سرکاری کام سے اِدھر آیا تھا سوچا آپ کو دیکھتا چلا جاؤں‘ مگر مجھے کیا معلوم آپ کے اوپر اس قدر غم کا پہاڑ ٹوٹا ہوا ہے بہرحال یہ اللہ کی تقدیر ہے‘ اُس کا امر ہے‘ ہمیں ہر حال میں اس کو ماننا پڑے گا۔‘‘ شنو کے چہرے پر امید کی کرنیں پھوٹنے لگیں۔ میرے کہے ہوئے چند امید افزا جملے شنو کا کام کرگئے۔ شنو باہر نکلی اور والدہ کے غسل کفن میں مصروف ہوگئی۔ شنو کے محلے والوں نے تجہیز و تکفین کے تمام مراحل کو بڑے احسن طریقے سے سرانجام دیا۔ شام ہوچکی تھی میں باہر نکلا۔ گاڑی کا لاک کھولا۔ شنو کے لیے جو کپڑے خریدے تھے فروٹ اور مٹھائی اٹھائے اور شنو کے سامنے لاکر رکھ دیے۔ اس نے کپڑوں کو بڑے غور سے دیکھا اور کہنے لگی۔

’’یہ کس کے لیے ہیں؟‘‘ میں نے کہا۔

’’یہ آپ کے لیے خریدے تھے۔ صبح کو آپ کو پیش کرنے کا موقع نہیں تھا ویسے تو اب بھی یہ بات مناسب نہیں مگر میں صرف آپ کی خاطر لایا تھا۔ میں چاہتا ہوں آپ اس کو قبول فرمالیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ آئندہ کبھی ہماری دوبارہ ملاقات ہو۔ بس یہ کپڑے آپ قبول فرمالیں۔ مجھے بہت خوشی ہوگی۔‘‘

شنو نے ایک بار آنکھ بھر کر دیکھا اور کپڑوں کا پیک مٹھائی اور فروٹ چھلکتی آنکھوں سے قبول کر لیے۔

''جنید صاحب...... آپ کہہ رہے تھے کہ آپ تین دن اِدھر ہیں تو میں یہ خواہش کرتی ہوں کہ آپ یہ دن میرے ساتھ گزاریں۔ میں نے تمام جاننے والوں کو بتا دیا ہے کہ آپ میرے کزن ہیں۔ اس طرح میرا غم بھی کچھ کم ہو جائے گا۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے آج تو میں شب ہوٹل میں گزاروں گا دن کا کچھ حصہ سرکاری میٹنگ اٹینڈ کروں گا۔ بقیہ وقت آپ کے ہاں آ جاؤں گا۔'' چنانچہ اگلی صبح اپنے طے شدہ کاموں سے فارغ ہو کر میں شنو کے ہاں آ گیا اور باہر مردانے میں بیٹھا رہا شام اندر گھر آیا اور کھانا کھانے کے بعد فراغت چاہی تو شنو نے مجھے روک دیا اور کہا۔

''آج مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ آپ اِدھر رہ جائیں۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی......''

رات نو بجے ہم تین چار لوگ چائے پی رہے تھے تو شنو نے اچانک ایک سوال کر دیا۔

''جنید صاحب! آپ کے کتنے بچے ہیں اور وائف کیا کرتی ہے؟'' اس کا سوال سن کر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی میں نے کہا۔

''میری تو ابھی تک شادی ہی نہیں ہوئی۔''

''ابھی شادی نہیں ہوئی مگر کیوں؟'' میں نے کہا۔

''ہمارے خاندان میں جب لڑکا چالیس سال کا ہو جائے تب شادی کرتے ہیں ہمارے بزرگوں کا کہنا ہے کہ یہ عمر شادی کے لیے مناسب ہوتی ہے' عقل و دانش' فہم و فراست عروج پر ہوتی ہے۔ آدمی اپنے فیصلے درست کرتا ہے۔'' میری باتیں شنو سمیت باقی دو خواتین بھی بڑے غور سے سن رہی تھیں۔ ماحول سنجیدگی سے نکل کر خوشگوار ہو چکا تھا۔ میں نے شنو سے کہا۔

''آپ نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟'' کہنے لگی۔

''مجھے اپنی والدہ سے بہت محبت تھی۔ میں اسے تنہا نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ وہ عرصہ دس سال سے بیمار تھیں اور اس کی دوا دارو نگہداشت کی جملہ ذمہ داری بھی مجھ پر تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میں شادی کے بعد اپنی نجی زندگی میں مصروف ہو جاؤں اور والدہ بے یار و مددگار کسی کونے کھدرے میں پڑی رہیں۔ اسی وجہ سے میں نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔'' میں نے کہا۔

''اتنی لمبی زندگی پڑی ہے آپ کی' کیسے گزارو گی؟'' کہنے لگی۔

''میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں نے کیا کرنا ہے؟''

''آپ نے کیا کرنا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کل بتاؤں گی؟''

''بہتر ہے کل بتا دینا......'' میں ڈرائنگ روم میں جا کر سو گیا اور وہ تینوں سہیلیاں اپنے کمرے میں سو گئیں۔ اگلی صبح میں اٹھا ناشتہ کیا اور اپنی سرکاری میٹنگ میں چلا گیا۔ لیکن دو گھنٹے بعد واپس آ گیا۔ آج شنو کی والدہ کی قل تھی۔ اسپتال سے شنو کی کولیگ بھی آ چکی تھیں۔ گھر میں قرآن خوانی کا اور کھانے کا اہتمام کیا گیا۔ مغرب کی نماز سے قبل تمام سوگواران جا چکے تھے آج شنو گھر میں اکیلی تھی اور بہت اُداس اور افسردہ تھی کہنے لگی۔

''جنید میں اکیلی اس گھر میں کیسے رہ پاؤں گی۔ میں تو پاگل ہو جاؤں گی۔ مجھے کوئی مشورہ دو مجھے اس کرب سے نکالو' تنہائی مجھے مار ڈالے گی۔'' میں نے کہا۔

''اچھا یہ بتاؤ تمہاری شادی کرا دوں۔ جو بھی آپ کو پسند ہو مجھے بتاؤ میں خود اُس سے بات کروں گا۔'' کہنے لگی۔

''جنید میں نے تو مدتوں سے پسند ناپسند کا باب

بند کر رکھا ہے مجھے کسی بورڈنگ ہاؤس یا ہوسٹل میں شفٹ کرادو۔ میں رونق میں رہنا چاہتی ہوں تاکہ میرا دل لگا رہے۔"

"اچھا شنو یہ بتاؤ جب اسپتال میں پہلے دن میں نے آپ کا نام پوچھا تھا تو آپ نے انکار کیوں کر دیا تھا اور جلدی سے وارڈ سے باہر کیوں چلی گئیں تھیں؟" وہ کہنے لگی۔

"سچی بات تو یہ ہے کہ میرا پچھلے پندرہ برس سے مردوں سے واسطہ پڑ رہا ہے لیکن میرا کسی نے آج تک چہرہ نہیں دیکھا۔ مگر جب آپ نے میرا نام لے کر مجھے پکارا تو مجھے محسوس ہوا جیسے آج میرا پردہ اتر گیا ہو اور میرا چہرہ نہاں ہو گیا ہو۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اور میں بوکھلاہٹ میں تیزی سے باہر نکل گئی۔ گھر جا کر میں ساری رات آپ کے متعلق سوچتی رہی۔ اپنے ماضی کے متعلق سوچتی رہی مگر میری سوچیں کسی چہرے کا' کسی شخص کا عکس نہ بنا سکیں۔ لیکن میرے دل میں آپ کے لیے عزت ضرور پیدا ہو گئی کہ کیسے آپ نے ایک چھنگلیا کے نیچے تل سے مجھے پہچان لیا۔ کامیاب انسان ایسے ہی منزلوں کے نشانات ذہن میں رکھتے ہوئے ہزاروں میل کی مسافت طے کر جاتے ہیں۔ جنید میں بھی تمہاری منزل کا ایک ادنیٰ سا نشان ہوں۔ مجھے بھی اپنے ذہن میں' اپنے دماغ میں محفوظ کر لو اپنے سراپے میں پنہاں کر لو۔" شنو جذباتی ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں کی لڑیاں بکھیر رہی تھیں۔ اس کی آواز گلے میں پھنس رہی تھی ہچکیاں بندھ چکی تھیں۔ گھر میں آج اور کوئی بھی نہیں تھا ایک شنو تھی اور ایک میں' میں وسوسوں میں گھرنے لگا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ میں نے اُسے دلاسا دیا۔

"شنو...... پلیز رونا دھونا بند کرو بہت جلد تمام معاملات درست ہو جائیں گے۔ میں آپ کی قدم قدم پر معاونت کروں گا۔ اس وقت آپ سکون سے سوئیں صبح انشاء اللہ آپ کے متعلق سوچتے ہیں۔" وہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور میں ڈرائنگ روم میں سونے کی تیاری کرنے لگا۔

اتنے میں دروازے پر بیل بجی۔ شنو باہر گئی۔

"کون ہے؟"

"میں ہوں بیٹی...... امام مسجد فیض الرحمٰن۔"

"اندر آ جائیں...... بابا جی......" مولوی فیض الرحمٰن کے ساتھ تین آدمی اور دو عورتیں تھیں۔ مولوی صاحب پوچھنے لگے۔

"بیٹی ہم نے سوچا کہ آپ کی خیریت معلوم کر لیں۔ آپ کو کوئی پریشانی تو نہیں؟"

"نہیں بابا جی...... مجھے کوئی پریشانی نہیں۔" شنو نے جواب دیا۔

میں بھی اٹھ کر باہر آ گیا مولوی صاحب نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور کاندھے پر ہاتھ رکھ کر ذرا فاصلے پر لے گئے۔

"بیٹے جوان نامحرم مرد و عورت کا ساتھ رہنا مناسب نہیں...... اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو بیٹی شنو کو اپنے نکاح میں لے لو وہ بھی محفوظ ہو جائے گی اور تمہیں بھی اجر ملے گا۔"

"مولوی صاحب مجھے کوئی اعتراض نہیں آپ شنو سے اُس کی رائے لے لیں۔"

میں نے پورے اعتماد سے جواب دیا۔

اور یوں شنو کی رضامندی سے یہ نکاح پایۂ تکمیل تک پہنچا میں جانتا تھا کہ میرے گھر والوں کو کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ نکاح کے بعد میں شنو کو اپنے گھر لے آیا جہاں اُس کا بہت شاندار استقبال ہوا۔ ہماری اس غیر معمولی شادی کو اب 4 برس گزر چکے ہیں اور میں اب ایک بیٹے کا باپ ہوں مگر قسمت کیا ہوتی ہے اندھا بھروسہ کرتا ہوں۔

☆☆......☆☆

لاہور سے ارسال کردہ ایک ناقابل یقین کہانی

میم جی

اُس ذہین لڑکی نے اپنی بیماری کو بھی کیش کرلیا......

اور کسی کے دل اور گھر دونوں کی ملکہ بن گئی......

فرزانہ نگہت

کالج میں تھرڈ ایئر کی کلاسیں نئی نئی شروع ہوئی تھیں ہر روز دو دو تین تین نئی لڑکیاں سائنس اور آرٹس کی کلاسوں میں داخل ہو رہی تھیں۔ کوئٹہ کے اس چھوٹے سے گرلز کالج میں سائنس کا صرف ایک ہی سیکشن تھا۔ جبکہ آرٹس کے اے اور بی دو سیکشن تھے۔ میں بی سیکشن میں تھی جس میں لڑکیوں کی تعداد کم تھی اس لیے نئی داخل ہونے والی لڑکیاں اسی سیکشن میں بھیجی جا رہی تھیں۔ یہ کوئٹہ کے نواحی علاقوں سے پہنچنے والی لڑکیاں تھیں جن کی زیادہ تر تعداد ہوسٹل میں مقیم تھی۔

پھر ایک دن ایک نئی لڑکی ہماری کلاس میں داخل ہوئی۔ وہ اس قدر گورے گلابی رنگ رنگ کی تھی کہ کوئی انگریز یا امریکن معلوم ہوتی تھی۔ اس کے بال بھورے سنہرے اور آنکھیں اخروٹی تھیں۔ اس نے پاکستانی لباس شلوار قمیض پہن رکھا تھا دوپٹہ بھی لے رکھا تھا۔ وہ اردو بول رہی تھی پھر بھی صاف صاف غیر ملکی دکھائی دے رہی تھی۔ کلاس میں اُس کو میرے پاس جگہ ملی۔

میرے پوچھنے پر اس نے اپنا نام سارا بتایا اور یہ کہ اس کے والد فوج میں انجینئر تھے جو اسلام آباد سے ٹرانسفر ہو کر آئے تھے۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کے والد اور والدہ بھی اکیلے ہی تھے یعنی اپنے والدین کی اکلوتی اولادیں تھے۔ میرے پوچھنے پر کہ آیا اس کی والدہ یورپین یا امریکی تھیں اس نے مبہم سا جواب دیا۔

''ایسا ہی سمجھ لو۔''

میری طبیعت میں تجسس و کرید کا مادہ نہیں تھا اس لیے میں نے اس سے اور کچھ نہ پوچھا۔

آہستہ آہستہ اس کی کلاس کی تمام لڑکیوں سے واقفیت اور دوستی ہو گئی۔ بے تکلف اور شوخ فطرت لڑکیاں اسے سارا کی بجائے 'میم جی' کہہ کر مخاطب کرنے لگیں۔ ہوتے ہوتے یہ لقب کالج کی ہر لڑکی کی زبان پر چڑھ گیا۔ وہ پڑھائی میں خاصی تیز تھی۔ انگلش تو بہت عمدہ بولتی تھی۔ انگلش لٹریچر جیسے سخت اور مشکل مضمون میں وہ اکیلی ہی اسٹوڈنٹ تھی۔

اس کی چونکہ روز اول سے مجھ سے واقفیت اور دوستی ہوئی تھی۔ یہ دوستی تیزی سے پروان چڑھنے لگی۔ ہم جلد ہی ہم نوالہ و ہم پیالہ بن گئیں۔ طبقاتی فرق کے باوجود کہ اس کے والد کے مقابلے میں ابا جان معمولی سے ہیڈ کلرک تھے۔ ہماری دوستی خوب پھولنے پھلنے لگی۔ ہم دونوں چھاؤنی میں ملا کرتے تھے۔ لیکن حیرت ناک طور پر اس نے کبھی مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت نہ دی تھی۔ جبکہ میرے گھر آنے میں اسے کوئی ہچکچاہٹ مانع نہ ہوتی تھی۔ وہ بڑے فوجی افسر کی بیٹی تھی اس لیے اس کے ہمارے گھر چمچماتی کار میں آنے سے آس پڑوس کے کوارٹروں کے رہائشیوں پر خوب رعب پڑتا۔ والدہ حتی الامکان اس کی بہترین خاطر تواضع کرنے کی کوشش کرتیں۔ چھوٹے بہن بھائی بھی اس کے سامنے مودب ومہذب بنے رہتے۔ لیکن اس میں نہ غرور تھا نہ تکبر وہ سب کے ساتھ یوں گھل مل کر رہتی گویا ان میں سے ہی ایک ہو۔ وہ چھوٹے بہن بھائیوں کے لیے پھل مٹھائیاں کھلونے لاتی۔ ان سے بے حد پیار کرتی۔ والدہ تو اپنی حیثیت کے مطابق ہی کسی سے میل جول رکھنے کے اصول پر کاربند تھیں۔ اس لیے کبھی اس سے اس کے گھر جانے یا اس کی والدہ سے ملنے کی خواہش کا اظہار نہ کرتی تھیں۔ لیکن جب کبھی بھی میں اس سے اس کی والدہ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کرتی تو جانے کیوں وہ بڑی خوبی سے ٹال جاتی۔ اس نے



نہ کبھی مجھے اپنے گھر کا پتہ بتایا نہ آنے کی دعوت دی۔

مجھے اس پر حیرت ہوتی تھی۔ ناگواری بھی محسوس ہوتی تھی۔ لیکن میں نے اس پر کوئی کھوج کرید نہ کی نہ وجہ جاننے پر اصرار کیا۔ یوں ہماری دوستی چلتی رہی۔

ساری کلاس بلکہ کالج بھر کی لڑکیاں اب تک یہی سمجھتی چلی آ رہی تھیں کہ وہ واقعی کسی میم کی اولاد تھی جو یورپین یا امریکی ہو سکتی تھی۔ لیکن پھر جلد ہی مجھے اصل بات معلوم ہو گئی۔

ہوا یہ کہ کوئٹہ سے باہر جھیل کے کنارے پکنک کا پروگرام بنایا گیا۔ صرف تھرڈ ایئر کی لڑکیوں کو ہی اس پکنک پر جانا تھا۔ مقررہ دن ہم سب تھرڈ ایئر آرٹس اور سائنس کی لڑکیاں بس میں سوار ہو کر جھیل کنارے جا پہنچیں، وہاں ایک جگہ گھنے درختوں کے نیچے ہم نے ڈیرے ڈال دیے۔ دریاں وغیرہ بچھانے اور سامان وغیرہ ٹھکانے رکھنے کے بعد لڑکیاں ٹولیوں کی صورت میں اِدھر اُدھر گھومنے پھرنے اور کشتی میں جھیل کی سیر کا لطف اٹھانے لگیں۔ میں اور سارا جھیل کے کنارے سیر کرتے کرتے اس کے دور دراز کے حصے کی طرف نکل گئیں۔ اس جگہ بڑے بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے جو کچھ پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔

میں نے ایک پتھر پر بیٹھتے ہوئے شلوار کے پائنچے اوپر چڑھاتے ہوئے پاؤں پانی میں ڈبو دیے۔ پانی سرد تھا اور صاف و شفاف اس میں پاؤں چلاتے ہوئے مجھے بے حد لطف آنے لگا۔ میں نے سارا کو بھی پانی میں پاؤں ڈبونے کی دعوت دی۔ وہ کچھ ہچکچاتی ہوئی میرے قریب ہی ایک پتھر پر بیٹھ گئی اور شلوار کے پائنچے اوپر چڑھاتے ہوئے پاؤں پانی میں ڈبو دیے۔ اس کے پاؤں بے حد خوبصورت اور سفید تھے۔ پنڈلیاں ٹانگیں بھی بے حد سفید اور سڈول تھیں۔ انہیں توصیفی نظروں سے دیکھتے دیکھتے میری نظر ایک دم اس کی ایک ٹانگ پر پڑے بڑے سے بھورے سیاہ سے نشان پر پڑی۔ مجھے وہ کچھ عجیب سا معلوم ہوا۔ وہ کوئی دھبہ سا معلوم ہوتا تھا یا پھر جلنے کا نشان...... میں نے اس سے کہا۔

''سارا یہ تمہاری ٹانگ پر کیسا نشان ہے؟ یہ جلنے کا تو نہیں معلوم ہوتا۔'' وہ ایک دم ہی گھبرا گئی۔ اس نے جلدی سے ٹانگیں پانی سے نکالیں اور شلوار کے پائنچے نیچے کر لیے۔

''یہ...... یہ کچھ نہیں۔'' اس نے ٹالنے کی کوشش کی۔ میں سب کچھ سمجھ چکی تھی۔

''تمہیں پھلبہری ہوئی تھی نا سارا؟ دیکھو...... مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ...... میں تمہاری سچی اور مخلص دوست ہوں...... میں مرتے دم تک تمہارا یہ راز اپنے سینے میں دفن رکھوں گی۔''

اس کا چہرہ وفورِ خوف و گھبراہٹ سے بے حد سفید پڑا ہوا تھا۔ آنکھوں میں وحشت سی ہلکورے لے رہی تھی۔ وہ بار بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھیں۔ اس کا حلق شاید خشک ہو رہا تھا۔ جب ہی وہ بار بار منہ کھول کھول کر رہ جاتی تھی۔

''سارا......'' میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بے حد ملائمت و اپنائیت سے کہا۔

''مجھ پر بھروسہ رکھو سارا...... میں تمہاری سچی مخلص دوست ہوں۔ مخلص راز دان...... تم مجھے جو کچھ بتاؤ گی وہ عمر بھر میرے سینے میں دفن رہے گا۔'' اس نے گہری سانس لی اس کے چہرے کے تنے ہوئے عضلات ڈھیلے پڑ گئے۔ کیفیات اعتدال میں آنے لگیں۔

''تم ٹھیک سمجھیں فرحی۔'' اس نے دھیمے سے کہا۔ اس کا لہجہ کچھ ٹوٹا بکھرتا سا تھا۔

''مجھے واقعی پھلبہری ہوئی تھی۔ اس وقت میں بمشکل ایک سال کی تھی۔ میرا رنگ کھلتا سانولا تھا۔ پھلبہری کا پہلا داغ میری گردن کے پیچھے نمودار ہوا جس نے امی ڈیڈی کے ہوش اڑا دیے۔ انہوں نے علاج معالجے کے لیے دوڑ بھاگ شروع کردی۔ ہر علاج دوا تدبیر کر کے دیکھ لی مگر یہ داغ پھیلتا ہی گیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے جسم کے مختلف حصوں اور چہرے پر بھی جابجا ایسے ہی سفید داغ نمودار ہونا شروع ہوگئے۔ یعنی مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ یہ داغ اس تیزی سے پھیلتے گئے کہ صرف تین سال کے اندر سرتاپا سفید ہوگئی۔ صرف ٹانگ کی اتنی جلد جو تم نے دیکھی تھی سفید ہونے سے رہ گئی۔ بالوں پر حیرت ناک طور پر اس بیماری کا اثر نہ ہوا۔ وہ اسی طرح بھورے ہی رہے۔ میں اب ایسی بن چکی تھی کہ لوگوں کو مجھ پر میم ہونے کا گمان ہونے لگا تھا۔ امی ڈیڈی بھی تھک ہار کر میری اس حالت پر صابر و شاکر ہو کر بیٹھ گئے۔

ڈیڈی فوج میں تھے اور ان کی ہر دو تین سال بعد مختلف شہروں میں ٹرانسفر ہوا کرتی تھی۔ اس طرح میں مختلف اسکولوں میں جو کانونیٹ اسکول ہوا کرتے تھے تعلیم پاتی رہی۔ ان اسکولوں میں غیر ملکی اسٹاف ہوا کرتا تھا۔ اس لیے مجھے انہی کے لب و لہجے میں انگریزی بولنی آگئی۔

میں نے سینئر کیمبرج راولپنڈی سے کیا۔ میں وہاں جس کانونیٹ میں داخل ہوئی۔ وہاں کی لڑکیاں مجھے انگریز ماں کی اولاد سمجھتی تھیں۔ یہاں سے میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ مجھے اس فریب کو قائم رہنے دینا چاہیے۔ یعنی سب کو یہ سمجھنے دینا چاہیے کہ میری والدہ واقعی انگریز ہی ہیں۔ چنانچہ جب تک میں وہاں پڑھتی رہی لڑکیاں مجھے انگریز ماں کی اولاد سمجھتی رہیں۔ یہاں بھی لڑکیاں مجھے ایسا ہی سمجھتی ہیں۔ تم بھی...... میں تمہیں بھی اس فریب میں مبتلا رکھنا چاہتی تھی اس لیے باوجود تم سے ایسی دوستی کے تمہیں بھی اپنے گھر آنے کی دعوت نہ دی۔ نہ امی سے ملوایا...... مجھے بے حد افسوس ہے...... میں تم سے بے حد شرمندہ ہوں۔ فرحی جو تمہیں یوں دھوکے میں رکھا۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

میرے دل میں اس کے اس جھوٹ اور فریب پر جو غصے اور رنج کی لہر اٹھی تھی وہ اس کے اشکائے ندامت کے دھارے میں بہہ گئی۔ مجھے اس سے ہمدردی سی محسوس ہونے لگی۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''سارا...... مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں...... تم انشاء اللہ مجھے پہلے ہی کی طرح اپنی مخلص اور ہمدرد دوست پاؤ گی۔ تمہارا یہ راز ہمیشہ میرے سینے میں دفن رہے گا۔ چلو اب منہ دھولو پھر واپس چلیں۔''

اس نے جھیل کے صاف شفاف پانی سے منہ دھویا۔ پھر ہم وہاں سے واپس ہولیں۔ وہ اب کچھ خاموش خاموش سی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی خاموشی میں کچھ گریز و ہچکچاہٹ، کچھ ندامت و خجالت کی جھلک بھی تھی۔ پڑاؤ پر اس وقت باقی لڑکیاں بھی اپنے سیر سپاٹوں سے واپس پہنچ چکی تھیں۔ لہٰذا اب ناؤ نوش کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ جس کے بعد کچھ گانا بجانا کچھ کھیل تماشے ہوئے پھر لوگوں کی واپسی...... اس تمام عرصے میں سارا خاموش خاموش سی رہی۔ اس نے بہت کم باتوں اور ہنسی مذاق میں حصہ لیا اور برائے نام ہی کچھ

کھایا پیا۔ مجھ سے تو اس نے کوئی بات نہ کی بلکہ تمام وقت مجھ سے نظریں چرائے رہی۔ اس کی وجہ میں بخوبی سمجھ رہی تھی۔ اس لیے میں نے بھی خاموشی سادھے رکھی۔

اگلے دن وہ کالج سے غیر حاضر تھی۔ اس پکنک نے بہت سی لڑکیوں کو سخت تھکا دیا تھا اس لیے ان کے ساتھ اس کی غیر حاضری ایسی محسوس نہ ہوئی۔ لیکن پھر جب دو تین دن پھر ہفتہ بھر بھی گزر گیا اور وہ کالج نہ آئی تو مجھے کچھ فکر ہوئی۔ بد قسمتی سے مجھے اس کے گھر کا اتہ پتہ آج تک معلوم نہ ہو سکا تھا۔ ورنہ میں ضرور وہاں جا کر اس کی اس طویل غیر حاضری کی وجہ معلوم کر لیتی۔ پھر کچھ عرصہ بعد کلریکل آفس سے اس کی اس طویل غیر حاضری کی وجہ بھی معلوم ہو گئی۔ اس کے والد کی ٹرانسفر کھاریاں ہو گئی تھی اور وہ لوگ وہاں جا چکے تھے۔ اس کے یوں مجھ سے ملے بغیر رخصت ہو جانے کا مجھے بے حد افسوس ہوا۔ ایسی بے رخی اور بے اعتنائی کی مجھے اس سے ہرگز توقع نہیں تھی۔ مجھے اس پر کتنے ہی دنوں تک شدید دکھ اور افسوس ہوتا رہا۔

وقت گزرتا رہا۔ ہم سب بہن بھائیوں کی تعلیم مکمل ہو گئی۔ نوکریاں لگ گئیں۔ شادیاں ہو گئیں، گھر بس گئے۔ زندگی پہلے سے بھی زیادہ مصروف ہوتی گئی۔ پھر ایک دن خاندان میں اس خبر سے ہلچل مچ گئی کہ امی کی چچازاد بہن خالہ عذرا کے صاحبزادے خاور بھائی جو کئی سال پہلے بغرض تعلیم امریکہ سدھار گئے تھے اور عرصہ دراز سے کنوارے چلے آ رہے تھے اور امریکہ ہی میں مقیم تھے انہوں نے بالآخر شادی رچا لی تھی۔ اور اب وہ اپنے گھر والوں سے ملنے وطن آ رہے تھے۔ ان کی بیوی کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ امریکی تھیں جنہیں انہوں نے مشرف بہ اسلام کر لیا تھا اور ان کا اسلامی نام مریم رکھا تھا۔

خاور بھائی اور بھابی مریم کی آمد پر خالہ عذرا کے ہاں شاندار تقریب کا انعقاد ہوا جس میں تمام خاندان والے شریک ہوئے۔ ہم لوگ بھی زرق برق کپڑے پہن کر تیار ہو کر وہاں پہنچ گئے۔ عرصہ دراز بعد خاور بھائی سے مل کر ہمیں بے حد خوشی ہوئی۔ دبلے پتلے دراز قامت خاور بھائی اب خوب شاندار اور وجیہہ شخصیت کے مالک بن چکے تھے۔ وہ ہم سے ویسی ہی محبت اور خلوص سے ملے جو ان کی فطرت کا خاصہ رہا تھا۔ مہمانوں کی بھیڑ بھاڑ میں بھابی مریم ہمیں کہیں نہ دکھائی دیں۔ میں ان کی تلاش میں ادھر اُدھر نظریں دوڑا رہی تھی کہ وہ مجھے خاور بھائی کی چھوٹی بہن حمیرا کے ہمراہ سامنے سے سیڑھیوں سے اترتی دکھائی دیں۔ بے حد گورا رنگ تراشیدہ گھنے اخروٹی بال' سنہرے بارڈر والی آتشی گلابی ساڑھی میں لپٹا حسین سراپا۔

وہ سر جھکائے سیڑھیاں اتر رہی تھیں۔ انہیں دیکھتے دیکھتے میں کچھ چونکی اور گہری کریدتی نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔ سیڑھیاں اتر کر نیچے آنے کے بعد جب انہوں نے سر اُٹھا کر سامنے دیکھا تو میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ 'سارا' اس کے ساتھ ہی میں تیزی سے اس کی طرف بڑھ گئی اس نے دور سے مجھے اپنی طرف آتے دیکھا تو ٹھٹکی۔ اس کے چہرے کی رنگت ایک دم متغیر ہو گئی۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا اور اب شاید اپنا بھانڈا پھوٹنے کے خوف سے یوں وحشت زدہ اور سراسیمہ سی مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں مسکراتی ہوئی اس کے قریب پہنچی اور حمیرا سے بولی۔

"مبارک ہو حمیرا۔ بہت بہت مبارک ہو..... تمہیں ایسی حسین و جمیل بھابی ملیں۔ خاور

بھائی کا انتخاب واقعی لاجواب ہے۔'' حمیرا ہنس دی۔

''تم نے واقعی یہی کہنا تھا۔''

''بھابی......'' وہ سارا کی طرف مڑی۔

''یہ میری خالہ ثریا کی بیٹی ہیں فرحانہ...... میری ہم عمر...... ہم مذاق...... ہم نوالہ و ہم پیالہ......'' اس نے بمشکل تمام اپنے چہرے کے تاثرات چھپاتے ہوئے زبردستی کی مسکراہٹ ہونٹوں پر پیدا کی اور اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔

''بہت...... بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' اس کا لہجہ لڑکھڑاتا ہوا سا تھا۔ میں نے اسے گہری معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''مجھے بھی...... میم جی......'' اسے ایک کرنٹ سا لگا۔ اس نے اپنا ہاتھ واپس کھینچتے ہوئے گھبرائی ہوئی وحشت زدہ سی نظروں سے تیزی سے حمیرا کی طرف دیکھا۔ مگر وہ اس وقت وہاں چلی آنے والی اپنی چھوٹی بہن ارم کی طرف متوجہ تھی۔

''فرحی...... خدا کا واسطہ......'' وہ کھکھیا کر بولی۔ اس کی آواز میں التجا' استدعا' خوشامد اور خوف وگھبراہٹ کا ملا جلا امتزاج تھا۔

''میری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے فرحی۔''

''میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ تمہارا راز مرتے دم تک میرے سینے میں دفن رہے گا پھر تم یوں کیوں گھبرا رہی ہو؟ ہاں تم کیا مجھے یہ بتانا پسند کرو گی کہ تم سارہ سے مریم کیسے بنیں؟ خاور بھائی سے تمہاری شادی کیونکر ہوئی؟'' اس نے گہری سانس لیتے ہوئے گویا اپنی ٹوٹتی بکھرتی کیفیات کو اعتدال پر لانے کی کوشش کی۔ اس کی اڑی ہوئی رنگت واپس آنے لگی وہ کچھ پُرسکون سی دکھائی دینے لگی۔

''ضرور بتاؤں گی' تمہیں میں سب کچھ بتاؤں گی۔ ذرا فرصت اور آرام سے ابھی میں کافی دنوں تک یہاں ہوں۔'' اسی وقت شوخ و شنگ لڑکیوں کا ایک ریلا 'بھابی' بھابی' کرتا وہاں آ گیا اور وہ ان میں گھر گئی۔

اس تمام تقریب کے دوران پھر میرا اس سے سامنا نہ ہوا۔ اس رشتے کی خواتین اور لڑکیاں گھیرے رہیں۔ عذرا فاطمہ اس موقع پر خوب خوش دکھائی دے رہی تھیں۔ ان کے بیٹے بیٹیاں بھی مارے خوشی کے کھلے پڑ رہے تھے۔ ان 'بے چارے بے خبروں' کی زبانی مجھے جو کچھ معلوم ہوا وہ یہ تھا کہ بھابی مریم اپنے امریکی ماں باپ کی واحد اولاد تھیں جو انتقال کر چکے تھے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں انہوں نے کمپیوٹر سائنس کی اعلیٰ ڈگریاں لے رکھی تھیں۔ وہ نیویارک کے ایک کمپیوٹر سینٹر میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھیں۔ وہاں بہت سے مسلمان بھی کام کرتے تھے۔ جن سے انہیں اسلام کے بارے میں جاننے کا موقع ملا۔ انہیں اس دین میں دلچسپی معلوم ہوئی انہوں نے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا شروع کر دیں۔ اس دوران خاور بھائی اس سینٹر میں آ گئے۔ انہوں نے ان کی دین اسلام میں دلچسپی دیکھتے ہوئے انہیں اسلامی لٹریچر لا لا کر دینا شروع کیا۔ جس کے مطالعے نے انہیں قبول اسلام کی راہ دکھائی۔ یوں انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ان کا اسلامی نام مریم خاور بھائی ہی نے رکھا۔ اس کے بعد خاور بھائی سے ان کی شادی ہو گئی۔ خاور بھائی سے انہوں نے اردو بھی سیکھ لی۔

مجھے ظاہر تھا ان 'اطلاعات' پر ہنسی ہی آنی تھی۔ میں نے تو سارا کو اس کی بدلی ہوئی شخصیت کے

باوجود پہچان لیا تھا لیکن والدہ نہ پہچان سکیں۔ یہ بھی اللہ کا شکر تھا چھوٹے بہن بھائی تو اتنے سال گزرنے کے بعد اسے بھلا ہی چکے تھے۔ اب اسے کیا پہنچاتے؟''

شادی کے بعد خاندان بھر میں ان کی دعوتوں پارٹیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ہمارے گھر بھی ان کی شاندار دعوت ہوئی جس میں مریم یا سابق سارا عرف میم جی خوب زرق برق بیش قیمت غرارہ سیٹ اور نفیس زیورات سے آراستہ مجسمہ حسن و جمال بنی شریک ہوئیں۔ اس کا رویہ کچھ نارمل ہی تھا۔ وہ مجھ سے یوں ملی جیسے نئی نئی شناسائی ہوئی ہو کچھ لیے دیے پن کے ساتھ...... کچھ بے نیازانہ رکھ رکھاؤ کے ساتھ......اور یہ موقع محل کے عین مطابق تھا میں نے بھی جواباً اس کی جانب ایسا ہی رویہ روا رکھا۔

دعوت بخیر و خوبی اختتام کو پہنچی۔ وہ لوگ رخصت ہوگئے۔ وقتِ رخصت اس نے مجھ سے رسمی سے الفاظ ہی کہے۔

کچھ دن گزر گئے۔

اس دن میں گھر پر اکیلی تھی۔ جب اچانک ہی سارا مجھ سے ملنے چلی آئی۔ مجھے بے حد حیرت ہوئی۔

''سارا تم کیا اکیلی آئی ہو؟ خاور بھائی؟''

''ہاں میں اکیلی آئی ہوں خاور اپنے پرانے دوستوں کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا مجھے تمہارے گھر اتار دیں۔ مجھے معلوم تھا کہ تم اس وقت گھر پر اکیلی ہو۔ فوریہ (خاور بھائی کی چچازاد) نے مجھے فون پر اطلاع دی تھی کہ تمہارے گھر والے اس وقت ان کے ہاں آئے ہوئے ہیں۔ مجھے تم سے تنہائی میں ملنے کا انتظار تھا اس لیے مجھے یہ موقع غنیمت لگا۔''

ہم لاؤنج میں آکر صوفے پر بیٹھ گئیں۔

''یہ موقع بھی بہت عرصہ بعد ملا۔ ہاں اب تم مجھے یہ بتانا چاہو گی کہ تم سارا سے مریم کیسے بنیں؟ خاور بھائی سے تمہاری شادی کن حالات میں ہوئی۔''

''ہاں...... حالات ایسا رخ اختیار کر جائیں گے یہ میں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ ہاں کیا خالہ جان کو میرے بارے میں کوئی شک نہیں ہوا؟ انہوں نے کیا مجھے نہیں پہچانا؟''

''امی کی یادداشت کبھی ایسی نہیں رہی کہ وہ کسی کو زیادہ عرصے تک یاد رکھ سکیں وہ تو تمہیں کبھی کی بھول بھال چکیں اور چھوٹے بہن بھائی بھی...... لیکن ٹھہرو میں ذرا ملازمہ سے چائے وغیرہ کا کہہ آؤں۔''

چائے کے دوران ہمارے درمیان کالج کے گزرے خوشگوار دنوں کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس دوران میری گہری نظریں اس کا بھرپور جائزہ لیتی رہیں۔ وہ خوبصورت پہلے ہی سے تھی اب اس کی صحت بھی پہلے سے زیادہ بہتر لگ رہی تھی۔ جسم بھر گیا تھا چہرہ صحت مند اور اس پر چمک آگئی تھی۔ ہلکے نیلے رنگ کے لباس میں اس کی رنگت اور بھی اجلی اور نکھری ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ بھوری آنکھوں میں گویا ستارے جگمگا رہے تھے۔ گھنے اخروٹی بال خوبصورتی سے شانوں پر پڑے تھے وہ بے حد خوش اور مطمئن دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی ہنسی قہقہوں میں بھرپور زندگی کی کھنک تھی۔

پھر جب ناؤ نوش کا مرحلہ ختم ہوا اور ملازمہ آکر ٹرالی واپس لے گئی تو میں اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''ہاں اب بتاؤ اپنی داستان' لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تم بغیر کسی اطلاع کے مجھ سے ملے بغیر کوئٹہ سے کیوں چلی گئی تھیں؟ کیا ہوا تھا؟''

''اوہ......'' اس نے گہری سانس لی۔

"وہ امی کے ماموں زاد بھائی اچانک دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے تھے۔ وہ امی سے کافی بڑے تھے ان میں اور امی میں حقیقی بہن بھائیوں جیسا پیار تھا۔ ان کی موت کی خبر ملتے ہی امی بعجلت تمام مجھے ساتھ لے کر گجرات جا پہنچیں۔ وہاں ہمارا قیام طوالت پکڑ گیا۔ اسی دوران ڈیڈی کی ٹرانسفر راولپنڈی ہوگئی اور ہم وہاں چلے گئے تم سے الوداعی ملاقات نہ کر سکنے کا مجھے بہت افسوس رہا۔ بدقسمتی سے تمہارا ایڈریس بھی میرے پاس نہیں تھا جو میں تمہیں خط لکھ سکتی۔"

"بی ایس سی میں نے راولپنڈی سے کیا۔ اس کے بعد ڈیڈی کی ٹرانسفر کراچی ہوگئی۔ میں نے وہاں کراچی یونیورسٹی سے فرسٹ پوزیشن کے ساتھ ایم ایس سی فزکس کیا۔ جس پر مجھے بیرون ملک اعلیٰ تعلیم کے لیے اسکالرشپ مل گیا اور میں امریکہ چلی گئی۔ وہاں اوہائیو یونیورسٹی میں کمپیوٹر سائنس میں ایم ایس سی پھر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس دوران امی انتقال کر گئیں۔ ڈیڈی اب تنہا رہ گئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں وطن واپس آجاؤں اور ان کے پاس رہوں لیکن امریکہ میں میرا مستقبل نہایت روشن تھا۔ میں نے جو کچھ پڑھ رکھا تھا۔ اس کی قدر اپنے وطن میں نہیں ہوسکتی تھی۔

ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد مجھے ایک کمپیوٹر سینٹر میں اعلیٰ عہدے پر ملازمت مل گئی۔ مجھے سجا سجایا فلیٹ بھی ملا۔ گاڑی اور دیگر سہولیات بھی' میں نے اب ڈیڈی کو اپنے پاس بلوالیا۔ وہ اب بیمار رہنے لگے تھے۔ انہیں میری بہت فکر تھی کہ ان کے بعد میرا کیا بنے گا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں وہاں کوئی مسلمان مرد شریف دیکھ کر اس سے شادی کرلوں۔

میں بھی اب یہی سوچنے لگی تھی۔ وہاں سینٹر میں میری جان پہچان کے بہت سے مسلمان تھے جو مختلف ملکوں سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی میرے رفیق حیات کے معیار پر پورا نہ اترتا تھا۔ وقت یونہی گزرتا گیا۔ پھر ایک دن ڈیڈی اچانک ہارٹ اٹیک سے انتقال کر گئے۔ اب میں دنیا میں تنہا رہ گئی تھی۔ مجھے اب بڑی شدت سے تنہائی اور عدم تحفظ کا احساس ہونے لگا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ مجھے کسی مرد شریف کی رفاقت اس کا سہارا مل جائے۔ میری ہر دم اللہ سے یہی دعا رہنے لگی۔

پھر اللہ نے میری سن لی۔ خاور ہمارے سینٹر میں چیف ایگزیکٹو بن کر آگئے۔ وہ اوریگن سے ٹرانسفر ہو کر آئے تھے۔ غیر محسوس طور پر ہم ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ وہ پہلے مرد تھے جنہیں میں نے حسین صورت کے ساتھ ہی حسین سیرت سے بھی مزین پایا۔ ان کے اخلاق و کردار' رکھ رکھاؤ' پھر دینداری نے بھی مجھے بے حد متاثر کیا۔ طویل عرصہ امریکہ میں گزارنے کے باوجود ان کا دامن ہر قسم کی آلودگیوں اور آلائشوں سے پاک تھا۔ وہ پابند صوم و صلوٰۃ اور پکے مسلمان تھے۔ ان کے لیے میرے پسندیدگی کے جذبات میں جلد ہی عقیدت و محبت کا رنگ پیدا ہونے لگا۔ میں ان کی حسین و پاکیزہ رفاقت کے خواب دیکھنے لگی۔ وہ میرے بارے میں کیا محسوس کرتے تھے؟ کیا جذبات اور خیالات رکھتے تھے' یہ مجھے کبھی معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن ایک دن جب انہوں نے اپنے دفتر میں مجھ سے اچانک ہی شادی کی درخواست کر ڈالی تو میں بمشکل ہی اس پر یقین کر سکی۔ خواب یوں حقیقت کا روپ دھار لیں گے؟ یہ انتہائی ناقابل یقین سی بات لگتی تھی۔ مجھے اس پر جہاں بے پناہ خوشی ہوئی وہاں اس فکر و پریشانی نے بھی آگھیرا کہ میں آخر انہیں اپنے بارے میں کیا بتاؤں؟ انہوں نے اب تک کبھی مجھ سے میرے

ذاتی حالات کے بارے میں کچھ نہ پوچھا تھا۔ دفتر کے دوسرے لوگوں کی طرح انہیں بھی یہ معلوم نہ تھا کہ میرا مذہب کیا تھا؟ میں مغربی لباس پہنتی تھی۔ رنگ روپ بھی گوریوں جیسا تھا۔ نام سے بھی مذہب کا پتہ نہ چلتا تھا۔ میں نے انہیں فوری طور پر کوئی جواب نہ دیا اور سوچنے' فیصلہ کرنے کے لیے کچھ دن کی مہلت مانگی۔

کافی دنوں تک سوچ بچار کرنے کے بعد بالآخر میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے ایسے شریف اور سلیم الفرت مرد کو ہرگز دھوکے میں نہیں رکھنا چاہیے اور انہیں اپنے بارے میں سب کچھ سچ سچ بتا دینا چاہیے آگے جو اللہ کو منظور ہوا۔

چنانچہ ایک دن میں نے انہیں اپنے فلیٹ پر آنے کی دعوت دی۔ اس دن میں پاکستانی لباس شلوار قمیض میں ملبوس تھی۔ میں نے سر پر دوپٹہ بھی لے رکھا تھا۔ انہوں نے اس لباس کی بے حد تعریف کی اور کہا یہ لباس مجھ پر بے حد جچ رہا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ میرے یہ لباس پہننے کی وجہ یہ تھی کہ میں پاکستانی تھی اور مسلمان تھی۔ میں نے انہیں بلا لاگ و لپیٹ اپنے بارے میں سب کچھ کہہ سنایا۔ وہ چہرے پر ناقابل فہم سی مسکراہٹ سجائے سب کچھ سنتے رہے پھر جب میں سب کچھ کہہ چکی تو وہ مسکرائے اور بولے۔

"میں تمہارے بارے میں یہ سب کچھ پہلے سے ہی جانتا تھا سارا...... میں نے جب تمہیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا تو فیصلہ کر لیا تھا کہ تم ہی میری رفیقِ سفر ہوگی۔ میں نے تمہارے بارے میں تمام معلومات حاصل کر لی تھیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ تم پھلبہری میں مبتلا رہ چکی تھیں کیونکہ میں نے ایک دن اتفاقاً تمہاری ٹانگ پر وہ بھورا داغ دیکھ لیا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے مجھ سے کچھ چھپا کر نہیں رکھا۔ تمہاری صدق بیانی اور صاف گوئی مجھے پسند آئی۔ ہاں اب تمہارا کیا فیصلہ ہے؟ کیا راضی ہو اس شادی پر؟"

"ظاہر تھا میں نے اب کیا جواب دینا تھا۔ چنانچہ ہماری شادی ہوئی اور خوب دھوم دھام سے ہوئی جس میں پاکستانی کمیونٹی کے علاوہ دوسرے لوگوں نے بھی شرکت کی خاور اپنے گھر والوں پر ہرگز میری اصلیت یعنی میں گوری نہیں پاکستانی تھی اور برص زدہ رہ چکی تھی ظاہر نہ ہونے دینا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے انہیں فون پر یہ بتایا کہ انہوں نے ایک امریکی گوری سے شادی کر لی ہے اور اسے مشرف بہ اسلام کرتے ہوئے اس کا نام سارا سے مریم رکھ دیا ہے۔ ان کے گھر والوں نے اس پر بے حد خوشی کا اظہار کیا۔ پھر جب ہم یہاں پہنچے تو انہوں نے میری بڑی شاندار پذیرائی کی۔ مجھ پر بے حد فخر کا اظہار کیا مجھے بھرپور محبت و عزت دی۔" میں مسکرائی۔

"تمہارا واقعی اچھا انتظام ہو گیا میم جی...... تمہیں خاور بھائی جیسے حسین دل و دماغ والے شوہر مل گئے۔ نہایت محبت عزت کرنے والا سسرال بھی...... لیکن تمہارے رشتے دار؟ کیا ان سے تمہارے روابط نہیں؟"

"کبھی نہیں رہے۔ وہ ویسے بھی بہت دور دراز کے رشتے دار تھے۔ جن سے امی ڈیڈی کے زمانے میں بھی کبھار ہی ملنا ہوتا تھا۔ ڈیڈی کے امریکہ چلے جانے کے بعد تو ان سے روابط ہمیشہ کے لیے ہی ختم ہو گئے۔ اب تو وہ لوگ مجھے بھول بھال چکے ہوں گے۔ مجھے بھی ان میں سے کوئی بھی یاد نہیں رہا۔"

"یہ بھی تمہارے حق میں بہت اچھا ہوا...... اللہ سے دعا ہے کہ تم اپنے گھر میں ہمیشہ شاد و آباد رہو۔"

"آمین...... ثم آمین......"

☆☆......☆☆

چیچہ وطنی کی سرزمین سے ارسال کردہ سچ بیانی

تعارف

عبدالغفار عابد

بقلم خود

تخلیق کے عمل کو انسان نے اپنی ذات کے اظہار کے ساتھ جوڑ دیا۔ یوں تخلیقی عمل اظہارِ ذات کا ایک ذریعہ قرار پایا۔ اظہارِ ذات کے اس نظریے کے ساتھ اعلیٰ تر ادبی معیارات کے قوانین وضوابط ہیں۔ جنہیں تنقید کے میدان میں پذیرائی ملی اور تخلیقی ادب میں تنقید ایک الگ شعبہ بن کر سامنے آیا۔ اپنی ذات کے اظہار والے تخلیق کاروں نے ادب کو ایک روحانی سکون اور ذہنی ترفع کا سبب جانا اور اس سے فرحت حاصل کی یوں ادب برائے زندگی کا نظریہ وجود میں آیا۔ معاشرے میں مثبت تبدیلی کے لیے ادب کا اہم کردار رہا کیونکہ ادب کو انسانی زندگی میں بہتری اور انقلاب لانے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ ادب کے ذریعے معاشرے میں تبدیلی لانے کا عمل دراصل ایک سطح پر آسمانی کتابوں سے جڑ جاتا ہے۔ الہامی کتابیں بھی اسی لیے نازل کی گئی تھیں کہ ان سے انسان اور سماج میں تبدیلی لائی جاسکے۔ اس وقت کی تہذیب و معاشرت کو بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ تبدیل اور بہتر کیا جاسکے پیغمبروں نے اپنے وقت کے فرعونوں سے ٹکر لی۔ انسان پر ڈھائے جانے والے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی اور نچلے اور پسے ہوئے طبقے کو ایک جگہ اکٹھا کر کے ظالم کے خلاف کھڑا ہونے کا درس دیا۔ سچ بولنے اور قبول کرنے کی ترغیب دی آج لاکھوں لوگ ادب کے ذریعے اپنی زندگیوں کو بہتر کر کے کامیابی کی بلندیوں پر پہنچے' پرانا ادب کہاں تھا کہاں پہنچ گیا۔ اور جہاں پہنچا ہے وہاں کیوں اور کس طرح پہنچا یہ تمام سوال اہم ہیں سوچ بغیر کام نہیں چلتا مگر ہم چلانا چاہتے ہیں۔ ایک دنیا اس بات کو بخوبی سمجھتی ہے کہ جب تک سوچ تبدیل نہیں ہوگی تب تک کسی بھی شعبے میں کسی بھی سطح کی اصلاح کی راہ ہموار نہ ہوگی۔ جہاں مصنفین نے اپنی تحریروں میں قوموں کے عروج و زوال کی منظر کشی کی وہاں معاشرے میں پھیلی برائیوں کی نشاندہی کی اور محبت کی تعریف کر کے انسانیت کو زندہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی کچھ لوگوں کا ضمیر محبت کی مٹی اور خلوص کے پانی سے گوندھا جاتا ہے ایسے لوگ بہت نایاب ہوتے ہیں خاص کر

ادیب……

مدیرہ اعلیٰ سچی کہانیاں منزہ سہام مرزا کے حکم پر اپنے بارے میں کچھ آڑھی ترچھی لکیریں کھینچنے کی جسارت کررہا ہوں۔

پنجاب کی تحصیل چیچہ وطنی کے نواحی گاؤں جو نستھ باراں ایل میں پیدا ہوا جٹ برادری سے تعلق ہے شاید اسی وجہ سے چور کی قبر تک جاتا ہوں۔ بہن بھائیوں میں چوتھے نمبر پر ہوں۔ بچپن سے ہی سنجیدہ طبیعت کے مالک ہوں تعلیمی قابلیت میٹرک ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے زور قلم علیٰ ثانوی والا دیا ہوا ہے۔

میں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز 1998ء میں سچی کہانیاں کے پلیٹ فارم سے کیا۔ سچی کہانیاں کے علاوہ ماہنامہ آداب عرض، ماہنامہ صدائے دل اور ماہنامہ سلام عرض لاہور میں بھی لکھا گو کہ بہت کم لکھا مگر جو لکھا بہت کمال لکھا۔ ساہیوال ڈویژن سے شائع ہونے والے ہفت روزہ اخبار 'صدائے ظفر' کا ڈپٹی ایڈیٹر ہوں۔

اخبار کے چیف سلیم انجم نے کالم لکھنے کی ڈیوٹی بھی لگائی ہے۔ اخبار میں ایک کالم 'حکمت حیات ہوتی ہے یہ ہٹ دھرمی موت' شائع ہوا جسے پڑھ کر اس وقت کے ایم این اے چوہدری منیر اظہر نے مجھ کو اپنا پرنسل سیکریٹری رکھ لیا۔ مسلسل تین سال بہترین کالم لکھنے پر ایوارڈ ملتا رہا اسی طرح آداب عرض میں بھی میری تحریروں کو مسلسل تین سال ایوارڈ ملتا رہا۔ ریشم ایوارڈ اور سچی کہانیاں ایوارڈ بھی حاصل کر چکا ہوں۔ میں بہت سی کہانیاں لکھیں۔

جنہیں بہت پسند کیا گیا۔ خواتین کے مسائل پر بہت لکھا اور انہیں برابر کی جنس ماننے پر زور دیا اسی لیے خواتین خاص طور پر میری تحریر کو سراہتی ہیں۔ ویسے تو میں عام سا انسان ہوں خامیاں بھی ہیں اور اچھائیاں بھی مگر میری سب سے بڑی خامی ہے



دوسروں پر جلد بھروسہ کر لینا ہے اور اسی وجہ سے کئی بار دھوکا بھی کھایا۔ میری زندگی کا مقصد ادب سے ریا کاری اور جھوٹ کو دور کرنا ہے کیونکہ ادب سے بے ادبوں کا کوئی واسطہ نہیں۔ اکثر لوگوں کو میری بات شاید سخت لگتی ہے مگر مجھے بالکل بھی پرواہ نہیں کہ کوئی مجھے برا کہے کیونکہ مجھ سے تکلیف انہی لوگوں کو ہے جو دھوکا، فریب اور جعلسازی کی بیساکھیوں پر چلتے ہیں۔

میرا ماننا ہے کہ جہاں سے انسان کو عزت ملے اچھا نام ملے وہاں احسان فراموشی نہیں دکھائی چاہیے۔ سچ بولتا ہوں اور سچ ہی سننا پسند کرتا ہوں۔ اور میرا ماننا ہے کہ میرے حلقہ احباب میں بھی صرف وہی لوگ ہیں جو دھوکے باز نہیں، سازشی نہیں۔

عیدالفطر کے موقع پر مشہور ادیب و مصنف مہر پرویز احمد کے گھر ایک چھوٹی سی ادبی تقریب منعقد

ہوں۔ اس تقریب کے آخر میں اظہار خیال کرتے ہوئے میں نے کہا کہ آج جو ادب کی حالت ہے اس کے ذمہ دار قیمتاً الفاظ خریدنے والے ادیب ہیں۔ اگر ہم ادب کا عروج دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں جعلساز ادیبوں کی حوصلہ شکنی کرنا ہوگی جو سستی شہرت کے بدلے ادب کو بدنام کررہے ہیں۔

محبت کی جنگ ہارنے کے بعد گھر والوں کی مرضی سے 2016ء میں شادی ہوئی اور 2018ء میں اللہ نے بیٹے سے نوازا جس کا نام ہمدان غفار رکھا۔

سادہ رہن سہن کو پسند کرتا ہوں اور بہت شفیق دوست ہوں سچی کہانیاں سے بہت پرانا تعلق ہے یہی وجہ ہے کہ ماہنامہ سچی کہانیاں کے لیے بہت کام کرتا ہوں۔ شعر و شاعری سے بھی تھوڑا بہت شوق ہے یہاں اپنی ایک غزل کے چند شعر آپ کی نظر

بات کرنے کی اجازت ہے تو پھر سوچتے ہیں
ہاں تم کو ہم سے محبت ہے تو پھر سوچتے ہیں

اپنی فطرت ہے پرندوں سے بغاوت کرنا
شہر پر ان کی حکومت ہے تو پھر سوچتے ہیں

لب کشی یہاں جرم کے زمرے میں گنی جاتی ہے
اگرچہ وقت شہادت ہے تو پھر سوچتے ہیں

ہم تو یہ عمر گنوانے پہ تلے بیٹھے ہیں
ہاں تم کو اس کی ضرورت ہے تو پھر سوچتے ہیں

آخر میں اپنے پڑھنے والوں سے بس یہی گزارش ہے کہ اتنی ہمت ضرور پیدا کریں کہ غلط کو غلط کہہ سکیں اور پوری ایمانداری سے اپنی غلطی بھی مانیں یقین کریں...... معاشرے میں مثبت تبدیلی آنا شروع ہوجائے گی۔ اس دعا کے ساتھ اجازت لوں گا کہ اللہ پاک ہمیں راہ راست پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

☆☆......☆☆

غزل

بستی مری اجڑ گئی ہے قافلوں کے بعد
شہروں کو لوگ چل دیے ہیں رابطوں کے بعد

دل ڈھونڈتا ہے رنجشوں کے مختلف جواز
دل کو ہی پھر ملال ہوا فاصلوں کے بعد

منصف، تری عدالتوں کی شہرتیں بجا
پر میں اجڑ گیا ہوں ترے فیصلوں کے بعد

جذبے سبھی گرانیوں میں کھو گئے یہاں
خوشیاں مجھے ملیں ہزار عارضوں کے بعد

کرتا پھرے ضرور کسی شخص کو تلاش
ویراں اسٹیشنوں پہ کڑی ساعتوں کے بعد

قدرت کبھی بشر سے نہ مایوس ہوسکی
فطرت اگرچہ رو پڑی تھی حادثوں کے بعد

ویرانیوں پہ دھیان تو ناصرؔ کیا ذرا
بوتل اٹھا کے پی گیا بادہ کشوں کے بعد

ناصرؔ ملک

بلوچی ادب سے ماخوذ رومانوی داستان

ہانی اور شاہ مرید

محبت کی ایک یادگار داستان......30 سال کی ریاضت کے بعد محبوب کو پا کر بھی نہ پایا کیونکہ جس نے اللہ سے عشق کر لیا پھر اُس کو کوئی نہ بھایا......

عاکف عثمان

دُنیا کے تمام ممالک میں سے برصغیر پاک و ہند کے عوام الناس اپنی تمام سماجی پستی، افلاس، فقدانِ تہذیبی اِنضباط (ڈسپلن) اور معاشی ابتری کے باوجود جس منفرد صفت کے حامل ہیں وہ ''جذبہ محبت'' ہے۔ بلاشبہ محبت کی تخصیص یہاں تک محدود نہیں ہے۔ ہر انسان خواہ کسی بھی ملک یا خطے سے تعلق رکھتا ہو محبت کا ایک فطری جذبہ رکھتا ہے مگر تہذیبی یا سماجی نقطہ نظر سے جو محبت کا پَرتو یہاں کی دھرتی کے عوام میں کارفرما ہے وہ کہیں اور نہیں۔ یہی جذبہ ہمیں اپنی تہذیب، شادی بیاہ کی رسومات، شاعری، ادب اور فن میں جھلکتا دمکتا دکھائی دیتا ہے۔ مصورِ کائنات نے محبت کے اس لافانی کرشمے کو بنی نوع انسان کے علاوہ ہر ذی روح میں کسی نہ کسی مقدار سے ودیعت کیا ہوا ہے۔ یہ جذبہ انسان کو انسان سے ہی نہیں بلکہ اللہ سے ملانے کا واحد ذریعہ ہے۔ تقریباً ایک صدی پر محیط ہمارا ادب و آرٹ، مصوری اور فلمیں مختلف اشکال میں اس جذبے کی عکاسی اور ترجمانی کرتا چلا آرہا ہے اور کتنے دُکھی اور محروم دِلوں کی تسکین کا سہارا ثابت ہوتا ہے، ہوسکتا ہے کچھ اہلِ الرائے اس جذبے کو کسی قدر متنازعہ قرار دیں لیکن میرے خیال میں روحانی سکون کا حصول صرف جذبۂ محبت سے ہی ممکن ہے۔

جس طرح پنجاب اور سندھ تاریخی لحاظ سے محبت کی سچی داستانوں سے مالا مال ہے اور یہ رومانوی حکایتیں اپنے اندر اس قدر سحر انگیز اُمنگوں اور جذبوں کی حامل ہیں کہ وہ پورے پاکستان اور ہندوستان کے ادب و کلچر کا جزو لاینفک بن چکی ہیں مگر بدقسمتی سے ہمارے ملک کے دوسرے صوبوں کی اس نوعیت کی رومانوی کہانیوں کو وہ پروجیکشن نہیں ملی اور نہ ہی ان کی تعداد کا صحیح ادراک کیا جاسکا۔ ان میں بلوچستان زیادہ قابلِ ذکر ہے۔

اسی پروجیکشن کے فقدان کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم صوبہ بلوچستان کی ایک مشہور تاریخی محبت کی کہانی قارئین کے سامنے پیش کررہے ہیں

جو یقیناً بلوچی ادبی ورثے کی آگاہی کا ایک نمایاں ذریعہ ثابت ہوگا۔ یعنی ''حانی اور شاہ مرید'' کی محبت کی سچی داستان۔ (شاہ مرید کو کہیں شہہ اور سہہ مرید لکھا گیا ہے)۔ یہ داستان بھی پنجاب اور سندھ کی مشہور داستانوں کی مثل منظوم پیرائے میں بلوچی ادب کا حصہ ہے۔ اس کا ہیرو شاہ مرید بلوچی قبائل کے مروجہ رسم و رواج اور کلچر کا نمائندہ ہے اور وہاں کے لوگوں کی طرح وہ بھی خدا، برائی اور جبر وقدر کے فلسفیانہ تفکرات کا مظاہرہ کرتا محسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کی محبوبہ حانی اور اس کی محبت ایک پاکیزہ مگر ٹریجڈی سے معمور داستان ہے۔ کچھ دانشوروں نے ان کی محبت کو انگریزی ادب کی کہانی ''رومیو اور جیولیٹ'' کی محبت سے تشبیہ دی ہے۔ اس میں میرے نزدیک اختلافی پہلو یہ ہے کہ جو پاکیزگیٔ نفس، ایثار اور اصولوں کی پاسداری اس کہانی میں پنہاں ہے وہ یورپ کے کلچر میں کہاں۔

پندرھویں صدی کے بلوچی ادب کی تاریخ کے مطابق میر چاکر رند بلوچستان کی سرزمین کے سبی کے مقام پر بحیثیت حکمران متمکن تھا۔ اسے اپنی راجدھانی میں عوام کی بے پناہ محبت اور وفاشعاری حاصل تھی۔ ویسے بھی اس کے جانثار ساتھیوں کی ایک کثیر تعداد تھی مگر ان میں بالخصوص ہیری قبیلے کے سردار مبارک کا بیٹا شاہ مرید انتہائی پراعتماد اور مخلص ساتھی تھا۔ میر چاکر رند اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا جس کی اہم وجہ یہ تھی کہ وہ بلا



مبالغہ یکتا تلوار اور کمان کا ماہر تھا۔ تیر اندازی میں اسے ید طولیٰ حاصل تھا۔ اس فن میں اس کی انفرادی صفت یہ تھی کہ اس نے ایک اتنی پُر وزن فولادی کمان بنوا رکھی تھی جو اس کے سوا کوئی بہادر سے بہادر قبائلی نوجوان اس میں تیر ڈال کر چلانے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ اس کی اس انفرادی خصوصیت کا تمام سرداروں کا علم تھا۔

میر چاکر اور شاہ مرید شکار کے بہت شوقین تھے۔ ایک دن وہ دونوں جب شکار سے واپس آ رہے تھے تو اس قصبے کے قریب سے گزرے جہاں ان دونوں کی منگیتروں کے گھر تھے۔ تھوڑی دیر سوچتے رہے کیونکہ مرحلہ یہ درپیش تھا کہ ان کے گھر جائیں تو کیسے جائیں۔ مسلم خواتین بالعموم اور بلوچی قبائل کی خواتین بالخصوص رسم و رواج کے مطابق شادی سے پہلے اپنے منگیتروں کے سامنے ہرگز نہیں آ سکتی تھیں۔ لہٰذا انہوں نے سوچ بچار کے بعد اس کا یہ حل نکالا کہ دونوں اپنی اپنی منگیتروں کی بجائے ایک دوسرے کی مخالف منگیتر کے ہاں جائیں۔ یعنی شاہ مرید، میر چاکر کی منگیتر کے گھر اور میر چاکر، شاہ مرید کی منگیتر یعنی حانی کے گھر۔

چنانچہ میر چاکر رند حانی کے گھر آ گیا۔ اہلخانہ سے رسمی علیک سلیک کے بعد پیاس کی شدت کا بہانہ کرتے ہوئے پانی مانگا۔ حانی نے مہمان کی خاطر داری کرتے ہوئے عام برتن کی بجائے چاندی کے کٹورے میں پانی بھیجا جس پر کچھ تنکے تیر رہے تھے۔ تنکے دیکھ کر میر چاکر قدرے حیران ہوا تاہم احتیاطً ان کو انگلیوں سے ہٹا کر پانی پی لیا۔ دوسری جانب شاہ مرید، میر چاکر کی منگیتر کے گھر آیا۔ اور حسب پروگرام آمد کی وجہ پانی کی پیاس ظاہر کی۔ لہٰذا جب پانی کا کٹورہ پیش کیا گیا تو وہ ایک ہی سانس میں بلاتوقف سارا پانی پی گیا اور اس عجلتی عمل کے باعث پیٹ میں ایکدم ایسا درد اُٹھا کہ بے حال ہو گیا۔ شاہ مرید کی اس حالت کی وجہ یہ تھی کہ پانی میں کوئی تنکے وغیرہ نہ ہونے کے باعث وہ سارا کٹورہ گٹا گٹ نوش کر گیا تھا۔

میر چاکر نے اپنے کٹورے میں تنکوں کی وجہ حانی کی دانشمندی قرار دی اور اس کا یہ عمل میر چاکر کے لیے ذہنی کشش کا موجب بنا اور دل ہی دل میں وہ حانی کے عشق میں گرفتار ہو گیا۔ اس نے تہیہ کیا کہ وہ اب اپنی کم عقل منگیتر کی بجائے کسی طور حانی سے شادی کرے گا۔ ایسی ذہین اور دور اندیش خاتون بلوچ قبائل میں شاذ و نادر ہی ہوتی ہے۔ کیا ہوا اگر وہ میرے دوست کی منگیتر ہے میں اس کی نسبت اعلیٰ حیثیت اور حکمرانی کا حامل ہوں۔ ویسے بھی کہا جاتا ہے کہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔

اب میر چاکر شب و روز اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کی سوچتا رہتا۔ اس نے کچھ دنوں بعد ایک بڑی دعوت کا اہتمام کیا جس میں تمام قبائل کے چیدہ چیدہ قبائلی سرداروں کو بالخصوص دعوت دی۔ اس تقریب میں حسب رواج معروف شعراً کو بھی بلایا گیا جنھوں نے مختلف قبیلوں کے سورماؤں کی بہادری کے قصے منظوم پیرائے میں بیان کر کے سرداروں کی تواضع کی۔ کثرت نوشی کے باعث جب تمام سردار مدہوشی کی کیفیت میں تھے تو میر چاکر نے اپنی خفیہ رقابت کے پس منظر میں تمام سرداروں سے ایک عہد کی تکمیل کا منصوبہ پیش کیا جو درپردہ مروجہ خاندانی بہادری کے مظاہرے کی ایک صورت تھی۔ یوں وہاں موجود سب سرداروں نے اپنی

اپنی صفت بیان کرنا شروع کر دی۔ لہٰذا ایک سردار میر جادو نے پیشکش کی کہ جو کوئی بھی یہاں موجود اس کی داڑھی کو چھولے وہ واپس مجھ سے بچ کر نہیں جا سکے گا۔ میں اس کا سر کاٹ کے رکھ دوں گا۔

ایک دوسرے سردار نے عہد کیا کہ جو کوئی میرے دوست ہادی کو قتل کرنے کی جرأت کرے گا میں اسے قتل کر دوں گا۔ ایک سردار میر حیبی تن نے قسم کھائی کہ جس کا اونٹ میرے اونٹوں کے باڑے میں آگیا میں اسے واپس نہیں کروں گا۔ شاہ مرید نے ان سب کی دلیری کے اعلانات سُن کر ان میں سبقت لے جانے کی غرض سے اور اپنی محبوبہ حانی کی محبت کے سحر میں آ کر یہ اعلان کیا کہ جو میری شادی کے موقع پر مجھ سے جو کچھ بھی مانگے گا میں اسے ہرگز مایوس نہیں کروں گا۔ آخر میں میر چاکر رند نے قسم کھائی کہ وہ زندگی بھر جھوٹ نہیں بولے گا خواہ کیسی بھی مشکل صورت کا اسے سامنا کرنا پڑے۔ اور مستقبل کے چند مشکل حالات نے یہ ثابت کیا کہ وہ ہر صورت راست گوئی کے عہد پر قائم رہا۔

میر چاکر نے ان سب سرداروں کے عہد اور قسموں کو آزمانے کے لیے سب سے پہلے میر جادو کے تقریب میں موجود ایک ۶ سالہ بیٹے کو بُلایا اور اسے اپنے باپ کی داڑھی کو بڑھ کر چھونے کا کہا۔ لہٰذا بچے نے لاعلمی کے تحت بڑی معصومیت سے میر چاکر کے حکم کی تعمیل کی اور بڑھ کر باپ کی داڑھی کو چھولیا۔ جادو نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ اور بیٹے کو دور بھاگنے کا اشارہ کیا۔ میر چاکر نے اس کی تذبذب کی یہ کیفیت دیکھتے ہوئے بچے کو پکڑ کر اور اسے دوبارہ اپنے باپ کی داڑھی کو چھونے پر زور دیا۔ بچے نے کسی انجام سے بے خبر دوڑ کر اس کی داڑھی کو دوبارہ دونوں ہاتھوں سے پیار کے انداز میں پکڑ لیا۔ مجمع میں ایک سناٹا چھا گیا۔ اور سب جادو کو جواب طلب نظروں سے گھورنے لگے۔ جادو کی حالت عجیب تھی۔ ایک طرف اپنے ننھے لختِ جگر کی جان تھی اور دوسری طرف تمام سرداروں کے سامنے عہد کا پیمان دامنگیر تھا۔ اگر بچے کی حمایت کرتا تو تمام عمر قبائل کی نظروں میں قابلِ نفرت ٹھہرتا۔

لہٰذا جیسا کہ ہٹ دھرم قبیلوں کی صدیوں سے اس نوعیت کے عہدوں کی رسم چلی آ رہی تھی اس نے کانپتے ہاتھوں سے تلوار نکالی اور بچے کا سَر تن سے جُدا کر دیا۔ اس طرح میر چاکر نے دوسرے سرداروں یعنی بیرگ اور حیبی تن کو آزمایا جن کی زیادہ تفصیلات ناپید ہیں، اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دونوں بھی اپنے اپنے حلف کی تکمیل پر پورے اُترے

اب صرف شاہ مرید کے عہد کو آزمانے کا انتظار تھا۔ ایک دن اس نے اپنی شادی کی تقریب میں تمام قبائلی سرداروں کو مدعو کیا اور ان کے لیے مشہور شاعروں اور موسیقاروں کو بُلایا۔ جام و شراب اور موسیقی کی دھنوں نے سب سرداروں پر مدہوشی کی کیفیت طاری کر دی تھی۔ تقریب کے اختتام کے قریب میر چاکر نے شاہ مرید کو اس کا دیا ہوا عہد یاد دِلایا۔ شاہ مرید اس وقت خود بھی ایک سرشاری اور مسرت کی لہر میں تھا۔ اس نے کہا ہاں آج جو کچھ مانگو گے میں دے دوں گا۔ میر چاکر نے دوستی کے ناطے براہِ راست حانی کو مانگنے کی بجائے شعراء کے توسط سے یہ مطالبہ دہرایا کہ وہ حانی سے دستبردار ہو کر اس کا نکاح میر چاکر رند سے کر دے۔ شاہ مرید یہ مطالبہ سُن کر ایک دم سکتے میں آ گیا۔ ایسی خواہش تو اس کے دل و دماغ

میں بھی نہیں تھی۔ حانی کے سوا وہ دُنیا کی قیمتی سے قیمتی چیز قربان کرنے کے لیے آمادہ تھا مگر یہ مطالبہ گویا اسے زندہ درگور کرنے کے مترادف تھا۔ اس نے مندرجہ ذیل اشعار میں اس مطالبے کو واپس لینے کی درخواست کی۔

میں حانی سے منگنی پر دست بردار نہیں ہوں گا
اب میرے نام کے ساتھ اس کا بھی نام جو ہے
وہ میرے چچا کی نوجوان دُختر ہے
آپ لوگ مجھ سے میری آہنی کمان لے لو
آپ لوگ مجھ سے میرا دو دھاری خنجر لے لو
آپ لوگ مجھ سے میری آراستہ گھوڑی لے لو
یا میرا خوبصورت گھوڑا حاضر ہے
یا میرا خوش نما مزین اونٹ حاضر ہے
شاہ مرید یہ سب کچھ خوش دلی سے دے گا
لیکن محبوبہ بھی بھلا تحفۃً دی جا سکتی ہے

لیکن موسیقاروں اور شاعروں کو میر چاکر کی جانب سے جو پٹی پڑھائی گئی وہ اسی ضد پر قائم رہے۔ حانی کو جب معلوم ہوا تو وہ بھی تڑپ اُٹھی۔ اس نے شاہ مرید کو سخت ملامت کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایک عورت کی تذلیل ہے۔ بھلا عورت کوئی ایسی جنس ہے جس کا تبادلہ یا سودا کیا جائے۔ لیکن شاہ مرید اب اپنے عہد پر سخت پچھتا رہا تھا مگر روایت کے تحت بے بس تھا۔

لہٰذا شاہ مرید نے خود پر جبر کرتے ہوئے اور ایفائے عہد کے انکار سے بلوچی قبائل کے سرداروں کی نگاہ میں تاحیات قابلِ نفرت ہونے سے بچنے کے لیے حانی سے دست برداری ظاہر کر دی اور بعد ازاں رسم و رواج کے مطابق میر چاکر اور حانی رشتہ اَزدواج میں منسلک ہو گئے۔ حانی کو گنوا کر شاہ مرید پر ایک دیوانگی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ آخر ایک شب وہ خاموشی سے جنگلوں میں نکل گیا اور حانی کی یاد میں اپنی محرومی اور جذبات کو اشعار میں ڈھالتا رہا۔ جنھیں آج بھی بلوچستان کے موسیقار اسی طرح دردمندی اور سوز سے گا کر بلوچی عوام کے دل گرماتے ہیں جیسے پنجاب میں ہیر گا کر ایک روحانی سرور حاصل کیا جاتا ہے۔

میر چاکر سے رقابت رکھنے والے سرداروں نے اپنے پسندیدہ موسیقاروں کے ذریعے شاہ مرید کے حانی کے فراق میں لکھے گئے اشعار نغموں میں گا گا کر اس کی تڑپ میں مہمیز کا کام کیا۔ اس عمل سے تمام بلوچی سردار جان گئے کہ وہ حانی کو چھوڑنے کے باوجود میر چاکر رند کی بیوی کے غم میں اشعار پڑھ کر میر چاکر کی بالواسطہ تحقیر کر رہا ہے۔

شاہ مرید کے والد کو جب اطلاع دی گئی تو اس نے بیٹے کو سختی سے ڈانٹتے ہوئے اس عمل سے باز رکھنے کی لاکھ کوشش کی لیکن اس پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ وہ بستی سے باہر نکل گیا۔

لہٰذا اپنے اہلخانہ اور قبیلے والوں سے کنارہ کش ہو کر وہ دور جنگلوں میں جا نکلا۔ اسے سرِ راہ ایک درویش ٹولہ ملا جو مکہ کی طرف رواں دواں تھا۔ چنانچہ وہ بھی اُن میں شامل ہو گیا اور مکہ پہنچ گیا۔ شب و روز عبادت میں مشغول ہو گیا۔ حانی کی یاد اب خدا کی محبت میں بدل گئی اور یوں اس نے مکہ مکرمہ میں زندگی کے تیس (30) سال گزار دیئے۔

ایک روز ایک قافلہ مکہ سے واپس لوٹ رہا تھا تو شاہ مرید بھی ان کی ہمراہی میں واپس وطن لوٹ آیا اور اسی طرح جنگلوں میں بسیرا اختیار کر کے وہ درویشوں اور فقیروں کے گروہ میں شامل ہو گیا۔

ایک دن وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میر

چاکر کے ڈیرے پر آ پہنچا لیکن اس کی بدلی ہوئی ہیبت دیکھ کر کوئی بھی اسے نہ پہچان سکا مگر حانی نے اسے اس حلیے میں بھی پہچان لیا مگر اسے راز رکھا۔

میر چاکر نے ایک دن اپنے ڈیرے کے عقب میں سرداروں کو مدعو کر کے مقابلہ نیزہ بازی کے کھیل کی تقریب کا اعلان کیا۔ شاہ مرید کو جب اس کا علم ہوا تو وہ بھی اس تقریب میں چلا آیا اور اس نے بھی اس مقابلے میں شرکت کی خواہش ظاہر کی۔

ایک فقیر کو پھٹے پُرانے پیراہن میں اور کمر تک لٹکتے اُلجھے بالوں میں دیکھ کر وہاں موجود سردار اُس کی درخواست پر خوب ہنسے تاہم اس کی مزید تذلیل کا لطف اٹھانے کے لیے اسے مقابلے میں شرکت کی اجازت دے دی لیکن جلد ہی ان کا تمسخر حیرت میں بدل گیا۔ جب شاہ مرید نے یکے بعد دیگرے کئی کمانیں اُڑا ڈالیں۔ سراسیمگی کی خفت کو مٹانے کے لیے ایک سردار نے شاہ مرید کی وہ آہنی کمان منگوا کر اس فقیر کو چلانے کے لیے کہا۔

اس نے پہلے تو اپنی اس کمان کو پیار سے چُوما۔ آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے لیکن جلد ہی جذبات پر قابو پاتے ہوئے اس کمان سے ایک ایک کر کے تین تیر اس طرح چلا دیئے جس طرح وہ آج سے تیس سال قبل چلایا کرتا تھا۔ کیونکہ آج تک شاہ مرید کے علاوہ کوئی بھی سردار اس بھاری بھرکم کمان سے تیر چلانے کی ہمت نہیں کر سکا تھا لہٰذا سارے قبائلی سردار ایک بظاہر دُبلے پتلے فقیر کی اس کامیابی پر انگشت بدنداں رہ گئے۔

انھیں یہ شک ہو گیا کہ کہیں یہ فقیر شاہ مرید ہی نہ ہو۔ کسی کی تجویز پر میر چاکر نے اس کی کسی واضح شناخت کا حانی سے پوچھا۔ اس نے شاہ مرید کے بازو پر ایک نشان کی نشاندہی کر دی۔ کیونکہ خود شاہ مرید نے اپنی حقیقت ظاہر کرنے سے قطعاً انکار کر دیا تھا۔ لہٰذا جب حانی کے بتائے ہوئے نشان کی تصدیق ہو گئی تو اس نے بھی تسلیم کر لیا۔

میر چاکر نے جب شاہ مرید کی یہ بدلی ہوئی حالت دیکھی اور اسے اپنی حالت کی اس قدر لاپرواہی کا اندازہ کر کے یہ احساس جاگا کہ اتنی مدت بعد بھی وہ اپنی محبت کو فراموش نہیں کر سکا اور نہ ہی حانی نے اپنے شوہر کو دل و جان سے اب تک قبول کیا ہے۔

لہٰذا اس نے اسی وقت تمام سرداروں کی موجودگی میں حانی کو طلاق دے دی اور اپنی چالبازی سے حانی کو پانے پر پچھتانے اور شرمندہ ہونے لگا۔

لہٰذا رسمی اطوار ادا کرتے ہوئے حانی کی شاہ مرید سے شادی کر دی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ حانی ،میر چاکر سے اتنا عرصہ نکاح میں منسلک رہنے کے باوجود باعصمت رہی۔ شاہ مرید اس کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک تو ہو گیا مگر تمام خواہش کے باوجود اپنی پہلی سی حانی سے محبت کا اثر نہ ہو سکا۔

مکہ مکرمہ کی تیس سالہ ریاضت اور درویشوں کی مصاحبت کے زیر اثر وہ تمام دُنیاوی تحریصات اور خواہشات سے لاتعلق ہو چکا تھا۔ لہٰذا ایک دن اس نے اپنے والد کے باڑے سے ایک سفید اونٹ نکالا اور رات کے اندھیرے میں حانی کو سوتا چھوڑ کر ایسا غائب ہوا کہ پھر بھی کسی کو اس کی کوئی خبر نہ ہوئی۔ بلوچوں کا اس کے بارے میں اب بھی یہ عقیدہ ہے کہ ”تا جہاں است۔ آں شاہ مرید است۔“

☆☆......☆☆

کوئٹہ سے ارسال کردہ تکلیف دہ حقیقت

ستم گزیدہ

وہ اچھی عورت تھی شوہر سے ٹوٹ کر محبت کرتی تھی مگر اس کی جان بچانے کے لیے جو قدم صفیہ نے اٹھایا اس کی کوئی مذہب معاشرہ اجازت نہیں دیتا اور پھر مراد تو سیدھا سادا دیہاتی مرد تھا......

عمران قریشی

اُس کا جسم پسینے سے تر تھا۔ کتنی دفعہ کدال اُس کے پسینے سے بھرے ہوئے ہاتھوں سے پھسل کر نیچے گری۔ لیکن اُسے پرواہ نہیں تھی۔ بیلوں کی جوڑی قریبی درختوں کے سائے میں کھڑی تھی۔ وہ زمین کو برابر کرنے کے بعد اُس پر ہل چلا چکا تھا۔ اب صرف کھیتوں میں داخل ہونے والے پانی کے راستے والی نالیوں کو برابر کرنا باقی رہ گیا تھا۔ یہ زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔ لیکن اب اُس کا جسم تھکن سے ٹوٹنے لگا تھا اور اُسے زوروں کی بھوک بھی لگ رہی تھی۔ عموماً صفیہ ایک بجے کے بعد کھانا لے آیا کرتی تھی۔ لیکن آج اُسے کچھ دیر ہوگئی تھی۔

تاہم ابھی بہت وقت باقی تھا۔ اس نے رہٹ پر جا کر پانی کے چھینٹے مارے۔ پھر شہتوت کے گھنیرے درخت کے نیچے چار پائی ڈال کر لیٹ گیا اور صفیہ کے متعلق سوچنے لگا۔ وہ ایک مخلص اور پیار کرنے والی بیوی تھی۔ مراد کی ہر خواہش کو پورا کرنے کے لیے اپنی جان کی بازی لگانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی تھی۔ وہ بھی صفیہ سے ٹوٹ کر محبت کرتا تھا۔ تاہم کبھی کبھی اُسے اولاد نا ہونے کا غم ضرور ستاتا تھا۔ لیکن اِس خواہش کو پورا کرنا اُس کے اختیار سے باہر تھا۔ وہ چک 84 کا معمولی کسان تھا۔ زمین کسی اور کی تھی۔ بیلوں کی جوڑی ہمسائے سے مستعار لی گئی تھی۔ کدال اور بیلچہ گاؤں والوں کے تھے۔ تاہم گھر اُس کی ملکیت میں تھا۔ اُسے دوبارہ بھوک نے ستانا شروع کر دیا۔

صبح منہ اندھیرے ناشتہ کرنے کے بعد سے اب تک اُس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ صفیہ نے آنے میں بہت دیر کر دی تھی۔ اُس نے چار پائی سے اُٹھ کر کھیتوں کے درمیان میں جاتے ہوئے کچے راستے کی طرف دیکھا۔ وہ کھیتوں کی طرف آ رہی تھی۔ اُس کی عمر صرف بائیس سال تھی۔ وہ مراد سے دس سال چھوٹی تھی۔ کبھی کبھی مراد کو ایسا لگتا تھا کہ وہ اُس سے محبت نہیں بلکہ عزت کرتی تھی۔ اُس نے اس کا اظہار اپنے رویے سے نہیں

کیا تھا۔ تاہم مراد کو ایسا ہی محسوس ہوتا تھا۔ شادی کو سال سے زیادہ کا عرصہ ہونے والا تھا۔ اُن دونوں کے درمیان کبھی بھی لڑائی جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ اُس کی دلی خواہش تھی کہ وہ اُس کے ساتھ لڑے اور بہت سے کاموں کو کرنے سے صاف انکار کردے پھر جب وہ ناراض ہوکر اپنے کمرے کی چارپائی پر منہ پھلا کر جابیٹھے۔ تب مراد اُسے منانے کے لیے منت سماجت کرے۔ لیکن صفیہ مختلف فطرت کی حامل لڑکی تھی۔ شوہر کا حکم ماننا اُس نے اپنے اوپر فرض کرلیا تھا۔ صبح منہ اندھیرے جب مراد سوکر اٹھتا تھا تب وہ پہلے سے اٹھ کر ناشتہ تیار کرچکی ہوتی تھی۔ صحن کے قریب پانی کی بالٹی اُس کی منتظر ہوتی تھی۔ مراد منہ ہاتھ دھوتا اور برگد کے درخت کے نیچے رکھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگتا۔ وہ چارپائی کے دوسرے سرے پر بیٹھ کر پنکھا جھلتی اور اُسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھتی رہتی تھی۔ آج اُس نے آنے میں کافی دیر کردی تھی۔ مراد نے دوبارہ کھیتوں کی طرف آنے والے راستے پر نگاہ دوڑائی۔ وہ کافی قریب آچکی تھی۔ اُس کی سرخ شلوار قمیض ٹرین کے سگنل کی طرح دور سے صاف دکھائی دے رہی تھی۔ سر پر چھوٹی سی ہانڈی اور ہانڈی کے اوپر رکھی ہوئی چنگیر میں مکئی کی روٹی اور روٹیوں کے ہمراہ نمک میں لتھڑا ہوا پیاز ...... سیدھے ہاتھ میں لسی سے بھرا ہوا مٹکا...... اور الٹے ہاتھ میں رنگین پنکھا' وہ لچکتی مٹکتی پگڈنڈی پر چلتی



ہوئی کھیتوں کی طرف آ رہی تھی۔ اس کے انداز میں عجیب قسم کا نخرہ تھا اور کیوں نا ہوتا' چک 84 کی کوئی بھی لڑکی اُس کے حسن کا مقابلہ نہیں کر پاتی تھی۔ سیاہ لچھے دار گھنے بال جسے وہ سرخ پراندے کے ذریعے باندھے رکھتی تھی۔ یہ پراندہ اس کی کمر سے نیچے تک جاتا تھا اور چال کے دوران کسی غیر معمولی لمبے سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا لہراتا تھا۔ چہرے کا رنگ سانولا' آنکھیں کالی سیاہ اور بڑی بڑی' ہونٹ سیب کی کاشوں کی مانند اور ناک ستواں تھی۔ وہ حسن کا بہترین مجموعہ تھی۔ شہتوت کے درخت کے پاس پہنچنے کے بعد اُس نے مسکراتے ہوئے لسی کے گھڑے کو ایک طرف رکھا پھر ہانڈی اور روٹیوں والی چنگیر چارپائی پر رکھنے کے بعد پنکھے سے ہوا جھلنے لگی۔

''تُو نے آنے میں بہت دیر کر دی میں کب سے تیرا انتظار کر رہا تھا۔'' مراد نے نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''ماسی برکتے آئی ہوئی تھی۔ وہ گھر سے باہر گئی تو میں نے جلدی جلدی روٹیاں پکائیں اور لسی کا مٹکا اُٹھا کر کھیتوں کی طرف آ گئی۔''

''ماسی کیوں آئی تھی' وہ تو دھوپ میں باہر نکلنے سے گھبراتی ہے۔''

''میں نے خود اُسے بلایا تھا۔ مجھے تیرا کھیتوں میں خجل خوار ہونا اچھا نہیں لگتا۔ ماسی کا رشتے دار ٹریکٹر کرائے پر دیتا ہے۔ میں نے اُس سے بات چیت کر لی ہے۔ وہ بھاڑے کی رقم فصل بک جانے کے بعد لے گا۔ تجھے ٹریکٹر چلانا آتا ہے۔''

مراد نے اقرار میں سر ہلایا۔

''آتا تو ہے...... لیکن مجھے اُس کی ضرورت نہیں ہے۔ خواہ مخواہ کا خرچہ' جتنا منافع وہ لے گا اُس سے تو میں علیحدہ زمین خرید سکتا ہوں۔'' صفیہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پھر گلاس میں لسی ڈالتے ہوئے بولی۔

''تو تمام زمینوں پر ہل چلا بھی لے تو بھی زمین کا چھوٹا سا ٹکڑا نہیں خرید سکتا۔ ماسی کہتی ہے کہ وہ زیادہ بھاڑا نہیں لے گا۔ اور چونکہ ماسی کا رشتہ دار ہے اس لیے ہمارے ساتھ اس کے علاوہ بھی رعایت کرے گا۔ میں جب تیرے پسینے سے بھرے ہوئے جسم کو دیکھتی ہوں تو سوں رب دی میرا دل کٹ کر رہ جاتا ہے۔'' مراد نے ٹھنڈی لسی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

''جیری تیری مرضی میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ دیکھ بھال کر ماسی سے بات چیت کرنا...... کہیں ایسا نہ ہو ٹریکٹر کا بھاڑا دینے کے بعد ہمارے پاس پھوٹی کوڑی بھی باقی نہ بچے...... لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔'' صفیہ نے اُسے دلاسہ دیا۔

''تو فکر نہ کر میں بات چیت کر لوں گی۔ مجھے تو صرف تیری ہاں سے غرض تھی۔ ورنہ اب تک ٹریکٹر کھیتوں میں کھڑا ہوتا۔'' کھانا کھانے کے بعد مراد چارپائی پر لمبا ہو کر لیٹ گیا۔ صفیہ نے اُس کے پاؤں دبائے اور اُس کے سو جانے کے بعد برتن سمیٹ کر گاؤں کی طرف چلی گئی۔

شام کو گاؤں کی طرف جاتے ہوئے مراد کی مڈبھیڑ چوہدری کے لڑکے کے ساتھ ہوئی۔ وہ گھوڑے پر کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔ مراد کو دیکھ کر اُس نے گھوڑے روک دیا۔ پھر اُس کے گرد چکر لگاتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولا۔

''چوہدریوں کے جھوٹے برتنوں میں کھانا کھاتے ہوئے تیری عمر گزر گئی۔ اب جھوٹی عورت کو گھر میں رکھنے میں تجھے عار محسوس نہیں ہو رہی ہے۔'' مراد کے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔ لیکن وہ چوہدری کے لڑکے کے ساتھ منہ

ماری نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے چند لمحے اُسے گھورتے رہنے کے بعد آگے بڑھ گیا۔ چوہدری کے لڑکے نے پیچھے سے آواز لگائی۔

''اُسے کبھی کبھی حویلی بھیج دیا کر یقین جان بڑی زبردست عورت ہے۔'' مراد نے قدموں کی رفتار تیز کردی۔ اُس کے کاندھوں پر ہل رکھا ہوا تھا اور بیلوں کی جوڑی الگ تنگ کررہی تھی۔ جھنجلاہٹ کے دوران ہل زمین پر گریا اور بیلوں کی جوڑی اڑ کر کھڑی ہوگئی۔ چوہدری کے لڑکے نے قہقہہ لگایا اور جلا دینے والے لہجے میں بولا۔

''تجھ سے ہل تو سنبھالا نہیں جارہا۔ اُس جاندار مٹیارن کو بھلا کیسے سنبھالے گا' اُسے حویلی بھیج دے تیرے لیے یہی بہتر ہوگا۔'' بات مکمل کرنے کے بعد اُس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ اور کھیتوں کی باڑھ کو عبور کر کے دوسری طرف اتر گیا۔ مراد نے بیلوں کو ہلکارا۔ اور لکڑی کے ہل کو کاندھے پر رکھ کر گاؤں آگیا۔ اس نے ہل اور بیلوں کی جوڑی ہمسائیوں کے حوالے کی اور گھر میں داخل ہوگیا۔ صفیہ اس کی منتظر تھی۔ اس نے پانی کی بالٹی اُس کے سامنے رکھ دی اور کھانا گرم کرنے کے لیے چولہے کی طرف چلی گئی۔

مراد نے ہاتھ منہ دھویا اور برگد کے درخت کے نیچے رکھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اُس کا خون کھول رہا تھا۔ چوہدری کے لڑکے کی زہر خند باتیں دماغ کو جھنجھوڑ رہی تھیں۔ اس کی غیر معمولی کیفیت صفیہ کی نگاہوں سے زیادہ دیر چھپ نہ سکی۔ وہ مٹی کے چولہے میں لکڑیاں ڈالنے کے بعد نالی کے ذریعے آگ کو ہوا دے رہی تھی۔ اور کن انکھیوں سے مراد کی دماغی کیفیت کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔ چند لمحے اُسے دیکھتے رہنے کے بعد جب اس سے برداشت نہ ہوا تو وہ اُٹھ کر چارپائی کی طرف آگئی۔ پھر فکر مند لہجے میں بولی۔

''تیری طبیعت تو ٹھیک ہے نا...... تو آج بہت چپ چپ اور پریشان دکھائی دے رہا ہے۔'' مراد نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

''تُو کل سے کھیتوں میں نہیں آئے گی۔ میں خود ہی کھانا کھانے گھر آجاؤں گا۔ اس بہانے تھوڑا سا آرام بھی کرلوں گا۔'' صفیہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''کیا چوہدری کے لڑکے کے ساتھ تیری اَن بن ہوئی ہے۔ اگر بات ایسی ہی ہے تو میں کھیتوں میں ضرور جاؤں گی۔ وہ مجھے روکنے والا کون ہوتا ہے۔'' مراد غصے میں بولا۔

''تجھے سمجھ نہیں آرہی میں کیا کہہ رہا ہوں۔ بس تو کل سے کھیتوں میں نہیں آئے گی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔'' صفیہ پیر پٹختے ہوئے چولہے کی طرف آگئی۔ اُس نے جلتی ہوئی لکڑیوں پر ہانڈی رکھی اور خاموشی کے ساتھ کھانا گرم کرنے لگی۔

کھانے کے دوران خاموشی طاری رہی۔ برتن سمیٹ کر صفیہ کمرے میں چلی گئی اور مراد درخت کے نیچے چارپائی پر چادر اوڑھ کر لیٹ گیا۔ اُس کا دماغ مختلف سوچوں کے گھیرے میں تھا۔ صفیہ کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا۔ وہ اس سے آگاہ تھا۔ ہر چند اُس نے صفیہ کی عزت بچانے کی کوششیں کی تھیں۔ لیکن کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔ یہ اُن دونوں کی شادی سے پہلے کی بات تھی۔ وہ دونوں حویلی میں ملازم تھے۔ چوہدری کے لڑکے کی نیت صفیہ پر خراب تھی۔ ایک دن وہ چپکے سے کام کے بہانے اُسے حویلی کے پچھواڑے میں واقع مہمان خانے میں لے گیا۔ مراد نے اُن دونوں کو جاتے ہوئے دیکھ لیا۔

وہ بھاگتا ہوا چوہدری کے پاس گیا اور تمام واقعہ سے اُسے باخبر کردیا۔ چوہدری طیش میں آ گیا اور اُس نے مراد کو وہیں رکنے کے لیے کہا پھر مہمان خانے کی طرف چلا گیا۔ آدھے گھنٹے کے بعد صفیہ روتی ہوئی مہمان خانے سے نمودار ہوئی۔ اُس نے مراد کو بتایا کہ چوہدری اور چوہدری کے لڑکے دونوں نے اُس کی عصمت دری کی ہے اور وہ انتہائی اقدام کے طور پر خودکشی کرلینا چاہتی ہے۔ مراد نے اُسے سمجھایا بجھایا اور اپنے ساتھ گاؤں لے آیا گاؤں والوں کو جب اُس نے حالات سے آگاہ کیا تو وہ سب چپ ہوکر بیٹھ گئے۔ کسی نے بھی صفیہ کی طرفداری کرنے کی کوشش نہیں کی۔ مراد نے تھانے میں رپورٹ درج کرانے کی نیت سے رخ کیا۔ لیکن تھانے دار نے رپورٹ لکھنے سے صاف انکار کردیا۔ مجبور لاچار وہ دونوں گاؤں واپس چلے آئے صفیہ کی حالت دن بدن خراب ہوتی چلی جارہی تھی۔ اُس نے کھانا پینا ترک کردیا تھا۔

انہی دنوں صدمے کو نہ جھیلتے ہوئے صفیہ کی بوڑھی ماں کا انتقال ہوگیا۔ اب اُسے سنبھالنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس لیے مراد نے گاؤں والوں سے صلح ومشورہ کرنے کے بعد صفیہ سے شادی کرلی اور اُسے اپنے گھر لے آیا شروع کے چند دن وہ چپ چپ رہی۔ پھر حالات کے دھارے پر اپنے آپ کو چھوڑنے کے بعد زندگی کی طرف توجہ دینے لگی۔ حویلی میں کام کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے مراد نے گاؤں کے قریب واقع زمین کاشت کی نیت سے لے لی اور کھیتی باڑی شروع کردی۔ حویلی میں کام کرنے کی نسبت یہ کام نہایت دشوار گزار اور سخت تھا لیکن مجبوری تھی۔ اُسے یہ سب کچھ کرنا ہی تھا۔

چوہدری کا لڑکا پڑھائی کے لیے شہر چلا گیا تھا۔ اس لیے دوبارہ اُن کا آمنا سامنا نہیں ہوا۔ تاہم آج کے واقعے نے اُسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ جھوٹے برتنوں میں کھانا کھانا حویلی کے نوکر چاکروں کا معمول تھا۔ لیکن جھوٹی عورت سے شادی کرنا' اُس نے سختی کے ساتھ آنکھیں بھینچ لیں۔ وہ سچائی کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن آنکھیں بند کرنے سے کچھ بھی نہیں ہوا۔ دماغ اب بھی مختلف سوچوں کے گھیرے میں تھا۔ اُس نے آنکھیں کھول دیں اور چارپائی سے نیچے اتر کر باورچی خانے میں چلا گیا۔ برتنوں والی پرچھتی پر چاقو رکھا ہوا تھا۔ اس نے چاقو اٹھایا اور صحن میں بیٹھ کر پتھر کی سل کے اوپر اُس کی دھار کو تیز کرنے لگا۔ جیسے جیسے دھار تیز ہوتی جارہی تھی ویسے ویسے اُس کے دماغ کی کیفیت اعتدال پر آتی جارہی تھی۔ جب اُسے محسوس ہوا کہ اب دھار اس قابل ہوگئی ہے کہ کسی کے نرخرے کو مولی گاجر کی طرح کاٹ سکے تو اُس نے چاقو کو سرہانے کے نیچے رکھا اور بستر پر لیٹ کر سونے کی کوششیں کرنے لگا۔

صبح اُس کی آنکھ تاخیر کے ساتھ کھلی۔ سورج نکل آیا تھا اور صفیہ اس کے سرہانے کھڑی تھی اُس کو آنکھیں کھولتے دیکھ کر بولی۔

''آج تو تُو نے حد ہی کردی ہے دن چڑھ گیا اور تو ابھی تک سویا ہوا ہے۔'' مراد ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا صحن میں بالٹی اُس کی منتظر تھی۔ اُس نے ہاتھ منہ دھویا اور ناشتے کے لیے چارپائی کی طرف آ گیا۔ صفیہ اس کی منتظر تھی۔ مراد نے عجلت کے عالم میں ناشتہ کیا۔ صفیہ نے سرہانے کے نیچے سے چاقو نکالا اور اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

''اسے تکیے کے نیچے رکھنے کا کیا مقصد

ہے۔'' مراد نے رکھائی سے جواب دیا۔
''تو اپنے کام سے کام رکھ۔ مردوں کے معاملے میں بولنے کی تجھے ضرورت نہیں ہے۔'' صفیہ پریشان لہجے میں بولی۔
''کیا تو اُسے قتل کرے گا...... اس کے بعد کیا ہوگا...... اس کے بارے میں سوچا ہے تُو نے...... چوہدری کے آدمی تجھے قتل کردیں گے اور اگر تو نے فرار ہونے کی کوشش کی تو پولیس تجھے گرفتار کرلے گی۔ پھر وہ تجھے پھانسی چڑھا دے گی۔ اس کے بعد میرا کیا ہوگا ماں پہلے مرچکی ہے شوہر کے پھانسی چڑھ جانے کے بعد میں بالکل ہی بے آسرا ہو جاؤں گی۔ ہوسکتا ہے کہ چوہدری اپنے بیٹے کا بدلہ لینے کے لیے مجھے زندان خانے میں ڈال دے، کیا تو ایسا ہی چاہتا ہے۔'' مراد کے چہرے پر سوچ وفکر کی لکیریں نمودار ہوئیں۔ تاہم اُس نے کوئی مثبت جواب نہیں دیا اور چارپائی سے اتر کر صحن کے دروازے سے باہر نکل گیا۔
گرمی کی شدت میں اضافہ ہوتا چلا جارہا تھا۔ لیکن آج کھیتوں میں کام زیادہ نہیں تھا۔ اس نے ہمسائیوں سے بیلچہ اور کدال لیا اور کھیتوں میں آگیا۔ دوپہر تک اس نے پانی کے راستوں کو برابر کیا۔ نقصان دینے والی جڑی بوٹیوں کو تلف کیا۔ اور رہٹ پر جاکر منہ ہاتھ دھونے کے بعد درخت کے نیچے چارپائی ڈال کر لیٹ گیا۔ سورج سر پر چمک رہا تھا۔ جس کا یہ عالم تھا کہ سانس سینے میں اٹک رہا تھا۔
درخت کی ٹھنڈی چھاؤں کے نیچے کچھ امن تھا۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد جب وہ گھر جانے کی نیت سے اٹھنے لگا۔ تب وہ اُسے کھیتوں کی طرف آتی ہوئی دکھائی دی یہ پہلی دفعہ ہوا تھا کہ وہ اس کے منع کرنے کے باوجود بھی کھیتوں کی طرف آرہی تھی۔ مراد کے چہرے پر غصے کے تاثرات ابھرے اور وہ منہ پھیر کر بیٹھ گیا۔ گاؤں کی مٹیارن اُس نے غصے سے تھوک زمین پر پھینکا اور دوبارہ صفیہ کی طرف دیکھا۔ وہ کافی قریب آچکی تھی۔ درخت کے قریب پہنچنے کے بعد اُس نے ہانڈی کو چارپائی پر رکھا۔ اور لسی کا پیالہ لبالب بھر کر مراد کے ہاتھوں میں تھمانے کی کوشش کی۔ لیکن اُس نے رکھائی کے ساتھ ہاتھ جھٹک دیا۔ صفیہ پیار بھرے لہجے میں بولی۔
''مجھے تیری اجازت کے بغیر کھیتوں میں نہیں آنا چاہیے تھا۔ لیکن تیری خدمت کرنا میرا فرض ہے تو کھانا کھالے میں جلد واپس چلی جاؤں گی۔'' مراد کا دل پسیج گیا وہ جو کچھ بھی کر رہی تھی اُس میں اُس کا ذاتی مفاد نہیں تھا۔ درحقیقت وہ اپنی فطرت سے مجبور تھی۔ شوہر کی عزت کرنا کھیتوں میں اُس کا ہاتھ بٹانا اُس کے اوڑھنے بچھونے کا خیال رکھنا اُس کی گھٹی میں شامل تھا۔ وہ نرم لہجے میں مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔
''چوہدری کا لڑکا روزانہ کھیتوں کا چکر لگاتا ہے۔ اگر اُس نے تجھے دیکھ لیا تب تجھے ضرور چھیڑے گا۔ اور میں اُس کی حرکت کو برداشت نہیں کرسکوں گا اس کے بعد فضول کی ہاتھا پائی ہوگی یا تو وہ جان سے جائے گا یا پھر میں اس کے ہاتھوں سے زخمی ہو جاؤں۔ اگر تو چاہتی ہے کہ ایسا نہ ہو تو کل سے کھیتوں میں آنا چھوڑ دے۔'' صفیہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔
''آج تو کھانا کھالے سوں رب دی کل سے میں کھیتوں میں نہیں آؤں گی۔'' مراد نے مسکراتے ہوئے لسی کے گلاس کو تھاما اور ایک ہی گھونٹ میں تمام گلاس کو ختم کردیا۔ پھر چارپائی پر بیٹھ کر کھانا شروع کردیا۔ صفیہ نے قریب ہی رکھا

ہوا پنکھا اٹھایا اور پنکھا جھلتے ہوئے بولی۔
''ماسی اور میں آج قریبی پنڈ گئے تھے ماسی کا رشتہ دار بہت امیر و کبیر آدمی ہے۔ اس کی حویلی میں دو نئے نکور ٹریکٹر کھڑے تھے۔ میں نے اس سے بات چیت کرلی ہے وہ ٹریکٹر دینے کے لیے آمادہ ہے۔ بھاڑا بھی اتنا زیادہ نہیں ہے وہ فصل تیار ہونے کے بعد پانچ بوری گندم لینے پر راضی ہوگیا ہے۔ یہ بہت معمولی بھاڑا ہے تیرا اس بارے میں کیا خیال ہے۔'' مراد نوالہ نگلتے ہوئے بولا۔
''زمین کا ایک ٹکڑا تو میں تیار کر چکا ہوں باقی کے تین بھی جلد ہی تیار کر لیتا۔ گندم کی پانچ بوریاں ہمارے بہت کام آسکتیں ہیں۔ میری مان تو اُسے منع کردے۔'' صفیہ نے اُس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھاما اور بولی۔
''تیرے ہاتھوں کے چھالے مجھے اپنے دل پر نکلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں جب تو تپتی ہوئی دھوپ میں کام کرتا ہے نا...... تو میرا سکھ چین برباد ہوکر رہ جاتا ہے۔ ٹریکٹر کے آنے سے تیری بہت سی مشکلات کم ہوجائیں گی۔ تب میں بھی سکون کے ساتھ گھر میں بیٹھ سکوں گی۔ ورنہ یونہی کھیتوں میں دربدر ہوتی پھروں گی۔'' اس کی بات درمیان میں رہ گئی۔ کھیتوں کے پار دھول کا غبار اٹھا اُس غبار میں سے یکے بعد دیگرے تین گھڑ سوار نمودار ہوئے۔ مراد نے پریشان نگاہوں سے صفیہ کی طرف دیکھا۔
''لے وہ آرہا ہے...... اب اگر ہاتھا پائی ہوئی تو اس کی ذمہ دار تو ہوگی۔'' صفیہ ہڑبڑا کر اپنی جگہ سے اٹھی۔ اُس نے عجلت کے عالم میں برتن سمیٹے اور لسی کے گھڑے کو بغلوں میں تھامے گاؤں کی طرف جاتی ہوئی پگڈنڈی کی طرف چل دی۔ گھڑ سوار بہت قریب آچکے تھے۔ اُن سے ایک چوہدری کا لڑکا اور باقی کے دو اُس کے چمچے تھے۔ آج اُن کے کاندھوں پر رائفلیں بھی لٹکی ہوئی تھیں۔ مراد نے چارپائی سے اترنے کے بعد درخت کے تنے کے پاس رکھی ہوئی کلہاڑی کو اٹھایا اور صفیہ کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ اتنی دیر میں تینوں گھڑ سواروں نے صفیہ کا محاصرہ کرلیا۔ وہ زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے۔ چوہدری کے لڑکے نے کاندھے پر لٹکی ہوئی رائفل کو اتارا اور اس کے سر پر رکھی ہوئی ہانڈی کو چکنا چور کردیا اب معاملہ مراد کی برداشت سے باہر ہوگیا تھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر ایک گھڑ سوار کے کاندھے پر کلہاڑی سے وار کیا۔
وہ ادھ موا ہوکر گھوڑے سے نیچے گرگیا۔ دوسرے گھڑ سوار نے اپنے ساتھی کی حالت کو دیکھتے ہوئے کاندھے سے رائفل اتارنے کی کوشش کی۔ لیکن مراد نے اُسے موقع نہیں دیا اور کلہاڑی کے وار سے اُسے بھی زمین بوس کردیا۔ چوہدری کا لڑکا حیرت بھری نگاہوں سے اپنے دونوں ساتھیوں کو مار کھاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اُس نے گھبرا کر رائفل کا رخ مراد کی طرف کیا۔ پھر نشانہ لینے کے بعد فائر کردیا۔ گولی مراد کے دل سے نیچے لگی۔ اور وہ تیورا کر زمین پر گرگیا۔ صفیہ نے چیختے چلاتے ہوئے چوہدری کے لڑکے کی طرف بڑھنے کی کوشش کی۔
لیکن وہ گھوڑے کو ایڑ لگا چکا تھا۔ گھوڑا طوفانی رفتار کے ساتھ کھیتوں کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ گولی کی آواز سن کر ارد گرد کے کھیتوں میں کام کرتے ہوئے کسان مراد کے گرد جمع ہونے لگے۔ صفیہ سینے پر دو ہتھڑ مارتے ہوئے چوہدری کے لڑکے کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔ زخمی ہونے

والے دونوں گھڑ سوار بھی گھوڑوں پر بیٹھ کر فرار ہوگئے۔ مراد کے خون آلود جسم کو کسانوں نے مل کر اٹھایا اور گاؤں کی طرف لے آئے گاؤں سے کچھ ہٹ کر حال ہی میں ڈسپنسری کا قیام ہوا تھا۔ مراد کو چارپائی پر ڈال کر وہاں لے جایا گیا۔ ڈسپنسری میں سہولیات محدود تھیں۔ تاہم انہوں نے زخم کو دھونے کے بعد پٹی کر دی اور گاؤں کو اُسے فوراً شہر لے جانے کے لیے کہا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اُسے شہر کیسے لے جایا جاتا گاؤں میں صرف بیل گاڑی کی سہولت دستیاب تھی لیکن بیل گاڑی میں لے جانا اس لیے مناسب نہیں تھا کہ راستہ کچا اور ناہموار تھا اور مراد کی حالت اس قابل نہیں تھی کہ اُن پیچیدہ راستوں پر زخموں کے ساتھ سفر کر سکتا۔

علاوہ ازیں بیل گاڑی کا یہ سفر طوالت بھی اختیار کر سکتا تھا۔ اس مسئلے کا حل ماسی نے نکالا اُس کے رشتے دار کے پاس دو ٹریکٹر حویلی میں کھڑے تھے۔ اگر ایک کے پیچھے ٹرالر باندھ کر اُس پر مراد کو لٹایا جاتا تو اُس کے ہمراہ بہت سے گاؤں والے بھی باآسانی اور تیز رفتاری کے ساتھ سفر کرتے ہوئے شہر جا سکتے تھے۔ لیکن یہ سب کچھ اسی وقت ہو سکتا تھا جب ماسی کا رشتہ دار ٹریکٹر دینے کے لیے راضی ہوتا۔ صفیہ سب کچھ جلد از جلد کر لینا چاہتی تھی۔ اُسے اپنے شوہر کی زندگی سب سے بڑھ کر عزیز تھی۔ اس لیے ماسی کو گھسیٹتے ہوئے قریبی پنڈ کی طرف چل دی۔ سورج مغرب کی طرف جھکنے لگا تھا۔ ہر چند کے ابھی تک شام ہونے میں کافی وقت پڑا تھا لیکن واپسی کے دوران اندھیرا پھیلنے کا خدشہ لاحق تھا۔ اُن کے ساتھ گاؤں کے دو ایسے نوجوان بھی تھے۔ جو ٹریکٹر چلانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ مغرب ہونے سے کچھ پہلے وہ سب ماسی کے رشتے دار کی حویلی میں پہنچ گئے۔ ان سب کو مہمان خانے میں بٹھایا گیا ماسی کے رشتے دار کا نام مقبول الٰہی تھا۔ عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان تھی۔ چہرہ رعب دار اور مونچھیں بڑی بڑی تھیں۔ وہ ہاتھ میں لکڑی کی عصا تھامے ہوئے تھا۔ ماسی نے اُسے وجہ بتائی تب وہ چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد بولا۔

''میرا ایک ٹریکٹر بھاڑے پر چڑھ چکا ہے اور دوسرے کی بات چیت جاری ہے تمہارا معاملہ ایسا نہیں ہے کہ اسے رد کیا جا سکے۔ اس لیے میں دوسرے ٹریکٹر کا معاہدہ منسوخ کیے دیتا ہوں۔ لیکن تمہیں ٹریکٹر اور ٹرالی کا بھاڑا دینا ہوگا۔'' ماسی نے پوچھا۔

''بھاڑا کتنا ہوگا کچھ لحاظ سے بتانا...... اس بے چاری کے گھرانے پر پہلے ہی مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔'' مقبول الٰہی نے چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد بتایا۔

''عام حالات میں ٹریکٹر کا بھاڑا دس گندم کی بوریاں وصول کرتا ہوں۔ لیکن چونکہ مصیبت زدہ اس خاندان سے پہلے بھی پانچ گندم کی بوریوں کے عوض سودا طے کر چکا ہوں اس لیے اب بھی اُس پر تیار ہوں مجھے اس کی جلد ضرورت نہیں ہے جب بھی دے سکو دے دینا۔'' گاؤں والوں نے اُس کی رحم دلی کی تعریف کی۔ اور ٹریکٹر کے ساتھ ٹرالر لگا کر چک 84 چلے آئے۔ ٹرالر کے اندر موٹے گدے بچھائے گئے مراد کو ان پر لٹا کر باقی گاؤں والے اردگرد بیٹھ گئے۔

پھر سفر کا آغاز کیا گیا۔ رات کے ساڑھے سات بجنے والے تھے۔ شہر گاؤں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ تاہم مراد کی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے

ٹریکٹر کی رفتار کو تیز نہیں کیا گیا۔ چک 84 سے پکی سڑک پانچ میل کے فاصلے پر تھی۔ سڑک پر پہنچنے کے بعد باقی کا سفر تیز رفتاری کے ساتھ طے ہوا۔ اور وہ ساڑھے نو بجے کے قریب ہسپتال پہنچ گئے۔ ڈاکٹروں نے مراد کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور تفصیلی چیک اپ کے بعد یہ روح فرسا خبر سنائی کہ آپریشن کے بعد اچھی خبر سنانا ممکن نہیں۔ صفیہ نے روتے ہوئے پوچھا۔

''آپریشن پر کتنی لاگت میں خرچہ آ سکتا ہے۔'' ڈاکٹر نے بتایا۔

''پچاس ہزار...... یہ رقم پیشگی ادا کرنا ہوگی۔ رقم کی ادائیگی کے بعد آپریشن ہوگا۔'' صفیہ ہکا بکا چہرہ لیے ڈاکٹر کی باتیں سن رہی تھی۔ رقم کی لاگت کے متعلق سننے کے بعد وہ سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گئی۔ گاؤں کے لوگوں نے ڈاکٹر کی منت سماجت شروع کر دی۔ لیکن وہ کوئی بھی بات سنے بغیر اپنے کمرے کی طرف جانے کے لیے مڑ گیا۔ صفیہ نے اچانک کھڑے ہوتے ہوئے چلاتے ہوئے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب آپ آپریشن کی تیاریاں کیجیے میں رقم کا بندوبست کر کے ابھی واپس آتی ہوں۔'' گاؤں والوں نے حیرت بھری نگاہوں سے صفیہ کی طرف دیکھا ڈاکٹر سپاٹ لہجے میں بولا۔

''تیاری ہر لحاظ سے مکمل ہے...... صرف رقم جمع ہونے کی دیر ہے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔'' صفیہ نے ماسی کا ہاتھ تھاما پھر گاؤں کے ایک لڑکے کے ساتھ ٹریکٹر میں بیٹھ کر چک 84 چلی آئی۔

☆......☆......☆

صبح کے چھ بجے مراد کا آپریشن ہوا۔ گولی کو باہر نکال کر مرہم پٹی کر دی گئی۔ صفیہ نے اپنا کھانا پینا سونا اٹھنا حرام کر دیا۔ اور دن رات ٹوٹ کر مراد کی خدمت کی۔ مراد اُس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہتا۔

''تُو نے جتنی خدمت ان چند دنوں میں میری کی ہے۔ میں اُسے تمام حیاتی بھلا نہیں پاؤں گا۔'' صفیہ جواب دیتی۔

''میری زندگی تیری امانت ہے۔ اگر تو مجھے اس وقت سہارا نہیں دیتا جب گاؤں والوں نے مجھے اپنانے سے انکار کر دیا تھا تب میرے پاس موت کے علاوہ اور کوئی راستہ باقی نہیں بچا تھا۔ بس تو جلدی سے ٹھیک ہو جا۔ پھر ہم واپس چک چلے جائیں گے۔ پندرہ دنوں کے بعد اُسے گھر جانے کی اجازت دے دی گئی۔ اور گاؤں آنے کے بعد مراد کی حالت تیزی کے ساتھ سنبھلنے لگی۔ صفیہ اُسے گوشت کی یخنی بنا کر دیتی۔ اس کے استعمال کی مختلف ادویات وہ شہر سے ہمراہ لے کر آئی تھی۔ اُسے وقت پر دوائی دیتی۔ اور پٹی تبدیل کروانے کے لیے قریبی ڈسپنسری لے کر جاتی۔ مراد بعض اوقات سوچتا تھا کہ وہ اتنے اخراجات کو پورا کیسے کر رہی تھی۔ لیکن سوچنے کے علاوہ اُس کے پاس پوچھنے کی ہمت نہیں تھی۔

اس لیے یہ سوچ کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیتا تھا کہ شاید اُس نے دوبارہ حویلی میں کام کرنا شروع کر دیا ہوگا۔ لیکن وہ کس وقت کام پر جاتی تھی۔ اس کا تمام دن تو مراد کی دیکھ بھال اور خدمت کے دوران گزرتا تھا۔ اِس راز سے پردہ اُس وقت اٹھا جب ایک دن صفیہ کی غیر موجودگی کے دوران ماسی گھر پر اُس کی خیر خیریت معلوم کرنے کے لیے آئی۔ اور اُس نے مراد کو بتایا کہ اُس کے آپریشن پر پچاس ہزار کی خطیر رقم کا خرچہ آیا تھا۔ اور صفیہ نے نا صرف ایک ہی رات میں رقم کا بندوبست کیا تھا بلکہ ٹریکٹر کا بھاڑا بھی جمع کروا دیا تھا۔'' مراد نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

''وہ رقم کہاں سے لائی؟ کہیں اُس نے مکان تو نہیں بیچ دیا۔'' ماسی نے انکار میں سر ہلایا۔
''تو بھی بچوں والی باتیں کرتا ہے۔ کیا ایک رات میں مکان کا سودا ہوسکتا ہے پھر تیرا دو کمرے کا مکان اتنی تگڑی رقم میں کہاں فروخت ہوسکتا ہے۔ میں نے صفیہ سے رقم کے متعلق دریافت کیا تھا لیکن اس نے مناسب جواب نہیں دیا۔'' مراد کے ماتھے پر سوچ کی لکیریں نمودار ہوئیں۔ واقعی اتنی بڑی رقم کا بندوبست کرنا ایک رات میں ممکن نہیں تھا۔ اگر اس نے ایسا کیا تھا تو پھر رقم حاصل کرنے کے ذرائع یقیناً غلط ہوں گے۔ تاہم اُس نے اپنے اس خیال کا اظہار ماسی سے نہیں کیا۔ اور صفیہ کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگا۔ اُس کی واپسی ایک گھنٹے کے بعد ہوئی۔ وہ ہاتھوں میں دودھ کا برتن تھامے ہوئے تھی۔ مراد کو اپنا منتظر دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔
''میں تیرے لیے دودھ لینے کے لیے عبدالخالق کی ڈیری پر گئی تھی۔ وہ چار بجے دودھ کی چوائی کرتا ہے۔ تیری صحت کے لیے خالص دودھ اشد ضروری ہے۔'' مراد نے پوچھا۔
''تُو یہ سب خرچہ کہاں سے کر رہی ہے؟ ہماری جمع پونجی چند روپوں سے زیادہ نہیں تھی۔ مجھے لگتا ہے تیرے ہاتھ قارون کا خزانہ آ گیا ہے۔'' صفیہ نے کوئی جواب نہیں دیا اور دودھ کے برتن کو مٹی کی ہانڈی میں انڈیلنا شروع کر دیا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد مراد نے دوبارہ پوچھا۔
''ماسی نے مجھے بتایا ہے کہ میرے آپریشن پر پچاس ہزار کی رقم خرچ ہوئی ہے اور تُو نے ایک رات میں نا صرف رقم کا بندوبست کیا ہے بلکہ ٹریکٹر کا بھاڑا بھی یکمشت ادا کیا ہے۔ مجھے سچ سچ بتا کہ معاملہ کیا ہے؟ تو اگر تمام حیاتی بھی دن رات کام کرتی رہے تو اتنی بڑی رقم کا بندوبست نہیں کر سکتی۔'' صفیہ نے مٹی کی ہانڈی کو لکڑیوں کے اوپر رکھا اور لکڑیوں کو آگ لگا دی۔ پھر اپنے دوپٹے کے ساتھ مراد کے چہرے پر آئے ہوئے پسینے کو پونچھتے ہوئے بولی۔
''تیری زندگی کے لیے میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں پچاس ہزار کا بندوبست کرنا کچھ خاص معنی نہیں رکھتا۔ تو دماغ پر زیادہ زور نہیں دے بس یہ سمجھ لے کہ ماسی کے رشتے دار نے تمام رقم کا بندوبست کیا ہے۔'' مراد نے بے دردی کے ساتھ اُس کے ہاتھ کو جھٹکا پھر تلخ لہجے میں بولا۔
''اتنی بڑی رقم کا بندوبست ہو گیا لیکن ماسی کو اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں پچاس ہزار کوئی معمولی رقم نہیں ہے۔ اگر اس نے دی ہے تو اس کے متعلق ماسی کو ضرور معلوم ہونا چاہیے تھا۔ سچ سچ بتا کہ تو نے رقم کہاں سے حاصل کی۔ ورنہ میں مقبول الٰہی سے معلوم کرنے اُس کے پنڈ چلا جاؤں گا۔'' صفیہ نے جواب دینے کے بجائے نیم گرم دودھ کو گلاس میں ڈالا اور گلاس مراد کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ مراد نے غصے کے عالم میں گلاس کو زمین پر پٹخ دیا۔ تمام دودھ فرش پر بہہ گیا۔ اس سے بھی اُس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا اور وہ غراتے ہوئے بولا۔
''مجھے یقین ہے کہ تُو نے آپریشن والی رات چوہدری کے ڈیرے پر بسر کی ہے چک 84 میں ایک وہی ایسا بندہ ہے جو اتنی بڑی رقم کا بندوبست ایک رات میں کر سکتا ہے۔ دیکھ صفیہ مجھ سے کچھ نہیں چھپا۔ تیرے حق میں یہی بہتر ہوگا۔'' صفیہ نے آنکھیں زمین پر جھکا دیں پھر نڈھال لہجے میں بولی۔

”تو پھر میں اور کیا کرتی...... میرے لیے ایک رات میں اتنی بڑی رقم کا بندوبست کرنا ممکن نہیں تھا۔ چوہدری کب سے میرے پیچھے پڑا ہوا تھا وہ میرے ساتھ زبردستی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اور میری مرضی کو نوٹوں میں تولنا چاہتا تھا۔ مجھے صرف تیری زندگی عزیز تھی۔ میں اس کے لیے اپنی عزت کو بھی داؤ پر لگانے کے لیے باخوشی تیار تھی۔ اس لیے میں نے ہاں کر دی۔ اور اُس سے ساٹھ ہزار روپے وصول کر لیے۔“ مراد کے چہرے پر غصے کے تاثرات پیدا ہوئے۔ چہرے کا رنگ خون کی مانند سرخ ہو گیا۔ اُس نے بے دریغ صفیہ کو زمین پر لٹا کر ٹھڈے اور مکوں کی بارش کر دی۔ صفیہ بلا چوں وچرا کیے مار کھاتی رہی۔ رات گزر گئی صبح مراد نے گاؤں کے تمام بوڑھوں کو اپنے گھر جمع کیا پھر انہیں تمام واقعے سے آگاہ کر دیا بوڑھوں کے چہروں پر حیرت کے تاثرات ابھرے اور ایک نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”صفیہ نے سب کچھ تیری محبت میں پاگل ہو کر کیا لیکن چوہدری بہت کمینی طبیعت کا مالک ہے۔ اُس کے خلاف ہمیں عملی قدم اٹھانا ہوگا۔“ مراد بولا۔

”چوہدری نے جو کچھ کیا اپنی فطرت سے مجبور ہو کر کیا۔ لیکن صفیہ نے میرے وقار کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں ہیں۔ تم سب جہاندیدہ اور تجربہ کار انسان ہو۔ اس بات کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہو کہ ایک ایسی عورت کے ساتھ زندگی گزارنا کتنا مشکل ہو سکتا ہے جس نے اپنی مرضی کے ساتھ رات باہر بسر کی ہو۔ میں جب بھی اُس کا چہرہ دیکھوں گا۔ تو مجھے چوہدری کی تمسخرانہ مسکراہٹ صفیہ کے چہرے پر دکھائی دے گی۔ میں اُسے طلاق دینے لگا ہوں۔ اُس کا وجود میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔“ گاؤں کے بوڑھوں کے چہروں پر زلزلے کے آثار پیدا ہوئے اور اُن میں سے ایک ہڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”اوئے تو پاگل تو نہیں ہو گیا۔ اتنا بڑا فیصلہ تُو نے سوچ سمجھے بغیر کیسے کر لیا۔ صفیہ نے جو کچھ بھی کیا اُس میں اُس کا ذاتی مفاد نہیں تھا۔ یہ سب اُس نے تیری جان بچانے کے لیے کیا ہے۔“ ایک دوسرا بوڑھا بولا۔

”نا مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی...... کہ پچھلی دفعہ جب چوہدری اور اُس کے لڑکے نے صفیہ کی عزت پر ہاتھ ڈالا تب تو نے نا صرف اُسے سہارا دیا بلکہ تمام گاؤں والوں کے اختلاف کو نظر انداز کرتے ہوئے اُسے بیاہ کر گھر بھی لے گیا تھا۔ پھر اب کس بات کی قباحت ہے یوں سمجھ لے کہ جو کچھ بھی ہوا پہلی دفعہ کی طرح ہوا۔“ مراد نے غصیلے لہجے میں جواب دیا۔ پہلی دفعہ اور اس دفعہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پہلی دفعہ میں صفیہ کی مرضی شامل نہیں تھی۔ لیکن اس دفعہ میں اس کی مرضی کا عمل دخل ہے۔ اس لیے وہ قصوروار ہے۔ میں آپریشن نا ہونے کی صورت میں بھلے مر جاتا۔ مجھے افسوس نہیں ہوتا‘ لیکن بیوی کی عزت کو بیچ کر زندگی حاصل کرنا میرے لیے توہین آمیز حقارت سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ میں اُسے طلاق دے رہا ہوں۔ اگر کسی کو اعتراض ہے تو میرے ساتھ بات چیت کر سکتا ہے۔ لیکن میرا فیصلہ اٹل ہے۔“ وہ دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ چک 84 کے بوڑھے ہکا بکا چہروں کے ساتھ اُسے باہر جاتا ہوا دیکھتے رہ گئے اور کسی نے بھی تیورا کر گرتی صفیہ کو نہ دیکھا۔

☆☆......☆☆

فتحِ محبت

لو آپ کی بیٹی کے تو ڈھب ہی نرالے ہیں، کل کہہ رہی تھی، مما، میں نے آپ لوگوں کی خوشی کی خاطر بی، ایس، سی کرلیا ہے، میری خواہش تھی کہ میں آرمی جوائن کرتی، لیکن آپ لوگوں نے مجھے ایموشنلی بلیک میل کیا کہ ہم اکلوتی بیٹی سے دوری برداشت نہیں کر سکتے، تمہیں آرمی جوائن کرنے کے بعد پہلے......

ریحانہ اعجاز

چھ ستمبر سے جڑی بے شمار یادیں سوہا کے دل و دماغ میں یوں ہلچل مچائے رکھتیں جیسے وہ کل کا ہی دن تھا جب بھارت نے اپنے مذموم عزائم کے ساتھ پاکستان پر شب خون مارا تھا، اور یہ اس وجہ سے تھا کہ سوہا کے دادا ابو ایک جری اور بہادر فوجی تھے جن کے شانے مختلف تمغات سے جگمگ جگمگ کرتے تھے۔ انہوں نے اس وقت کو خود اپنی آنکھوں سے نہ صرف دیکھا تھا بلکہ وطن کی حفاظت کے لیے خود بھی سر دھڑ کی بازی لگائی تھی اور وہ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ یہ ان کی خوش نصیبی کہ اللہ نے ان کو غازی بنا کر سرفراز کیا اور بدنصیبی کہ وہ شہادت کا درجہ نہ پا سکے۔ ان کی باتوں سے وطن کی محبت اور وطن کے لیے کچھ کر لینے کا عزم جھلکتا تھا۔

میجر امتیاز اکثر و بیشتر اپنے ساتھ بیتنے والے حالات و واقعات؛ اپنی لاڈلی پوتی سوہا کو سناتے رہتے جسے سوہا بغور دلچسپی سے سنا کرتی۔

یوں فوجیوں اور پاکستان سے محبت کا جذبہ اس میں پروان چڑھتا رہا۔ سوہا کے دادا ابو کو اس دنیا سے گئے سات برس بیت گئے تھے لیکن ان کی باتیں جوں کی توں سوہا کی یادداشت کا حصہ تھیں۔ وہ جب جب اپنے دادا ابو کی تصویر دیکھتی فخر و محبت سے اس کا دل بھر جاتا، اور وہ ان کے لیے دعائے مغفرت کرنا نہ بھولتی۔

سوہا کے والد نے اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے فوجی بننے کی بجائے ایک بزنس مین بننے کو ترجیح دی تھی، اور سوہا کے دادا ابو نے اپنے بیٹے کی خوشی میں ہی اپنی خوشی جانتے ہوئے انہیں کھلے دل سے اپنا پروفیشن چننے کی اجازت بھی دی تھی۔

سوہا کے والد محمد احسان کی فوجیوں سے عدم دلچسپی کی بنا پر ہی دادا پوتی میں ایک ذہنی و دماغی تعلق قائم ہو گیا تھا۔ بچپن سے ہی دادا ابو نے اپنے وطن سے محبت کے قصے کچھ یوں سوہا کے کانوں میں انڈیلے تھے کہ سوہا اپنی فرینڈز سے مذاق میں بھی اپنے وطن کی برائی برداشت نہ کرتی تھی۔

بقول دادا ابو، جب احسان میاں چھوٹے تھے تو

میں وطن کی حفاظت کے لیے سرگرداں رہتا تھا، اپنے بیٹے میں وطن کی وہ محبت پیدا نہ کرسکا جو مجھ میں ہے۔

☆......☆......☆

سوہا کا بی ایس سی کا رزلٹ ایا تھا اور سوہا بہت خوش تھی کہ اس نے امتیازی نمبروں کے ساتھ بی ایس سی کلیئر کرلیا تھا، اور احسان صاحب نے اس خوشی میں وسیع پیمانے پر پارٹی ارینج کی تھی، ایک قابل بزنس مین ہونے کے ناطے احسان اور مسز احسان کا حلقہ احباب کافی وسیع تھا، بنگلے کے عقب میں واقع لان برقی قمقموں سے جگمگا رہا تھا، سوہا لمبی سفید میکسی میں پریوں کی مانند ادھر سے ادھر ہنستی کھلکھلاتی ڈھیروں نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی تھی، لمبے سلکی بال اس کی پشت کو مکمل ڈھانپے ہوئے شب دیجور کا منظر پیش کررہے تھے تو چہرہ بڑے بڑے آویزوں کے درمیان اندرونی خوشی سے سحر کے نور کا تاثر دے رہا تھا۔

مسز احسان نگاہوں ہی نگاہوں میں اپنی بیٹی کی بلائیں لیتی نہ تھک رہی تھیں، مسز احسان کا حلقہ احباب یوں بھی وسیع تھا کہ وہ شوقیہ ایک این جی او سے وابستہ تھیں، جہاں وہ اپنی دوستوں کے ساتھ مل کر غریب و نادار، مجبور و بے کس لڑکیوں کے بہت سے مسائل حل کیا کرتی تھیں، اور یہ کام وہ محض پبلسٹی کے لیے نہیں کرتی تھیں بلکہ سچے دل سے کرتی تھیں کہ وہ ایک دردمند دل کی مالک تھیں، اب تک ان کی کوششوں سے بہت سی غریب بچیاں اپنے گھر



بار کی ہوئی تھیں اور نہ صرف وہ بچیاں دل و جان سے مسز احسان کی شکر گزار تھیں بلکہ ان کے والدین بھی دل سے مسز احسان کو دعائیں دیا کرتے تھے۔

☆......☆......☆

جہاں اور بہت سے لوگ سوہا کی خوشی کو سلیبریٹ کرنے آئے تھے وہیں میجر امتیاز کے ایک دوست کی فیملی بھی اس محفل کا حصہ تھی۔

میجر اصغر، میجر امتیاز کے بہت قریبی ساتھی اور فیملی فرینڈ تھے، یہی وجہ تھی کہ میجر اصغر اور میجر امتیاز کی ڈیتھ کے بعد بھی دونوں فیملیز کا اپس میں تعلق مکمل طور پر ٹوٹ نہیں پایا تھا، بس روابط میں کمی آ گئی تھی،، اس طرح کی پارٹیز میں ہی اکثر و بیشتر تمام لوگ ایک دوسرے سے مل لیا کرتے تھے، مصروفیات کی بنا پر متواتر ملاقاتیں ممکن نہ رہیں تھیں ،میجر اصغر کے بیٹے محمد افضل نے بھی باپ کی راہ پر چلتے ہوئے آرمی میں جانے کو ہی ترجیح دی تھی، کہ ان کے خاندان میں نسل در نسل فوجی ہی تھے۔

اب محمد افضل کا منجھلا بیٹا محمد اشعر آرمی کی ٹریننگ سے واپس لوٹا تھا جبکہ خود محمد افضل ریٹائرڈ ہو چکے تھے۔

ان کا بڑا بیٹا محمد نصر ملک کی سرحدوں پر اپنی جان کی بازی ہار چکا تھا، اور یہ اس فیملی کے لیے بہت اعزاز کی بات تھی، وہ فخریہ، نم آنکھوں سے اپنے بیٹے کا تذکرہ اپنے احباب سے کرتے بقول ان کے، ان کی مٹی کا ان پر قرض ہے اور اس قرض کو چکانے کے لیے کئی نسلیں بھی ناکافی تھیں، وطن کی محبت میں سرشار یہ گھرانا اپنی مثال اپ تھا، سب سے چھوٹا بیٹا محمد انس ہاسٹل میں رہائش پذیر تھا گو کہ ابھی کلاس نہم کا طالبعلم تھا لیکن وہ بھی وطن کی محبت میں سرشار مستقبل میں فوجی بننے کا مکمل ارادہ رکھتا تھا۔

☆......☆......☆

پارٹی سے واپسی پر محمد افضل اور ان کی وائف کی زبان پر سوہا کا ہی تذکرہ تھا، جبکہ فرنٹ سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا اشعر گھنی مونچھوں تلے زیرِ لب مسکرائے جا رہا تھا، وہ جانتا تھا اب گھر جا کر وہ ماں باپ کے گھیرے میں ہوگا، اج کل ایسا ہی تو ہو رہا تھا، ہر پارٹی سے واپسی پر پارٹی میں موجود لڑکیوں کے تذکرے ان کی خوبیاں چار گنا بڑھا چڑھا کر اشعر سے بیان کی جاتیں اور پھر اس کا عندیہ مانگا جاتا جس پر اشعر صاف ہری جھنڈی دکھا دیتا تھا، بقول اشعر اس کی شادی اپنے وطن کی مٹی سے ہو چکی ہے اور وہ نصر بھیا کی طرح وطن پر جان ضرور قربان کرے گا لیکن اپنے پیچھے نصر بھیا کی طرح کیسی بھابی اور محمد شہیر جیسے پیارے لوگوں کو روتا بلکتا نہیں چھوڑ سکتا، سو مجھے شادی نہیں کرنی جبکہ مسٹر اور مسز افضل اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئے تھے کہ شادی بھی ایک اہم فریضہ ہے اور ضروری نہں کہ نصر کی طرح ہو تمہارے ساتھ، وہ اتنی ہی عمر لکھوا کر لایا تھا، اللہ تمہیں لمبی عمر دے، اپنے گھر بار کی خوشیاں دیکھو، مسز افضل تو یہ سب کہتے کہتے صبر کا دامن چھوڑ دیتیں اور نصر کو یاد کر کے بلک اٹھتیں، تب اشعر وقتی طور پر ہتھیار ڈال دیتا، اور آج بھی یہی سب ہونے والا تھا۔

اشعر نے کبھی سوچا بھی تھا اپنی شادی کے بارے میں تو بھائی کی بے وقت موت اور ننھے منے شہیر کے ساتھ بلکتی بھابی نے اُسے کبھی دوبارہ اس موضوع پر سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا، وہ شہیر کو بھائی کی نشانی جان کر بالکل اپنی اولاد کی طرح پیار کرتا تھا اور بھابی اس کے لیے بڑی بہن کا درجہ رکھتی تھیں، یہی وجہ تھی کہ بیوگی کے اندوہناک حادثے کے بعد بھی انہوں نے میکے جانے کی

بجائے اپنی باقی ماندہ زندگی اپنے بیٹے اور سسرال کے نام کر کے اسی گھر میں رہنے کو ترجیح دی تھی، شہیر ماشاء اللہ پانچویں برس میں قدم رکھ چکا تھا اور گھر بھر کے لیے ہتھیلی کے چھالے کی مانند تھا، سب آپ اس پر جان لٹاتے، اور وہ اشعر چاچو کے گلے کا ہار بنا رہتا۔

☆......☆......☆

پورٹیکو میں گاڑی پارک ہوئی تو اشعر اور اس کے والدین نیچے اترے اور اندر کا رُخ کیا، اشعر نے ایک نظر گھڑی پر ڈالی رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا، اس نے مما پاپا کو گڈ نائٹ کہتے ہوئے جلدی سے اپنے کمرے کا رخ کیا مبادا ممی ابھی شادی نامہ نہ کھول کر بیٹھ جائیں، مسٹر اینڈ مسز افضل اپنے بیڈ روم کی جانب بڑھ گئے۔ اشعر نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کوٹ اتار کر ہینگ کیا اور الماری میں ہلٹکانے کے بعد ڈریس چینج کرنے کی غرض سے ملحقہ واش روم کا رُخ کیا، آرمی ٹریننگ نے ڈسپلن تو جیسے کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا اس پوری فیملی میں، جس کا منہ بولتا ثبوت اشعر کا یہ کمرہ تھا، مجال ہے جو ایک بھی چیز بے ٹھکانہ نظر آجائے، سگھڑ پن میں لڑکیوں کو بھی مات دے ڈالی تھی، کچھ آرمی میں ہونے کی وجہ سے اور کچھ اشعر کا مزاج بھی ایسا تھا کہ جگہ سے بے جگہ کوئی چیز برداشت نہیں ہوتی تھی۔

اشعر واش روم سے برآمد ہوا تو شاور لے کر فریش اور ڈریس چینج کر کے ایزی ہو چکا تھا، پانی کے قطرے اس کے بالوں میں اٹکے اس کے چہرے کی وجاہت کو مزید بڑھا رہے تھے، اوائل جون کے گرم دن تھے، دن میں گرمی اپنے جوبن پر ہوتی رات میں شدت کچھ کم ہو جاتی لیکن بنا ایئر کنڈیشنر نیند نہیں آتی تھی، اور اشعر کی عادت تھی گرمیوں میں رات کو سونے سے پہلے لازمی غسل کرتا تھا، بالوں سے پانی جھٹکتے ہوئے اس نے ای، سی آن کیا، بالوں میں برش پھیرا اور بیڈ پر سکون سے لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔

اور عجیب بات یہ ہوئی کہ آنکھیں بند کرتے ہی جیسے جادو کے زور پر ایک سفید پری نے ان انکھوں میں ڈیرے جما لیے۔

اشعر نے گھبرا کر انکھیں کھولیں، جب دوبارہ بند کیں تو پھر وہی، انکل احسان کے گھر کی اکلوتی پری اشعر کی آنکھوں میں آن بسی، پارٹی میں تتلی کی مانند ادھر سے ادھر جاتی سوہا پر جمی بے شمار ستائشی نگاہوں میں دو نگاہیں اشعر کی بھی تھیں، جنہیں وہ بار بار ادھر ادھر کرتا، خود کو دل ہی دل میں تنبیہہ کرتا کہ یہ ایک غیر اخلاقی حرکت ہے، لیکن نگاہیں جیسے اس کے بس سے باہر ہو چکی تھیں بڑی سرکشی سے ہر دو منٹ بعد سوہا کا طواف کرنے لگتیں، اور یہ سب بے اختیاری میں ہو رہا تھا، جبکہ اشعر کا شعوری طور پر اس میں کوئی ہاتھ نہ تھا، پھر گاڑی میں مما، پاپا کی گفتگو نے مزید اس کے خیالات کو مہمیز کیا لیکن وہ جیسے دل کی آواز پر کان نہ دھرنے کی قسم کھائے بیٹھا تھا، سو اپنے خیالات کو بے لگام نہ ہونے دیا، لیکن اب، اس وقت جبکہ آس پاس کوئی نہ تھا، تو اپنی انکھوں میں بسی اس شبیہ سے مزید نظر چرانا اس کے بس میں نہ رہا تو بند انکھوں سے اس کا دیدار کرتا گہری نیند میں چلا گیا۔

☆......☆......☆

جون کی صبح حسب معمول سورج کی چمکتی شعاعوں کے ساتھ احسان لاج میں اتری تھی، رات کی پارٹی کے نشانات ابھی تازہ تھے، خوشیوں کا خمار سوہا کی انکھوں میں اک نشہ بن کے ڈولتا نظر آتا تھا، ناشتے کی ٹیبل پر مسز احسان نے سوہا کی بلائیں

لیتے ہوئے کہا۔
ماشاءاللہ، کل میری بچی بہت پیاری لگ رہی تھی، اللہ ہر بری نظر سے بچائے، آمین۔
تب ہی مسٹر احسان نے کھنکھار کر گلہ صاف کرتے ہوئے کہا۔
ہاں پیاری تو لگنا ہی تھا، آخر بیٹی کس کی ہے۔۔۔ یہ کہہ کر شرارت بھری نگاہوں سے بیگم کو دیکھا تو وہ جھٹ سے بولیں۔
ظاہر ہے میری اور کس کی۔؟۔۔ تینوں ہی کھل کر ہنس دیے۔
تب سوہا نے کہا۔
مجھے خوشی ہے کہ میں اتنے پیارے مما، پاپا کی بیٹی ہوں، تب ہی تو پیاری ہوں۔
مسز احسان نے کہا، ماں صدقے جائے، اللہ میری لاڈلی کو سدا ہنستا مسکراتا رکھے، آمین۔
ناشتے کے بعد سوہا نے کہا، مما میں نے ابھی تک تمام گفٹس نہیں کھولے، میں اپنے روم میں جا رہی ہوں۔
ٹھیک ہے جاؤ بیٹا......
مسز احسان نے جاتی سوہا کی پشت کو تکتے ہوئے احسان صاحب کو مخاطب کیا۔
سُنیئے۔
جی جی سنایے میں ہمہ تن گوش ہوں۔
احسان صاحب نے اخبار سائیڈ پر کرتے ہوئے چائے کا کپ اٹھا کر سوالیہ نگاہوں سے بیگم کو دیکھا۔؟
آپ کو پتہ ہے کل کی تقریب میں کتنے لوگوں نے ہماری بیٹی کے لیے پسندیدگی کا عندیہ دیا ہے۔؟
مثلاً......؟...... احسان صاحب نے بیگم کی بات پر غور کرتے ہوئے سوال کیا تو بیگم احسان کہنے لگیں۔
مسز مصطفیٰ جن کے بیٹے نے حال میں ہی ایم بی اے کی ڈگری لی ہے دبے لفظوں میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کے بیٹے کو لمبے بالوں والی لڑکیاں بہت پسند ہیں، اور مسز کمال سوہا پر نظریں جمائے کہہ رہی تھیں دیکھو لو شائستہ اب تمہارا بھتیجا اپنی تعلیم مکمل کر کے لوٹنے ہی والا ہے، آ کر اپنے فادر کا بزنس سنبھال لے گا، بس اس کے آتے ہی مجھے اس کی شادی کرنی ہے، گو کہ انہوں نے صاف الفاظ میں نہیں کہا لیکن ان کا ارادہ لگتا ہے اپنی سوہا کے لیے، اور مسز واجدی.......
مسز احسان کی بات ادھوری رہ گئی کہ احسان صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روکتے ہوئے کہا۔
بس بس بس، ٹھیک ہے بیگم، جب کوئی باقاعدہ پروپوزل آئے گا تب دیکھا جائے گا، لیکن ایک بات یاد رہے، ہم اپنی بیٹی کی مرضی کے بنا کوئی فیصلہ نہیں کریں گے۔۔
ہاں بالکل، سوہا کی مرضی جانے بنا ہم کہیں ہاں نہیں کہیں گے، شائستہ بیگم نے تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا،
بلکہ بیگم آپ باتوں باتوں میں سوہا سے معلوم کرنا، اگر اس کا کہیں ارادہ ہے تو ضرور بتائے، ہم اپنی بیٹی کی پسند کا پورا خیال رکھیں گے،
لو آپ کی بیٹی کے تو ڈھب ہی نرالے ہیں، کل کہہ رہی تھی، مما، میں نے آپ لوگوں کی خوشی کی خاطر بی، ایس، سی کر لیا ہے، میری خواہش تھی کہ میں ارمی جوائن کرتی، لیکن آپ لوگوں نے مجھے ایموشنلی بلیک میل کیا کہ ہم اکلوتی بیٹی سے دوری برداشت نہیں کر سکتے، تمہیں آرمی جوائن کرنے کے بعد پہلے ٹریننگ پھر ڈیوٹی کی وجہ سے ہم سے دور

رہنا پڑے گا، وغیرہ وغیرہ، تب میں نے آپ کی بات مانی تھی نہ، اب پلیز زززز مجھے کچھ ایسا کرنے دیں جو میں اپنے شوق کی تکمیل کر سکوں۔؟۔

اب آپ ہی بتائیں کیا کر سکتی ہے سوہا......؟

ہاہاہا احسان صاحب نے بھرپور قہقہہ لگایا اور گویا ہوئے۔

بیگم، یہ اپنی سوہا پوری والد صاحب پر گئی ہے، لیکن مجھے فخر ہے کہ ہماری بیٹی ایک فرمانبردار بیٹی ہے، اگر چاہتی تو ہم سے ضد کر کے اپنی بات منوا سکتی تھی، لیکن اس نے ہماری رضا میں اپنا سر جھکا دیا ،تم ایسا کرو اگر تو سوہا آگے یونیورسٹی میں داخلہ لینا چاہتی ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ اسے اپنے ساتھ این، جی او میں شامل کر لو، اور اسے بتاؤ کہ آرمی کے بنا بھی لڑکیاں اپنے پاکستان کی خدمت کس طرح کر سکتی ہیں، اس دوران انشاء اللہ جلد ہی کوئی مناسب رشتہ دیکھ کر ہم اپنا فرض ادا کر دیں گے،

ٹھیک ہے، شائستہ احسان نے خوشدلی سے اپنے شوہر کی ہاں میں ہاں ملائی تو احسان صاحب نے محبت پاش نظروں سے بیگم کو دیکھتے ہوئے شرارتی انداز میں کہا،

یہی تو آپ کا وہ انداز ہے جس پر ہم آج بھی سو جان سے فدا ہیں۔

ہٹیئے بھی، آپ بھی نہ بس، بیگم احسان بے ساختہ جھینپ گئیں۔

☆......☆......☆

۔جاگنگ سے واپسی پر اشعر نے بٹلر سے جوس کا گلاس تھامتے ہوئے مما، پاپا کے متعلق پوچھا تو بٹلر نے بتایا کہ صاحب اور بیگم صاحبہ ابھی اٹھے ہیں ، بیڈٹی دے کر آیا ہوں، اپنے روم میں ہی ہیں۔

، اوکے، کہتا ہوا اشعر لان میں چہل قدمی کرنے لگا، دور افق پر صبح کا اعلان کرتا سورج اپنی شعائیں براہ راست زمین پر پھینک کر جون کے ہونے کی تصدیق کر رہا تھا تو ساتھ ہی اللہ کے حکم سے چلتی صبح کی ٹھنڈی ہوائیں لان میں لگے پھولوں سے ٹکرا کر مشام جاں کو معطر کر رہی تھیں۔

اشعر نے کچھ دیر لان میں چہل قدمی کی، پھر سورج کی بڑھتی تپش نے اسے اندر کا رخ کرنے پر مجبور کر دیا، وہ اندر داخل ہوا تو سامنے لاؤنج میں لگے صوفے پر مسٹر اینڈ مسز افضل براجمان خوش گپیوں میں مگن تھے، گڈ مورننگ......

کہتا ہوا اشعر بھی وہیں براجمان ہو گیا۔

ماما، پاپا نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے ایک نظر اشعر کے چہرے پر ڈالی، اور مسز صفیہ افضل نے کھنکھارتے ہوئے اشعر کو مخاطب کیا۔

بیٹا کافی دن ہو گئے تمہیں ٹریننگ سے آئے ہوئے، جلد ہی کہیں تمہاری تعیناتی کے آرڈر بھی آ جائیں گے، کیا سوچا تم نے۔؟۔۔

کس بارے میں مما، اشعر نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے پوچھا تو صفیہ بیگم مسکرا دیں۔

تم اچھے سے جانتے ہو بیٹا کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔

اُسی دم نائٹ سُوٹ میں ملبوس پانچ سالہ شہیر دوڑتا ہوا آ کر اشعر کی گود میں چڑھ کر بیٹھ گیا، پیچھے پیچھے بھابی......

گڈ مارننگ......

بھابی نے سب کو ایک نظر دیکھتے ہوئے کہا، پھر شہیر کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولیں۔

ممی یہ مجھے بہت تنگ کرتا ہے، دیکھ لیں میں چینج کروانا چاہ رہی تھی لیکن صاحبزادے نے واش روم سے نکلتے ہی دوڑ لگا دی،

اشعر نے جھک کر شہیر کے پھولے پھولے

گالوں پر پیار کیا اور بھابی سے کہا،
کوئی بات نہیں بھابی جان، آپ بعد میں چینج کروا دیجیئے گا، ابھی ہمارا شیر ایسے بھی اچھا لگ رہا ہے،
صفیہ بیگم نے بہو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا،
کوئی بات نہیں بہو، کبھی کبھی بچوں کی بھی مان لینی چاہیئے، آؤ بیٹھو ہمارے پاس،
ثوبیہ بھابی نیصو فیپر ساس کی بغل میں پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
لگتا ہے آج صبح صبح کوئی خاص بات ہے۔
ہاں بہو، کل پارٹی میں تم بھی چلتیں تو زیادہ اچھا تھا، مجھے ایک لڑکی اپنے اشعر کے لیے بھا گئی ہے۔
صفیہ بیگم نے مسکراتے چہرے سے بہو کو بتایا، تو اشعر نے بظاہر شہیر کے ساتھ کھیلتے ہوئے اپنے کان پوری توجہ سے ماں کی باتوں پر لگا دیئے۔
ہاہاہاہا بیگم یہ کوئی نئی بات تو نہیں، آپ کو تو ہر جگہ اشعر کے لیے لڑکی پسند آ جاتی ہے، مسئلہ تو یہ ہے کہ وہ آپ کے صاحبزادے کو بھی تو پسند آئے،،،
افضل صاحب نے بلند قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تو صفیہ بیگم نے خفگی سے دیکھا۔
آپ اپنے سپوت کو سمجھائیں تو نہ، اب میں یہ ذمے داری مکمل طور پر بہو کو سونپ رہی ہوں کہ بیٹا وہ تمہاری سنتا ہے،
صفیہ بیگم نے افضل صاحب کو کہتے کہتے ثوبیہ کو مخاطب کیا تو وہ گڑبڑا گئی،
جی جی ممی جی میں پوری کوشش کروں گی، پر یہ اس معاملے میں بات ہی نہیں کرنے دیتا،
ثوبیہ نے شکایتی انداز میں کہا تو اشعر نے مکمل طور پر اپنا دھیان ان سب کی طرف کیا اور سنجیدگی سے بولا،
سوری کہ آپ سب کو میں بار بار مایوس کرتا ہوں، لیکن آپ لوگ بھی تو سمجھنے کی کوشش کیجیئے نہ، کہ ابھی میں نے اپنا کیریئر اسٹارٹ بھی نہیں کیا، اس کے علاوہ مجھے ابھی شہیر کو بھی دیکھنا ہے، یہ میری ذمے داری ہے، میں اسے پڑھاؤں گا، لکھاؤں گا، اور انشاءاللہ ایک جواں جرأت فوجی بناؤں گا،
اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلنے کی دیر تھی کہ بھابھی نے کسی باز کی سی تیزی سے شہیر کو اشعر کی گود سے جھپٹ لیا، سب ہکا بکا رہ گئے،
ثوبیہ نے ایک نظر سب کو دیکھا اور جب بولی تو اس کی آنکھیں ہی نہیں آواز بھی آنسوؤں میں بھیگی محسوس ہوئی،
سوری، لیکن میں کسی کو اس بات کی اجازت نہیں دوں گی کہ شہیر کو آرمی کی تعلیم بھی دلوائے، فوجی بننا تو دور کی بات، میں نصر کی طرح اسے کھونا نہیں چاہتی، نہ مجھ میں اتنی ہمت ہے،
یہ کہہ کر تیزی سے اندر کی طرف بڑھ گئی،
لاؤنج میں یکلخت سناٹا چھا گیا، ایک دم پن ڈراپ سائلنس۔۔۔
اس خاموشی کو صفیہ بیگم کی اواز نے توڑا،
صحیح کہا بہو نے، اشعر تمہیں ابھی یہ سب نہیں کہنا چاہیئے، ثوبیہ کا زخم تازہ ہے،، بھرتے بھرتے دیر لگے گی، مانا کہ ہمارا جان سے پیارا بیٹا گیا تو اس کا تو سہاگ ہی لٹ گیا نہ، اس کی تو دنیا ہی اجڑ گئی ہے بیٹا،
بس اسی لیے تو میں شادی نہیں کروانا چاہتا، کہ ایک طرف وطن کی محبت ہو اور دوسری طرف رشتوں کی زنجیریں، تو انسان کمزور پڑ جاتا ہے،
اشعر نے موقع دیکھتے ہی اپنے دل کی بات کہتے ہوئے ایک جھٹکے سے اٹھتے ہوئے کہا،
لاؤنج میں افضل صاحب اور صفیہ بیگم بیٹھے رہ گئے، ایک دم سے جیسے جون کے سورج کی ساری

تپش اے سی کے ماحول میں رچ بس گئی،

☆......☆......☆

اشعر کی تعیناتی کے احکامات آ گئے تھے۔ اسے ایک ماہ کی قلیل مدت کے لیے واہگہ بارڈر پر اپنی ڈیوٹی دینا تھی، حفاظتی مورچوں میں رہتے ہوئے دشمن کی سرحد پر نظر رکھنا تھی،

اس دن کے بعد سے کسی نیا شعر کی شادی کا موضوع نہیں چھیڑا تھا، اور اشعر بھی اس سفید پری کی شبیہہ کو مکمل نظر انداز کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا، جبکہ بارہا اس شبیہہ نے اس کی سوئی، جاگتی پلکوں پر دستک دی تھی لیکن اس نے مسلسل اگنور کرتے ہوئے اپنی تمام تر توجہ کا مرکز جیسے صرف اشعر، ممی، پاپا اور بھابی کو بنا لیا تھا،

اب جب اس کی تعیناتی کے آرڈر آئے تو پہلی بار ڈیوٹی جوائن کرنے کا جوش، ملک کے لیے کچھ کر دکھانے کا جذبہ جیسے اس کا لہو گرمانے لگا تھا۔

فائنل تیاری ہو گئی تھی، گھر سے نکلنے کا ٹائم ہو رہا تھا، شہیر نے اپنی بانہیں اشعر کے گلے کے گرد حمائل کی ہوئی تھیں اور مسلسل اشعر کے کان کھا رہا تھا،

چاچو آپ کب آئیں گے،؟۔ چاچو میں کس کے ساتھ کھیلوں گا،؟۔ چاچو مما مجھے مارتی ہیں، آپ ان کو منع کر کے جائیں،

اشعر نے شہیر کو بھینچ کر جیسے خود میں سموتے ہوئے کہا،

چاچو کی جان، چاچو جلد آپ کے پاس آ جائیں گے، پھر ہم خوب کھیلیں گے، اور میں سب کو کہہ دوں گا کہ کوئی میرے شہزادے کو ڈانٹے نہ، لیکن آپ بھی ایک پرومس کرو۔۔

وہ کیا چاچو؟۔۔

وہ یہ کہ آپ مما کو تنگ نہیں کرو گے، جو مما کہیں گی وہی کرو گے، کھانا خوب پیٹ بھر کے کھاؤ گے اور سب سے اہم یہ کہ اب کچھ دنوں میں ہی آپ کا اسکول میں ایڈمیشن کروا دیا جائے گا، تو بنا روئے آپ اسکول جاؤ گے، پرومس......؟

اشعر نے اپنا ہاتھ پھیلایا تو شہیر نے اپنی ننھی منی ہتھیلی اشعر کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا، پکا پرومس چاچو۔۔۔

ٹھیک ہے، پھر آپ کو کوئی نہیں ڈانٹے گا،

ثوبیہ، صفیہ بیگم، اور افضل صاحب مسکراتے ہوئے چچا، بھتیجے کی گفتگو سن رہے تھے جب واچ مین نے کسی مہمان کے آنے کی اطلاع دی،

سب لاؤنج میں ہی براجمان تھے، واچ مین مہمانوں کو وہیں لے آیا، تو صفیہ بیگم تو جیسے کھل اٹھیں،

مسٹر اینڈ مسز احسان سوہا کے ہمراہ بڑے بڑے پھولوں کے بکے لیے کھڑے تھے،

سلام دعا کے تبادلے کے بعد مسز احسان نے بتایا دو تین دن پہلے جب صفیہ بیگم سے بات ہوئی تو انہوں نے اشعر کی ڈیوٹی لگنے کے متعلق بتایا تھا، تو ہم نے سوچا بچہ پہلی بار اپنے فرض کی ادائیگی کے لیے جا رہا ہے جا کر مبارکباد دینی چاہیئے، خیر سے کب جا رہے ہیں صاحبزادے......؟

بس بھابی ابھی کچھ دیر میں نکلنے ہی والے ہیں، یہاں سے لاہور کی فلائٹ ہے پھر وہاں سے آگے انہیں لے جایا جائے گا، مورچوں تک،

افضل صاحب نے بتایا تو سب نے اشعر کی کامیابی و کامرانی کی دعا مانگی، اور مسز احسان نے بتایا کہ جب میں نے سوہا سے ذکر کیا تو سوہا نے کہا مما مجھے بھی ملنا ہے، دراصل سوہا کو بچپن سے ہی اپنے دادا ابو کی وجہ سے بہت لگاؤ ہے پاک آرمی سے، اور اچھا ہوا جو ہم آج ہی آ گئے کیونکہ مجھے یہ کنفرم نہیں تھا کہ اشعر بیٹا کس دن جا رہا ہے،

مسز احسان نے وضاحت دیتے ہوئے بات مکمل کی تو دفعتاً سوہا اور اشعر کی نگاہیں بے ساختہ ایک دوسرے کی طرف اٹھیں، اور اشعر کو لگا وہ ان نگاہوں میں ڈوب گیا ہے، اب کوئی راہِ فرار ممکن نہیں، عین وقتِ روانگی یہ کیسا ستم نازل ہوا جو دل کی دنیا تہہ و بالا کر گیا،

سوہا بڑے اشتیاق سے اشعر کو تک رہی تھی، اشعر کے دلی جذبات سے قطعی انجان اپنی ازلی خود اعتمادی سے گویا ہوئی،

مجھے بہت اچھا لگا یہ سن کر کہ آپ وطن کی خدمت کرنے، اس کی سرحدوں کی حفاظت کرنے جا رہے ہیں، اللہ آپ کو ہر مشن میں کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کرے اور وطن کا نام روشن کرنے کی توفیق عطا کرے، امین۔

اشعر جو اس کے لہجے کے اتار چڑھاؤ کے زیرِ اثر اس کی آنکھوں کے طلسم میں ڈوبا ہوا تھا، ایک دم چونک کر بولا،

بہت شکریہ آپ کا، بس دعا کریں اللہ مجھے شہادت کے رتبے سے سرفراز کرے، کہ میری یہ زندگی اس وطن کی امانت ہے۔

مسٹر احسان نے بے ساختہ آمین کہتے ہوئے کہا۔

جزاک اللہ بیٹا، بالکل وہی جذبہ جو مسٹر افضل اور انکل کے ساتھ میرے والد صاحب میں بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، اللہ تمہیں لمبی عمر عطا کرے، غازی بن کر لوٹنا بیٹا کہ ماں باپ کی آنکھیں دروازے پر لگی رہتی ہیں۔

ماحول ایک دم سنجیدہ و رنجیدہ ہو گیا تھا۔

انشاء اللہ انکل جی، ایسا ہی ہوگا، میں صرف ایک ماہ کے لیے جا رہا ہوں، بس یہ تو ایک آرزو ہے اللہ سے کہ ایک دن کبھی نے جانا ہے تو شہادت کا رتبہ مل جائے تو اور کیا چاہیئے،

اشعر نے کہتے کہتے ماں کو دیکھا جو چپکے چپکے اپنی آنکھیں صاف کر رہی تھیں،

اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے اشعر ماں کے قدموں میں جا کر بیٹھ گیا،

ممی، پلیز آپ ایسا کریں گی تو میں جا نہیں سکوں گا، خوشی خوشی رخصت کیجیے نہ، دیکھیے ٹائم کتنا کم رہ گیا ہے،

اچانک سوہا اپنی جگہ سے اٹھ کر مسز افضل کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور بولی،

آنٹی جی، آپ بہت خوش قسمت ہیں کہ اس دیس کی محبت آپ کے بچوں کی رگوں میں لہو بن کر دوڑ رہی ہے، مجھے مما نے سب بتایا نصر بھائی کے بارے میں بھی اور یقین جانیئے میں بنا دیکھے، بنا ملے ان سے ازحد متاثر ہوئی ہوں، اللہ نے آپ کے بیٹے کی جنت پکی کر دی، اب انشاء اللہ اشعر بھائی ملک کی خدمت پورے جذبے سے کریں گے اور مجھے یقین ہے یہ ہر محاذ سے غازی بن کر آپ کے پاس لوٹیں گے،

اشعر ایک سائیڈ پر ہو کر پوری دلچسپی سے اس کامنی سی لڑکی کو دیکھ رہا تھا جو اس کی ماں کو بھرپور حوصلہ دے رہی تھی،

صفیہ بیگم نے سوہا کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے اس کی پیشانی چوم لی اور بھرے لہجے سے بولیں، آمین،

☆......☆......☆

اشعر کو ایئر پورٹ پر رخصت کر کے احسان صاحب اپنی فیملی کے ساتھ وہیں سے اپنے گھر آ گئے،

مسز احسان نے چینج کر کے سوہا کے کمرے میں جھانکا جو سونے کی تیاری کر رہی تھی، گڈ نائٹ

کہتے ہوئے شائستہ بیگم نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور اپنے بیڈروم میں آگئیں،
احسان صاحب لیپ ٹاپ پر کچھ سرچ کر رہے تھے جب بیڈ پر بیٹھتے ہوئے شائستہ بیگم نے انہیں مخاطب کیا،
سنیئے۔؟۔
جی جی، فرمائیے بیگم، میں سن رہا ہوں، احسان صاحب ہنوز مصروف انداز میں کہا تو، شائستہ بیگم نے ہاتھ بڑھا کر لیپ ٹاپ ایک سائیڈ پر کر دیا۔
احسان صاحب نے چشمہ اتارتے ہوئے کہا،
افوہ، میں سن رہا ہوں، کہیئے۔۔
وہ ائیر پورٹ پر مجھ سے صفیہ بھابی نے پوچھا تھا کہ کیا ہم نے سوہا کی کہیں بات پکی کی ہے، تو میں نے بتایا نہیں،
تو وہ کہنے لگیں
اگر آپ کو برا نہ لگے تو ایک بات کہوں۔؟۔۔
میں نے کہا کہیئے۔۔
تو انہوں نے کہا، شکر ہے، آپ ایسا کیجئے کہ پلیز اگر ایک ماہ میں کہیں اپ کا ارادہ بنتا بھی ہے تو آپ نہ کیجیئے گا، مین گھما پھرا کر بات نہیں کروں گی، صاف اللفاظ میں اپ کو بتا دوں کہ سوہا بیٹی مجھے بہت پسند آئی ہے، اور میں چاہوں گی کہ وہ میرے گھر کا ہی ایک فرد بن جائے جیسا کہ آپ دیکھیں وہ کس طرح ثوبیہ اور شہیر کے ساتھ گھل مل گئی ہے،
تب میں نے غور کیا سوہا ثوبیہ اور شہیر دونوں کے ساتھ بھرپور انجوائے کر رہی تھی، اور دوسری بات کہ آپ کو تو پتہ ہی ہے پاک آرمی کے لیے سوہا کے کیا جذبات ہیں، اسے بھی یقیناً کوئی اعتراض نہیں ہوگا، لیکن میں نے پھر بھی صفیہ بھابی سے یہ کہا ہے کہ،
میں سوہا کے والد سے بات کر کے آپ کو جواب دوں گی،
ساری بات سن کر احسان صاحب سوچ میں گم ہو گئے، پھر گویا ہوئے،
بیگم بات یہ ہے کہ سوہا ہماری اکلوتی بیٹی ہے، بے شک وہ وطن کے رکھوالوں کے لیے، بہت اچھے جذبات رکھتی ہے، لیکن اگر نصر کی طرح خدانخواستہ اشعر بھی۔۔۔۔ان سے بات مکمل نہ کی گئی،
تم نے اس بچی کو دیکھا، ثوبیہ کو کیا عمر ہے ابھی اس کی۔؟۔۔کیا وہ باقی ماندہ عمر نصر کے نام پر گزار دے گی،۔؟۔گزار پائے گی۔؟۔۔کیا یہ آسان کام ہے۔؟۔۔
شائستہ بیگم بھی سوچ میں پڑ گئیں۔۔
کہہ تو اپ ٹھیک رہے ہیں، لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ اشعر کے ساتھ بھی وہی ہو۔؟۔۔اللہ اسے کامیابیوں سے نوازے اور ساتھ لمبی عمر بھی عطا کرے۔
سوچ کے کئی در وا ہوئے اور کوئی سرا ہاتھ نہ آیا تو احسان صاحب نے شائستہ بیگم کو تسلی دیتے ہوئے کہا، فکر نہ کرو، ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ ہماری بچی کے لیے وہی کرنا جو اس کے حق میں اچھا ہو، ابھی دیکھتے ہیں کہ کیا کرنا ہے، صفیہ بھابی کا فون ائے اس سلسلے میں تو کہہ دینا، کہ ابھی ایک ماہ پڑا ہے، ہم سوچ کر جواب دیں گے۔

☆......☆......☆

مورچے میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا اشعر میلوں دور بیٹھے اپنوں کو یاد کر رہا تھا، خاص طور پر شہیر کو مس کر رہا تھا، اس کی باتیں اپنے ساتھیوں سے شئیر کر رہا تھا، جب دفعتاً راحیل نے سوال کیا،
یار سچ سچ بتانا، شہیر کے ساتھ ساتھ اور کون ہے جو تجھے یاد آرہا ہے......؟
شرارتی لہجہ اس کی شرارت کی چغلی کھا رہا تھا،

ایک پیاری سی مسکان اشعر کے لبوں کو چھو گئی تو یار دوستوں نے گھیر لیا، دیکھا گھر والوں کو یاد کرنا اک بہانہ ہے، یاد کسی اور کو کیا جا رہا ہے،

ارے نہیں یار ایسی کوئی بات نہیں، تم سب غلط سوچ رہے ہو اتنی سخت روٹین میں ایسا کوئی موقع ابھی تک نہیں آیا،

کیا یار، کون سی سخت روٹین۔؟۔۔ ہم بھی ان تمام سختیوں سے گذرے ہیں، لیکن ہمیں تو ناز ہے کہ کوئی ایسا بھی ہے جو ہم پر جان دیتا ہے، جو ہماری راہ میں انکھیں بچھائے بیٹھا ہے، فیض نے ایک آنکھ میچتے ہوئے کہا تو سب ہنس پڑے...... راحیل نے کہا۔

ہاں نہ یار دیکھ تو میں اپنی منگیتر کو چھوڑ کر آیا ہوں، جو ایک ایک پل گن رہی ہوگی میری واپسی کا......

تب اشعر نے بڑی مشکل سے ان کو یقین دلاتے ہوئے اپنی جان چھڑائی کہ میں نے کبھی کسی کے بارے میں ایسا نہیں سوچا نہ ہی ایسا کوئی موقع لائف میں ایا ہے۔

لیکن رات کو اپنی چھوالداری میں لیٹے اس کی آنکھوں میں وہ نازک پری چھم سے اتر آئی جو اسے پہلی ملاقات میں ہی بھائی کا درجہ دے گئی، اس کی سادگی یاد کر کے بے اختیار اشعر مسکرا دیا، اب اکثر ایسا ہی ہونے لگا تھا کہ جہاں اسے تھوڑا سا اکیلے میں ٹائم ملتا ان تنہائیوں میں شہیر کی جگہ سوہا اس کی دمساز بن کر اس کے ساتھ ساتھ ہوتی، وہ عادی ہوتا گیا اس کے تصور کا......

☆......☆......☆

صفیہ بیگم کافی سے زیادہ خوش تھیں کہ ان کا لاڈلا محمد انس دس دن کے لیے گھر آیا تھا، اب جبکہ اسکولز کی چھٹیاں اختتام پذیر تھیں، لیکن آرمی اسکولز میں چونکہ کلاس نہم کے پیپرز کی تیاری کے سلسلے میں کلاسز ہو رہی تھیں سو وہ گھر نہ آسکا تھا اب جبکہ چھٹیاں ختم ہونے میں محض دو چار دن باقی تھے تو اسے دس دن کی رخصت ملی تھی، اب گھر میں چہار سُو شہیر کی کلکاریوں کے ساتھ ساتھ انس کی مستیاں بھی باعث رونق تھیں، مزید یہ کہ اشعر کی پہلی تعیناتی کی قلیل مدت بھی ختم ہوئی تھی اور ایک دو روز میں وہ بھی واپس آ رہا تھا، گھر میں جشن کا سا سمان تھا،

صفیہ بیگم نے ثوبیہ کے ساتھ مل کر پورا پلان ترتیب دے لیا تھا کہ اس بار اشعر سے نہ صرف ہاں کہلوانی ہے بلکہ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کے مقولے پر بھی عمل درآمد کرنا ہے، تب ہی ڈھیروں خریداری کی جا رہی تھی، روز شاپنگ مال کے چکر لگ رہے تھے۔

آخر 25 جولائی کی ایک مبارک صبح اشعر گھر لوٹ آیا مانو گھر کی رونق میں چار گنا اضافہ ہو گیا، انس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کا اپنا ہی مزہ تھا تو شہیر کی شرارتوں سے بھی جی بھر کر لطف اندوز ہوا جا رہا تھا۔

ایسے میں صفیہ بیگم نے چپکے سے شائستہ بیگم کو فون کر ڈالا کہ وہ کسی بھی دن آ رہے ہیں سوہا کا ہاتھ مانگنے، تب مسٹر احسان نے جو اللہ کو منظور کہتے ہوئے اجازت دے دی، اور شائستہ بیگم سے سوہا کا عندیہ معلوم کرنے کے لیے کہا جو حسب توقع "جیسا آپ مناسب سمجھیں" کے جواب کے ساتھ آیا تو مسٹر اور مسز احسان بیٹی کی خوشیوں کے لیے اللہ کے آگے سر بسجود ہو گئے،

☆......☆......☆

پھر تو جیسے صفیہ بیگم اور ثوبیہ نے اشعر کا ناک میں دم کر دیا اٹھتے بیٹھتے سوہا کے نام کی مالا جپی جانے لگی، بالآخر اشعر نے ہتیار ڈال دیئے تو دونوں کو اتین اپنی کامیابی پر پھولی نہ سمائیں بتا یہ جانے کہ جو واردات اشعر کے دل پر گذر چکی

یہ "ہاں" اسی کی بدولت ملی ہے، اور اشعر ایسا گھنا کہ کسی کو اپنے دل کی خبر نہ ہونے دی اور فرمانبرداری کا ٹائٹل بھی اپنے نام لگوالیا،

پانچ اگست کی خوشگوار شام صفیہ بیگم، افضل صاحب، ثوبیہ، انس اور شہیر کے مختصر قافلے کے ساتھ سوہا کے ہاتھ میں اشعر کے نام کی انگوٹھی پہنا آئے، اور ساتھ ہی شادی کے لیے ٹھیک ایک ماہ بعد کا ٹائم رکھا کہ اب صفیہ بیگم مزید انتظار کے موڈ میں نہ تھیں، ملنے جلنے والے سب ہی اپنی اپنی بیٹیوں کے لیے آس لگائے بیٹھے تھے، ایک دم سب کو دھچکا لگا جب شادی کی ڈیٹ بھی فکس ہوگئی، خیر قرعہ فال میں تو ظاہر ہے ایک ہی نام نکلنا تھا اور وہ نام "سوہا احسان" کا تھا، جب شادی کی تاریخ ٹھیک ایک ماہ بعد رکھنے کا کہا گیا تو شائستہ بیگم نے کہا ٹھیک ہے اگلے ماہ ہی کی کوئی تاریخ رکھ لیں گے، میں آپ کو اس سلسلے میں کل فون کر کے بتا دوں گی کہ کون سی تاریخ رکھی جائے، ذرا بچوں سے بھی پوچھ لیا جائے تو مناسب ہے، چلیے یہ بھی ٹھیک ہے، صفیہ بیگم نے خوش دلی سے کہا۔

رات میں جب سوہا اپنی انگلی میں موجود انگوٹھی پر نظریں جمائے سوچوں میں گم بیٹھی تھی تو صفیہ بیگم نے سوہا کا سر سہلاتے ہوئے کہا۔

ہماری بیٹی خوش تو ہے نہ

سوہا نے ایک نظر مما کو دیکھا اور شرماتے ہوئے سر جھکا لیا، اور شرمگیں انداز میں بولی،

بالکل خوش ہوں مما، آپ تو جانتی ہیں آرمی سے جڑے لوگ ہمیشہ میرا آئیڈیل رہے ہیں، لیکن آپ یقین کیجیے میں نے ایسا کبھی سوچا بھی نہ تھا، لیکن اب میں سوچ رہی ہوں میں بہت خوش قسمت ہوں، تھینک یو مما، اپ نے مجھے زندگی میں ہر وہ خوشی دی ہے جس کی میں نے چاہ کی،

اللہ تمہیں سدا خوش اور آباد رکھے میری بچی، شائستہ بیگم نے نم آنکھوں سے سوہا کے سر پر بوسہ دیتے ہوئے کہا،

اچھا مجھے تم سے ایک بات پوچھنا تھی،

صفیہ بیگم نے اگلے مہینے کی کسی بھی تاریخ میں شادی کے لیے کہا ہے، ان کی خواہش ہے کہ اب سے ٹھیک ایک ماہ بعد شادی ہو جائے، یعنی ستمبر کے پہلے ہفتے میں، تم بتاؤ کون سی تاریخ رکھی جائے

ایک لمحے کے لیے سوہا نے سوچا اور پھر بے اختیار بولی۔ "چھ ستمبر"

شائستہ بیگم ہنس دیں اور بولیں، وہ کیا یادگار تاریخ منتخب کی ہے میری بیٹی نے، سوہا جھینپ گئی،

سدا خوش رہو شائستہ بیگم مسکراتی ہوئی صفیہ بیگم کو فون کرنے اپنے کمرے کی طرف چل دیں،

☆......☆......☆

چھ ستمبر، ایک یادگار دن اس دن سے جڑی بے شمار یادیں جو دادا ابو کے حوالے سے ہمیشہ زندگی کا حصہ رہی تھیں، آج وہی تاریخ ہمیشہ کے لیے سوہا کی زندگی کا حصہ بننے جا رہی تھی،

مہندی، مایوں، جیسے مراحل سے گذرتے ہوئے بالآخر رخصتی کی گھڑی بھی آ گئی، سوہا قرآن پاک کی چھاؤں میں ماں باپ کی دعاؤں کے ساتھ صفیہ بیگم کے گھر اور اشعر کے دل کی دنیا آباد کرنے چلی آئی،

پچھلے ایک گھنٹے سے بیڈ پر بیٹھے بیٹھے سوہا کی کمر درد کرنے لگ گئی تھی، ایک دو بار دل میں آئی کہ آرام سے لیٹ جائے پر پھر ایک انجانا سا دھڑکا کہ جانے کب اشعر اندر آ جائیں، اور اس طرح لیٹے دیکھ کر نہ جانے کیا خیال کریں، بس یہی سوچ کر دکھتی کمر کے ساتھ اسٹیچو بنے بیٹھی تھی، جب ثوبیہ شہیر کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔

دروازے کی آہٹ پر سوہا جو خود میں ہی سمٹ گئی تھی، بھابی کو دیکھ کر ریلیکس ہوگئی، شہیر نے بیڈ پر چڑھتے ہوئے کہا،
مما یہ چاچو کی دلہن ہیں۔؟۔۔
جی بیٹا جی یہ آپ کے چاچو کی دلہن ہیں،
مما، میری دلہن کہاں ہے۔؟۔۔
سوہا کو ہنسی آگئی اس نے شہیر کو گود میں بھرتے ہوئے کہا، ہم آپ کی دلہن بھی لے آئیں گے جلد ہی...... شہیر خوشی سے کھلکھلا اٹھا۔
سوہا، میں یہ پوچھنے آئی تھی کہ تمہیں کچھ چاہیئے تو بتادو، میں لیٹنے لگی تھی تو سوچا تم سے پوچھ لوں،
سوہا نے متشکرانہ انداز میں ثوبیہ کو دیکھا اور بولی شکریہ بھابی، آپ آرام کیجیئے مجھے کچھ نہیں چاہیئے، آپ بھی تھک گئی ہوں گی،
ثوبیہ نے کہا،
ہاں تھک گئی ہوں، لیکن یقین کرو سوہا تمہارے آنے سے میں بہت خوش ہوں، اشعر میرا دیور نہیں بلکہ یوں سمجھو میرا سگا بھائی ہے، اپنے بھائی کے بعد سے اس نے میرا بالکل ایک بہن کی مانند خیال رکھا ہے، بہت خوبصورت دل کا مالک ہے ہمارا اشعر، اور سب سے بڑی بات اس کے دل میں کبھی کسی کی پرچھائیں نہیں رہی، تم بہت خوش قسمت ہو بنو رانی، آخری بات کہتے ہوئے ثوبیہ نے پیار سے سوہا کی ٹھوڑی کو چھوا تو سوہا شرما گئی۔

☆......☆☆

ثوبیہ کے جانے کے پندرہ منٹ بعد دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی اواز آئی تو سوہا جو نیند کے جھونکوں کے زیرِ اثر تھی ایک دم کانشس ہوگئی،
اشعر دھیرے دھیرے چلتا ہوا پہلے الماری کی طرف گیا پھر آکر بیڈ کے کنارے ٹک کر گلہ کھنکار کر جیسے الفاظ جمع کرنے لگا۔
آخر کار ''السلام علیکم'' کی آواز سوہا کی سماعت سے ٹکرائی۔
وعلیکم السلام، سوہا نے مدھم اواز میں جواب دیا تو چند لمحے خاموشی کی نظر ہوگئے، پھر اشعر نے ہمت مجتمع کرتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر سوہا کا ہاتھ تھامتے ہوئے مخملیں ڈبیا سے ڈائمنڈ رنگ نکال کر سوہا کی انگلی میں پہنادی اور ہاتھ کی پشت کو اپنے لبوں سے مس کرتے ہوا آہستگی سے چھوڑا تو سوہا کسمسا کر رہ گئی۔
تب ہی اشعر نے خواب اگیں لہجے میں اپنے دل پر گذری واردات سے سوہا کو آگاہ کیا تو سوہا گنگ رہ گئی...... یکدم بولی۔
یقین جانیئے مجھے بالکل بھی نہیں پتہ تھا کہ اپ میرے بارے مین اس طرح سوچتے ہیں۔
تب ہی اشعر نے شرارت سے ہنستے ہوئے کہا ہاں میں جانتا ہوں، اگر تمہیں میرے جذبات کا پتہ ہوتا تو اُس دن ہمارے گھر میں یوں ''بھائی'' کہہ کر میرے جذبات کا خون نہ کرتیں۔ بے ساختہ سی مسکراہٹ سوہا کے لبوں کا احاطہ کرگئی تو اشعر کا دل بے ایمان ہونے لگا۔
سوہا جیسے چھ ستمبر کو بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تھا، بالکل ویسے ہی آج تم نے میرے دل پر اپنے معصوم حسن سے بھرپور حملہ کرڈالا ہے، فرق یہ ہے کہ بھارت کے ارادے مذموم تھے جن کی بدولت ناکامی ان کا مقدر ہوئی اور تم نے جو حملہ کیا ہے اس میں ناکامی میرا مقدر ہوگئی کہ میرا دل، میرا وجود سب تمہارے آگے ہار چکے ہیں، یہ شاندار فتح مبارک ہو میری حسین ہمسفر، مخمور انداز میں کہتے کہتے اشعر نے سائیڈ لیمپ آف کردیا تو چہار سُو محبتوں کا اجالا پھیل گیا۔

☆☆......☆☆

کالے جادو کی بھیانک دنیا میں ایک خدارسیدہ عامل کی داستان

عامل کامل

کالی دنیا، جادو، جنات، ٹونے ٹوٹکوں، سیاہ دل لوگوں کی کالی دنیا، جہاں دوشیزاؤں کو جادو کی بھینٹ چڑھانا، شیطان کو خوش کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ تھا' اس دنیا میں ایک دین اور ایمان والے نے کس طرح ٹکر لی، اور اس ٹکراؤ کے نتیجے میں پیش آنیوالے دلچسپ، عبرت ناک، سبق آموز واقعات......

دین وایمان کی کشمکش کی داستان

چوتھی قسط

پیر شاہ محمد قادری

''پرسوں...... تم یہاں سے نکال دیے جاؤ گے......'' بالآخر اس نے بتا ہی دیا۔

''وہی گیارہ تاریخ......؟''

''ہاں......''

''اس کے بعد کیا میں اپنے گھر جاسکوں گا؟''

میرا دوسرا سوال تھا' جس پر وہ خاموش رہی۔

''بتائیں...... آپ چپ کیوں ہیں؟'' میں نے تھوڑی دیر بعد اسے ٹوکا۔

''ہوسکتا ہے کہ تم چلے جاؤ اپنے گھر......'' اس نے گول مول سا جواب دیا۔

''آپ یقین سے کیوں نہیں کہہ رہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کی اک وجہ ہے......'' اس نے جواب دیا۔

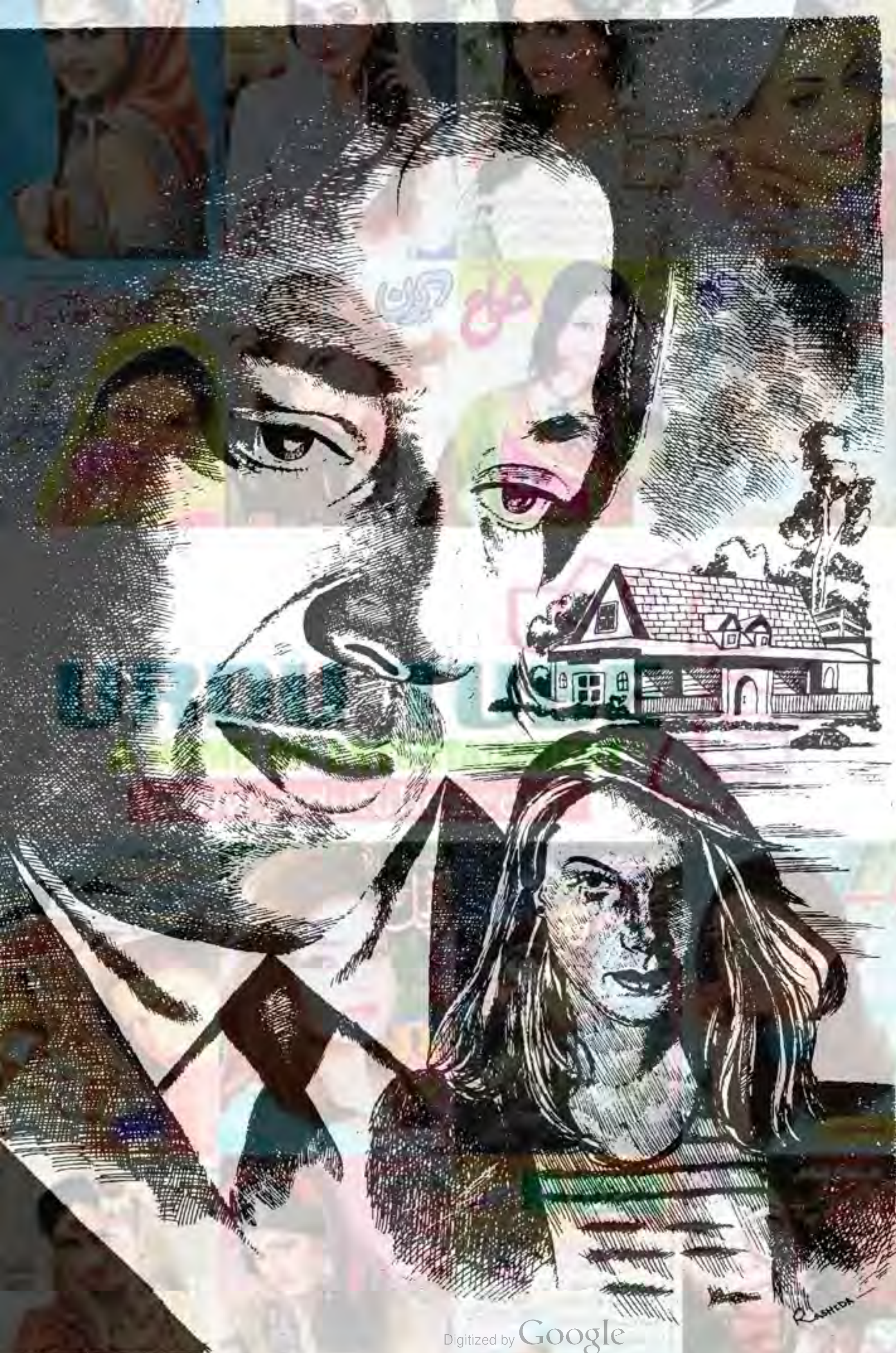
''کیا آپ بتانا پسند کریں گی......؟''

''تم حوصلہ نہیں کر پاؤ گے سننے۔'' اس کا لہجہ پراسرار تھا: ''اس لیے رہنے دو۔''

''مجھے جن حالات کا سامنا ہے اور میں جس مصیبت کا شکار ہوں' کیا میں اس کے متعلق نہیں سنوں گا......؟ واہ......! میرا مسئلہ ہے اور میں خود ہی اس سے روگردانی کیسے کروں گا؟''

''یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے'' اس کا انداز اب بھی وہی تھا۔

''تو پھر...... کس کا مسئلہ ہے......؟''


RASHIDA

''بھینٹ کا......!''
''کیا مطلب ہے......؟ بھینٹ......؟'' میں چونکا۔
''ہاں...... اور اس وجہ سے تمہاری خاطر مدارت بھی ہو رہی ہے۔''
''میں اب بھی اس بات کا مطلب نہیں سمجھا......!''
''اچھا...... یہ بتاؤ تم نے قربانی کے جانور دیکھے ہیں!''
''ہاں...... کیوں نہیں......''
''ان کو کس طرح کھلایا پلایا جاتا ہے' ان کا خیال رکھا جاتا ہے......''
''ہاں...... تو پھر......!''
''تو پھر یہ کہ...... تمہیں بھی اسی مقصد کیلیے یہاں رکھا گیا ہے اور تمہاری تواضع کی جا رہی ہے...... گیارہ تاریخ کو تمہیں قربان کر دیا جائے گا......''
''کیا کہہ رہی ہو تم......؟''
''میں سچ کہہ رہی ہو۔'' اس نے گہری سنجیدگی سے کہا: ''میں نے تمہیں بتایا تھا کہ پرسوں جشن ہے۔
بس...... اسی جشن کے موقع پر یہ کام ہوگا' ہم لوگ شیطان کے پجاری ہیں...... اور ہر سال ہم یہ دان کرتے ہیں......''
میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔
☆......☆......☆
میں نے اپنے والد صاحب کے ساتھ کن کن جگہوں پر وظیفے کیے تھے۔ یہاں تک کہ میں نے قبرستان کے اندر' شکستہ قبروں کے درمیان میں رہ کر بھی رات کا انتہائی وقت گزارا تھا اور اس وقت بھی مجھے اتنا خوف محسوس نہیں ہوا تھا کہ جو اس وقت گلنار کی باتیں سن کر میرا حال ہوا تھا۔ نہ جانے کتنے لمحوں تک میری یہی کیفیت رہی۔ یہ بھید اچانک ہی گلنار نے کھولا تھا اور اس بھید میں اتنی ہیبت پوشیدہ تھی کہ میں اس وقت یہ بھول ہی گیا کہ میں کون ہوں اور کن صلاحیتوں کا مالک ہوں۔
''یہ...... یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟'' میرے منہ سے نکلا۔
''میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں۔'' وہ اداس سے انداز میں مسکرائی: ''اور اب یہ بات اپنے دل میں ہی رکھنا۔''
''یعنی دل میں ہی لے کر اس دنیا سے چلا جاؤں!'' میں نے سوال کیا۔
اس نے فوری طور پر مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔
وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ پھر اس نے ایک طویل سانس لی اور بولی۔
''میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ یہی سب کچھ دیکھتی ہوئی آ رہی ہوں۔ حالانکہ نہ جانے کیا بات ہے کہ میں اندرونی طور پر ان باتوں سے ہرگز مطمئن نہیں ہوں...... میں کیا کروں' مجبور ہوں۔''
''اب تک تم لوگوں نے کتنے معصوموں کا خون کیا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔
''میں کہہ رہی ہوں نا کہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے۔ یہی سب کچھ دیکھ رہی ہوں اور اب اکتا چکی ہوں......''
''ہوں......'' میں نے ہنکارا بھرا: ''کیا تم لوگ ابتداء ہی سے اسی گاؤں میں ہو؟''
''نہیں...... یہ کیوں پوچھا تم نے؟''
''ایسے ہی...... معلومات کیلیے' اس گاؤں

سے پہلے تم لوگ کہاں تھے؟''
''شہر میں تھے...... ابھی چند سالوں پہلے ہی یہاں آئے...... اور یہ گاؤں نہیں ہے۔''
''گاؤں نہیں ہے تو پھر......؟''
''یہ بستی ہے' شیطان کے پجاریوں کی بستی۔ اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔
''یہاں سب اس کے پیروکار ہیں اور یہ ایک پوشیدہ راز ہے...... یہاں باقاعدہ حکمت عملی کے ذریعے اپنا ہولڈ قائم کیا گیا ہے...... اور اس تمام منصوبے کے پیچھے ایک بہت بڑا ہاتھ ہے......''
''کس کا ہاتھ ہے؟''
''وہ شہر میں ہی رہتا ہے...... اور ایک اہم عہدے پر فائز ہے۔ وہ اس درخت کی طرح ہے جس کی جڑیں بہت دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں ہے...... بہت سے امراء اس سے مرعوب رہتے ہیں۔
بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کئی دولت منداس کی مٹھی میں ہیں...... اس کے علاوہ بھی اس کے ہر سطح پر کافی گہرے تعلقات ہیں...... اب یہی دیکھ لو...... اس نے یہاں بستی آباد کر رکھی ہے اور ہمیں ہر قسم کی سہولتیں فراہم کی ہیں......
اور یہاں کی سربراہی کا اختیار ہمارے پاس ہے...... اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا یہ مذہب خاندانی ہے...... جبکہ اس بستی میں موجود اکثریت آبادی کو ہر قسم کے لالچ دے کر اس مذہب میں لایا گیا ہے......!''
''اوہ......'' میں سناٹے میں آ گیا: ''تو کیا...... نئے لوگ بھی اس شامل ہو رہے ہیں؟''
''ہاں......'' اس نے سر ہلایا۔
''کیونکہ جب ہم لوگ یہاں آ کر آباد ہوئے تھے تو چند ہی لوگ ہمارے ہمراہ تھے' لیکن پھر آہستہ آہستہ ان میں اضافہ ہونے لگا اور اب دیکھ لو...... میرے خیال میں اب ہم کئی گنا زیادہ کی تعداد میں ہیں۔''
اس نے بتایا اور میرا دل ہول کر رہ گیا...... یہ کس قدر بھیانک اور گھناؤنی سازش کا جال تھا' جس میں لوگوں کو نہ جانے کن طریقوں سے گمراہ کر کے اس جال میں پھنسایا جاتا تھا...... اف......! یہ تو سراسر ظلم تھا' ایسا ظلم کہ جس میں کسی رخ سے بھی رحم کی کوئی امید نہیں تھی...... شیطان کے پیروکار ہونے کا مطلب یہ تھا کہ بس جہنم واصل ہونا...... اس کے علاوہ تو کوئی اور صورت ہی نہیں تھی۔
اس بستی کا مقصد ہی یہ تھا کہ یہاں جو بھی آ کر آباد ہو رہا تھا' وہ اپنی عاقبت کو تباہ برباد کر رہا تھا۔ میرے جسم میں جھرجھری سی آ گئی۔
''کیا تم مجھے اُس عہدیدار کا نام بتا سکتی ہو......؟''
''کیوں......!'' وہ چونک کر بولی: ''تم کیا کرو گے؟''
''اسے گالیاں دوں گا......!'' میں نے کہا: ''نام لے کر بددعا دوں گا اسے...... مرنے والے کی دعا اور بددعا جلد قبول ہوتی ہے۔''
''اس کا اصل نام مجھے نہیں معلوم......'' اس نے بتایا: ''ابن شاقال کے نام سے مشہور ہے...... ویسے لوگ اسے عام طور پر کرسی صاحب بھی کہتے ہیں......''
''یعنی چیئرمین......؟''
''نہیں...... کرسی صاحب ہی کہا جاتا ہے......''
''کہاں رہتا ہے وہ......!''
''شہر میں ہی رہتا ہے۔ اُس کی لال اینٹوں

سے بنی ہوئی کوٹھی کا نام ابن شاقال ہی ہے......!''

''اوہ......'' میرے منہ سے نکلا: ''اچھا اب یہ بتاؤ کہ تم لوگ بھی اس سے ملاقات کرتے ہو......!''

''ہاں...... لیکن کبھی کبھی...... کوئی خاص میٹنگ ہوتی ہے تو اس میں وہ ہمیں بلاتا ہے اور بستی وغیرہ کے مسائل پر گفتگو کرتا ہے......''

''اور...... سالانہ جشن میں......!''

''ہاں...... وہ آتا ہے' لیکن تھوڑی دیر کیلیے......!''

''ہوں......'' میں نے طویل سانس لی: ''اب میرا کیا ہوگا گلنار......!''

''میں نے تمہارے بارے میں فیصلہ کرلیا ہے۔''

''کیا......! بتاؤ......!''

''میں کل رات میں تمہیں یہاں سے نکال دوں گی۔'' اس نے جواب دیا: ''لیکن برائے مہربانی پھر تم یہاں سے دور چلے جانا...... دور بہت دور......!''

''میری ایک بات مانو گی......!''

''ہاں...... بولو......!'' اس نے میری طرف دیکھا۔

''پہلے مجھے ایک بات بتاؤ......!''

''وہ بھی پوچھ لو......!'' گلنار پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔

''تم لوگوں کی کوئی نشانی ہے...... میرا مطلب ہے کہ کوئی ایسی چیز جو تمہیں شیطان کا پیرو کار ظاہر کرتی ہو......؟''

''ہاں...... کیوں......؟''

''پہلے بتاؤ......!''

یہ ہے......'' اسے ہتھیلی پر رکھ کر میرے سامنے کردیا۔

اس پر نظر پڑتے ہی میں ٹھٹک گیا۔ یہ تو وہی شبیہ تھی' جو بلا کی صورت میں میرے خواب میں آئی تھی...... ہاں...... یہ ہو بہو وہی تصویر تھی...... اسے میں تصویر ہی کہوں گا۔

کیونکہ اسے بڑی مہارت سے دھاگے کے ذریعے بنا گیا تھا...... اب غور سے دیکھنے پر معلوم ہو رہا تھا کہ یہ شبیہ واقعی شیطان کی خیالی تصویر تھی......

''یہ ہر اس انسان کے پاس ہوگی' جو شیطان کا پیروکار ہوگا۔'' گلنار نے بتایا: ''یوں سمجھ لو کہ یہ ہمارا امتیازی نشان ہے......''

''ہوں...... کیا تم مجھے یہ دے سکتی ہو......؟''

''کیوں......؟ تم کیا کرو گے اس کا......؟''

''بس...... مجھے کام ہے...... اگر دے سکتی ہو تو بتاؤ......؟''

''یہ تمہیں دے کر میں کسی دشواری میں نہ پڑ جاؤں......!''

وہ تشویش سے بولی۔

''تم اس بات کی فکر مت کرو...... ایسا کچھ نہیں ہوگا......!'' میں نے اسے تسلی دی۔

''ٹھیک ہے...... یہ لو۔'' اس نے وہ تصویر مجھے دے دی: ''لیکن خیال رکھنا' میں نہ پھنس جاؤں......''

''بے فکر رہو...... اور ہاں...... یہ بتاؤ کہ کیا تمہارے بھائیوں سے میری ملاقات ہو سکتی ہے!''

''ہاں...... وہ لوگ کل ضرور تمہارے پاس آئیں گے اور تمہاری خیر خیریت معلوم کریں گے......!''

''ٹھیک ہے......!'' میں نے سر ہلا دیا۔
''ایک بات کہوں......!'' وہ بولی۔
''ہاں...... بولو......!''
''کیا تم اب بھی میری خواہش پوری نہیں کرو گے؟'' اس نے عجیب سے انداز میں کہا: ''تم یقین کرو کہ وہ خواہش اب میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا بن چکی ہے......''
''دیکھو گلنار......'' میں نے جواب دیا: ''تم جو چاہتی ہو' میں اس سلسلے میں تمہارا کوئی ساتھ نہیں دے سکتا۔
کیونکہ یہ غلط کاری ہے اور میری مجبوری ہے کہ میں اس قبیح فعل میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا...... مجھے معاف کر دینا......!''
''ایسا تو مت بولو......'' اس نے جلدی سے کہا: ''گناہ گار تو میں ہوں تمہاری' معافی تو مجھے مانگنی چاہئے...... کیونکہ میری ہی وجہ سے تم اس وقت یہاں نظر آ رہے ہو۔''
''مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔
''کل جب میں تمہیں یہاں سے رخصت کر دوں گی۔ تو تم مجھے بہت یاد آؤ گے...... قسم سے......!''
''میں نہیں جاؤں گا......''
''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' وہ چونکی۔
''کیا پاگل ہو گئے ہو؟''
''نہیں' میں اپنے ہوش میں ہوں' میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔''
''لیکن کیوں......؟''
''بس تم دیکھتی جاؤ' تم نے صحیح وقت پر صحیح آدمی کا انتخاب کیا ہے۔'' میں مسکرایا۔
''یعنی؟'' اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں! ''کیا تم بھینٹ چڑھنا چاہتے ہو؟''
''میں ابھی کچھ نہیں بتاؤں گا۔ البتہ تم کل رات میں میرے پاس ضرور آنا......!''
''میں واقعی جا رہی ہوں' تمہاری کوئی بات میرے پلے نہیں پڑ رہی۔''
وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
اور پھر وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

☆......☆......☆

دوسرے دن شام کے وقت دونوں بھائی پھر آئے تھے۔ میرے خیال میں ''اہل قرباں'' کی دیکھ بھال کیلیے یہی دونوں مامور تھے۔ کیونکہ دو دن قبل بھی ان ہی کی شکلیں دکھائی دی تھیں۔ انہوں نے حسب عادت بڑے نرم انداز میں میری خیریت دریافت کی' میں نے اس دوران بے حد غمگین اور دکھی ہونے کے تاثرات چہرے پر سجا لیے۔
''کیا بات ہے! تم کچھ پریشان دکھائی دے رہے؟''
''کیا اس قید میں کوئی خوش رہ سکتا ہے؟''
''تمہیں یہاں کیا تکلیف ہے؟''
''راحت کیا ہے یہاں میرے لیے......؟''
میرے لہجے میں درد تھا: ''اب میں یہ سوچ رہا ہوں کہ جو کچھ میں نے کیا تھا' مجھے یہ اسی کی سزا مل رہی ہے...... خواہ مخواہ میں کسی کی باتوں میں آیا اور میں نے اپنی زندگی تباہ کر ڈالی......''
''کیا مطلب ہے......؟'' ایک بھائی نے مجھے گھورا۔
''ہم سمجھے نہیں تمہارا مطلب......؟''
''اب میں تمہیں کیا سمجھاؤں...... کسی آدمی نے میری دنیا ہی بدل دی تھی...... اس نے مجھے ایک نئی دنیا کی راہ دکھائی تھی۔

یہ دنیا سبز باغ کی طرح تھی...... آہ...... میں کیوں اس کی لگی لپٹی باتوں میں آ گیا...... اور اب یہ سب کچھ میرے ساتھ ہو رہا ہے......!''

''تم صاف صاف بتاؤ' کیا کہنا چاہتے ہو......؟''

''میں نے...... اپنا مذہب بدل ڈالا تھا اور یہ میں نے کسی کی باتوں میں آ کر کیا تھا...... لیکن مجھے کیا صلہ ملا......؟ میرا ایمان بھی گیا اور...... ذلت و رسوائی کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگا...... دیکھو نا......! اب ایک انجانی اور بے جرم کی قید کی سزا بھگت رہا ہوں۔''

''کس مذہب سے تعلق ہے تمہارا......؟''

دوسرے بھائی نے دلچسپی سے پوچھا۔

''یہ مت پوچھو......'' میں نے دکھ بھرے لہجے میں کہا: ''بس میں کسی کے بہکاوے میں آ گیا اور اس نے مجھے شیطان کے وسوسے میں ڈال دیا......''

''شیطان......!!!'' ان دونوں کے منہ سے نکلا۔

''ہاں...... یہ دیکھو......!!'' میں نے کلائی پر بندھی ہوئی شیطان کی تصویر ان کے سامنے کر دی۔

اس کا ردعمل میری توقع کے عین مطابق تھا' وہ دونوں جھجک کر پیچھے ہٹے تھے اور ان کی آنکھیں حیرت کے مارے ابل پڑیں......

دنیا بھر کی حیرت ان کے چہرے پر دکھائی دے رہی تھی۔

''تم لوگوں کو کیا ہوا؟'' اب حیران ہونے کی باری میری تھی۔

ان دونوں کے منہ سے فوری طور پر کچھ نہ نکل سکا۔ وہ ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ رہے تھے' پھر ان میں سے ایک کے منہ سے نکلا:

''تو کیا...... اس بار غلط آدمی کا انتخاب ہو گیا......!''

دوسرے کے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا' اس وقت میں ہونقوں کی طرح ان کی شکلیں تکنے میں مصروف تھا' ظاہر ہے کہ مجھے یہی تاثر دینا تھا کہ میں ان دونوں کی حیرت اور پریشانی کو سمجھ نہیں پا رہا۔

''تمہارا کیا مطلب ہے بھائی صاحب......!'' میں نے اب حیران ہو کر پوچھا تھا۔

''کک...... کچھ نہیں......'' وہ گڑبڑا کر بولا۔

پھر اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے مجھ سے پوچھا: ''تمہیں کس نے اس راہ پر لگایا تھا......؟''

''میں نہیں جانتا وہ کون تھا......!'' میں نے جواب دیا: ''میں تو ایک بھیانک جرم میں ملوث تھا۔ اس لیے آنکھیں بند کر کے اس کے ساتھ یہاں چلا آیا۔

اس نے مجھے خیموں والی بستی میں لا کر چھوڑ دیا تھا اور مجھ سے کہا تھا کہ وہ جلد ہی لوٹ کر آئے گا اور میرے لیے آنے والی زندگی کو بہترین انداز میں گزارنے کا انتظام کرے گا...... بستی کا سردار اس کا واقف کار تھا' اسی لیے مجھے وہاں پناہ مل گئی تھی۔ میں نے اپنے گاؤں میں ایک فرد کو جھگڑے کے دوران قتل کر دیا تھا اور پولیس میری تلاش میں تھی......''

''اوہ......'' ان کے منہ سے نکلا۔

''ہاں...... اور اب میں شیطان کا پیروکار بن جانے کے نتیجے میں سزا بھگت رہا ہوں...... آہ......!!''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' ایک بھائی

آگے بڑھ کر بولا: ''ابھی یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ شیطان کو اپنا آقا تسلیم کر کے تم نے کتنا بہترین قدم اٹھایا ہے...... ورنہ تم اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے......!''

''کیا مطلب......!'' میں نے حیرت ظاہر کی۔

''ہم بھی شیطان کے پیروکار ہیں۔'' اس نے بتایا: ''اور کل ہم تمہیں بھینٹ چڑھانے والے تھے......''

''اوہ......!!'' میرے منہ سے نکلا۔ میں اس وقت کافی زبردست اداکاری کر رہا تھا۔

''ہاں...... لیکن اب تمہاری بھینٹ کا تصور بھی جرم ہے۔ تم ہمارے ہی بھائی بند ہو...... آؤ......! باہر نکل آؤ...... اب یہ قید خانہ تمہارے قابل نہیں ہے...... ہم تمہیں بہترین جگہ فراہم کریں گے......!''

میرے چہرے پر حیرت اور خوشی کے آثار نمودار ہو گئے۔ مجھے قید سے رہا کر دیا گیا اور پھر اس عمارت کے نزدیک ایک چھوٹے سے مکان میں میری رہائش کا انتظام کر دیا گیا جو کہ خالی پڑا تھا۔ لیکن اس چھوٹے سے مکان میں ہر قسم کی سہولت موجود تھی۔

گلنار کے ایک بھائی نے مجھ سے کہا تھا: ''فی الحال تم تنہا ہی یہاں قیام کرو' جشن کے بعد تمہاری شادی کا انتظام بھی کر دیا جائے گا۔ تاکہ تمہاری تنہائی ختم ہو جائے۔''

''میں آپ کا ممنون ہوں گا......'' میں نے جواب دیا: ''اور آپ کا احسان مند رہوں گا۔''

''ہمارا نہیں بلکہ شیطان عظیم کا احسان مانو......'' وہ سنجیدگی سے بولا: ''اگر تم اس کے حامی نہ ہوتے تو کل تمہاری زندگی کا آخری دن ہوتا۔ دیکھ لو...... وہ عظیم ہستی کس قدر مہربان ہے......''

میں نے سر ہلاتے ہوئے دل ہی دل میں لاحول پڑھا تھا۔ یہ سب کچھ تو وقتی تھا اور یوں بھی لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے۔ میں ان شیطانوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کا خواہش مند تھا اور اس سلسلے میں مجھے اپنے ساتھی یعنی سردار پچل کی بے حد ضرورت تھی۔ کیونکہ اس کے بغیر اپنے منصوبے کی تکمیل شائد میرے لیے ممکن نہیں تھی۔ یوں تو میرے لیے گلنار بھی بے حد معاون ثابت ہوئی تھی۔

لیکن اب جو قدم مجھے اٹھانا تھا اس کیلیے پچل جیسے مضبوط ہاتھوں کی ضرورت تھی۔

اب میں اس نئے گھر میں تھا۔ میں نے اس کا جائزہ لیا' یہاں بڑے کمرے میں دیوار پر شیطان کی وہی تصویر آویزاں تھی' لیکن یہ کافی بڑے سائز میں تھی۔

اس میں شیطان کا چہرہ کافی واضح دکھائی دے رہا تھا۔

اس وقت میں نے چند وظائف پڑھے اور اس کے بعد اپنے مؤکلوں کو حاضر کیا' آج خلاف توقع وہ آموجود ہوئے' میرے دل میں اطمینان کی لہر سی دوڑ گئی۔

پھر انہوں نے مجھے جو اشارات دیئے' ان کی روشنی میں میں نے بالکل صحیح راہ کا تعین کیا تھا اور اب مزید آگے کی حکمت عملی کا دارومدار حالات پر تھا۔ مجھے آج ہر صورت میں پچل سے ملاقات کرنا تھی۔

میرا ذہن گلنار کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا' اسے اب تک میرے متعلق خبر مل چکی ہوگی اور نہ جانے اس کا ردعمل کیا ہوا تھا......! ویسے وہ تھی تو

بہت ہوشیار......! یقیناً اس نے وقتی طور پر تو اپنے آپ کو سنبھال لیا ہوگا......

ہوسکتا ہے کہ وہ کسی وقت مجھ سے ملنے کی کوشش کرے اور پھر میرا خیال درست نکلا۔ دوپہر کو چلچلاتی ہوئی دھوپ میں وہ میرے سامنے آدھمکی۔ اس کے چہرے پر بے چینی کے آثار نمایاں تھے۔

وہ فوراً ہی بولی۔

''یہ تم نے کیا کیا ہے......؟ تم فرار کیوں نہیں ہوئے! میں نے رات کو تمہیں سمجھایا تھا۔''

''کیا تم اس زندگی سے تنگ آچکی ہو......؟'' میں نے جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کیا۔

''ہاں...... تو پھر......! کیا خودکشی کر لوں......؟''

''نہیں......'' میں نے نفی میں سر ہلایا: ''میرا ساتھ دو......!''

''تمہارا ساتھ...... کیا مطلب......؟''

''میں جشن والے دن یہاں معرکہ کروانا چاہتا ہوں' ایسا معرکہ...... کہ جس کا نتیجہ ایسا حل نکال دے کہ پھر کبھی اس دن کی نوبت ہی نہ آسکے......!''

''مطلب کیا ہے تمہارا......!''

''میں ان شیطان کے پجاریوں کو انجام سے دوچار کرنا چاہتا ہوں۔'' میرے لہجے میں مضبوط عزم تھا: ''اور اس سلسلے میں میں نے اپنے دوست سے مدد لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ قریبی گاؤں کا سردار ہے۔''

یہ سن کر وہ میری شکل دیکھتی رہ گئی۔ پھر تھوڑی دیر بعد اس نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا:

''تم......کون ہو......؟ مجھے سچ بتاؤ......!''

''تمہارے سامنے تو موجود ہوں اور انسان ہوں۔''

''ہاں......تم انسان ہو' لیکن کوئی عام انسان نہیں ہو' تم مجھے اپنی اصلیت سے آگاہ کرو...... ابھی اور اس وقت......!''

''اچھا سنو......!'' میں نے کہا: ''میں نے اپنا گھربار چھوڑ دیا ہے اور اب میری زندگی کا صرف یہ مقصد ہے کہ میں نیکی کا ساتھ دوں اور برائی کو روکوں...... اسی بنیاد پر میرے سفر کا آغاز ہوا ہے اور اس پر سفر کا اختتام ہوجائے گا...... میری منزل موت ہے' جو کسی وقت بھی سامنے آجائے' مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے......''

''کیا تم تنہا برائی کو روکنے کی طاقت رکھتے ہو!''

''میں اپنی کوشش کرسکتا ہوں۔ آگے میرے رب کی مرضی......!''

یہ سن کر وہ تھوڑی دیر خاموش رہی۔ پھر میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولی:

''تم نے شاید یہ سب کچھ آسان لیا ہے' تم کرسی صاحب سے ابھی واقف نہیں ہو...... وہ واقعی شیطان کا پرکالا ہے۔''

''طاغوتی قوتیں کتنی بھی مضبوط ہوں' لیکن روحانی قوتوں کے آگے وہ بے بس ہو جاتی ہیں...... یہ بات یاد رکھنا......!''

''تو پھر تم مجھے اپنی اصلیت سے آگاہ کرو......تم اتنے اعتماد سے یہ بات کہہ رہے ہو' تم خود کیا......!''

''مجھے رب العزت پر بھروسہ ہے' وہ ان مردودوں کے خلاف مجھے ضرور قوت عطا کرے گا...... اب تم یہ بتاؤ کہ اس جشن کا اہتمام کہاں ہوگا......!''

''ہماری حویلی میں ایک تہہ خانہ ہے۔ اس

میں خاص خاص لوگ داخل ہوتے ہیں، وہیں پر شیطان کا بہت بڑا بت موجود ہے اس بت کے سامنے بھینٹ کی رسم ہوگی، اس کے بعد جشن منایا جائے گا......''

''اسی تہہ خانے میں......!''

''نہیں...... یہاں سے ذرا فاصلے پر ہی ایک چھوٹا سا میدان ہے۔ بستی کے لوگ وہاں پہلے ہی سے جمع ہوں گے...... بھینٹ چڑھانے کے بعد وہ خاص لوگ اس میدان میں پہنچیں گے، اس وقت ہی جشن کا آغاز ہوگا......!''

''جشن میں کیا ہوتا ہے......؟''

''سور کے گوشت سے بنا ہوا کھانا، شراب اور'' وہ بولتے بولتے رک گئی۔

''اور کیا......؟''

''مجھے شرم آرہی ہے......!''

''اوہ...... لیکن بتا دو تو اچھا ہے......! تم سے تفصیل پوچھنے کی وجہ یہ ہے کہ میں ہر ایک زاویے سے واقف ہو جاؤں...... تاکہ مجھے اپنا کام کرنے میں آسانی ہو......!''

''بہت سی لڑکیاں وہاں لائی جاتی ہیں، جو بے لباس ہوتی ہیں...... وہ وحشیانہ رقص کرتی ہیں...... اور پھر......! بس میں اس سے زیادہ نہیں بتا سکتی......!''

''ہوں...... سب کچھ انتہائی شرمناک اور وحشیانہ ہے......'' میں نے سر ہلایا: ''ٹھیک ہے...... اب تم میرے ساتھ شامل ہو جاؤ...... ہم لوگ مل کر اس شیطان کھیل کا خاتمہ کر دیں گے......!''

''میں تمہارا ساتھ دینے کیلیے تیار ہوں...... مجھ سے جو کچھ ممکن ہوا کروں گی۔''

''ہوں...... اچھی بات ہے......'' میں نے سر ہلایا: ''کیا آج رات میں تم یہاں آسکتی ہو!''

''کیوں......؟'' اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

''میں تہہ خانے کا راستہ دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''رات کے وقت......!''

''ظاہر ہے...... دن میں تو یہ ممکن نہیں ہے۔ ہم لوگوں کی نظر میں آجائیں گے۔''

''ہاں...... یہ بات تو ہے...... ٹھیک ہے، بس رات میں آجاؤں گی......''

''آج رات میں ہی مجھے اپنے دوست کے پاس بھی جانا ہے...... کیا کروں......!''

''تم رات کو کھانے کے بعد نکل جانا، اس وقت بستی کے لوگ بھی سیر وتفریح میں مگن ہوتے ہیں...... یہ موقع اچھا ہوگا......''

لیکن پھر جلد واپس آنے کی کوشش کرنا، پھر میں رات میں ہی کسی وقت آجاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے......! اور ہاں...... بھینٹ اب کیسے ہوگی......؟''

''کیوں......؟ کیا ہوا......؟''

''مجھے تو اس سے بری کر دیا گیا ہے۔''

''وہ لوگ خود ہی انتظام کریں گے۔ دیکھو...... کس معصوم کی جان پر آتی ہے......''

جواباً میں خاموش رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پوچھا:

''تم نے کھانا کھایا......!''

''نہیں......''

''ٹھیک ہے۔ اب میں جا رہی ہوں۔ کھانا بھجوا دیتی ہوں...... کھا لینا......!'' یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد ہی گلنار کے گھر کا ایک ملازم کھانے کی ٹرے اٹھائے ہوئے اندر داخل ہوا اور

کھانا میز پر رکھ کر چلا گیا۔
میں نے کھانے کا جائزہ لیا اور سالن دیکھ کر نہ جانے کیوں میرے دل نے اسے کھانا گوارا نہ کیا۔ اس میں گوشت دیکھ کر شاید میری یہ کیفیت ہوئی تھی......
ان شیطانوں کا کیا بھروسہ......! ہوسکتا تھا کہ یہ بھی سور کا ہی گوشت ہوتا......
اس ٹرے میں پھل بھی موجود تھے۔ میں نے ان ہی پر گزارا کیا اور سالن کو ٹھکانے لگا دیا تا کہ ان لوگوں کو اس بات کا علم نہ ہو کہ میں نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔
اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے اسے چند وظائف کا ورد کیا اور پھر بستر پر دراز ہو گیا۔ ہوسکتا تھا کہ آج کی رات جاگنا پڑتا۔ اس لیے میں اس وقت ذرا سو جانا چاہتا تھا۔ تا کہ رات میں تازہ دم رہ سکوں۔
اور پھر رات کو کھانے کے بعد میں گھر سے باہر نکل آیا' میں نے اس وقت بھی وہی چیزیں پیٹ میں اتاری تھیں کہ جن پر مجھے حلال ہونے کا بھروسہ تھا۔ گلنار کی بات بالکل درست تھی' اس وقت ہر طرف رونق اور شور شرابے کا دور دورہ تھا۔
ہر کوئی اپنی مستی میں مگن تھا' بعض نوجوان جوڑوں کو میں نے کھلے عام شرمناک حرکتیں کرتے ہوئے دیکھا اور لرز کر رہ گیا۔
اس بستی کا ایک سرسری جائزہ لینے کے بعد میں نے موقع دیکھا اور بستی سے باہر نکل آیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ سردار سچل کا گاؤں یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ چنانچہ میں پیدل ہی نکل کھڑا ہوا۔
تھوڑی دیر بعد ہی مجھے خیمے دکھائی دینے لگے۔ خود بہ خود ہی میرے قدموں کی رفتار تیز ہو گئی۔ جلد ہی میں ایک خیمے کے سامنے موجود تھا' جس میں یقیناً سچل موجود تھا۔ میں نے آواز لگائی:
''سردار سچل......!!''
فوراً ہی سردار کی حیرت میں ڈوبی ہوئی شکل دکھائی دی اور وہ مجھ سے یوں لپٹ گیا' جیسے برسوں سے بچھڑا ہو' مجھے اپنی پسلیوں کی خیر منانا پڑی...... پھر جب وہ مجھ سے الگ ہوا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے' وہ بھرائی ہوائی آواز میں بولا:
''کہاں چلے گئے تھے بادشاہ سائیں......! کیا ناراض ہو گئے ہم لوگوں سے......؟''
''ارے نہیں بھئی سردار......! تم لوگوں سے بھلا کیا ناراضگی......! وقت کم ہے' مجھے تم سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں......!''
''آؤ......اندر تو آؤ......!''
''تمہاری بیگم......'' میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔
''وہ ایک طرف سو رہی ہے......''
''اوہ......تو پھر کہیں اور چلو......اس کی نیند میں خلل ہوگا......!''
''ارے آ جاؤ...... کچھ نہیں ہوتا۔ وہ اب سکون سے سو رہی ہے تو یہ بھی تمہاری ہی کرامت ہے......ورنہ تو وہ راتوں کو جاگتی ہی رہتی تھی...... ویسے بھی وہ گہری نیند میں ہے' اٹھے گی نہیں......''
میں اندر آ گیا۔ جہاں پلنگ پر نصیباں سو رہی تھی' ہم دونوں دری پر آ بیٹھے اور پھر میں نے مختصراً اسے شیطان کی بستی کا حال بیان کر دیا' نہ جانے کتنی دیر تک وہ حیرت میں مبتلا رہا اور پھر اس کے منہ سے نکلا:
''اف......اللہ سائیں کی پناہ......! اتنا کچھ ہو رہا ہے یہاں......اور ہمیں خبر ہی نہیں۔''

''ہاں...... دیکھ لو...... مجھے بھی بس اتفاق سے ہی ان کے بارے میں حالات کا علم ہو گیا۔''

''ان لوگوں کی عادتوں کی بناء پر ہم لوگ دور دور ہی رہتے تھے اور میرے خیال میں وہ لوگ جان بوجھ کر ہی خود کو وحشی اور پاگل ظاہر کرتے ہیں تاکہ کوئی ان کے معاملات میں دخل اندازی نہ کرے اور ان کی اصلیت سے واقف نہ ہو سکے۔''

''ہاں...... تمہاری بات میں کافی وزن ہے۔''

''تو پھر...... اب کیا کرنا ہے بادشاہ سائیں......؟''

''حملہ......!!'' میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

''کب......! کیا ابھی......! بولو تو میں ابھی اٹھاتا ہوں سب کو......!''

''نہیں سردار...... ابھی موقع نہیں ہے...... یہ کام کل پر اٹھا رکھو......''

''ٹھیک ہے بادشاہ سائیں......! ہم لوگ تیار رہیں گے...... بس تم اشارہ کرو......!''

''مجھے فی الحال ایک پستول دو اور مجھے اسے چلانے کا طریقہ بھی بتا دو...... میں پھر تمہیں اپنے پروگرام سے آگاہ کرتا ہوں۔'' اتنی دیر میں میں ذرا غور بھی کر لوں......''

اور پھر تقریباً ایک گھنٹے بعد میں وہاں سے نکلا تو میرے کپڑوں میں پستول اڑسا ہوا تھا۔ سردار نے مجھے نہر کے کنارے تک چھوڑا تھا' پھر میں نے نہر عبور کی اور الوداعی ہاتھ ہلا دیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد میں بستی کے نئے مکان میں موجود تھا۔ یہاں آتے ہی میں نے پستول کو چھپا دیا تھا۔ اب مجھے انتظار تھا گلنار کا...... جواب کسی وقت بھی آ سکتی تھی۔

گلنار آ گئی' لیکن آدھی رات کے بعد اس نے اپنی شکل دکھائی تھی۔ میں انتظار کرتے کرتے سوکھ گیا تھا۔

''تم آج اتنی دیر میں آئی ہو!''

''ہاں...... وہ لوگ آج کافی دیر تک جاگتے رہے۔ کل جشن ہے نا' اس لیے اس کی تیاری میں سب ہی مصروف ہیں...... اب جا کر ان لوگوں نے بستروں کا رخ کیا ہے۔''

''اوہ ہاں...... یہ تو میں بھول ہی گیا۔'' میں نے سر ہلایا: ''اب کیا پروگرام ہے تمہارا......!''

''چلو میرے ساتھ...... لیکن پہلے......''

''پہلے کیا......؟''

''کیا تم اب بھی میری خواہش کو پورا نہیں کرو گے؟''

''تم پھر بہکنے لگیں؟''

''کیا کروں......! اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔''

''میں نے تمہیں اپنی مجبوریوں سے آگاہ کر دیا تھا' اب بتاؤ میں کیا کروں......؟''

''تم مجھے بتاؤ نا کہ میں کیا کروں......؟''

''تم مجھے بے ہوش کر کے اپنی تمنا پوری کر سکتی ہو۔''

''اس سے کیا فائدہ ہوگا......؟ کیا تم تھوڑی دیر کیلئے میری خاطر کچھ نہیں کر سکتے؟''

''نہیں گلنار......! میں بہت مجبور ہوں......!''

''اچھا...... اٹھو......'' اس کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی: ''چلو میرے ساتھ......!''

میں نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی اور ایک طویل سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا' پھر ہم دونوں

باہر نکل آئے تھے...... چاروں طرف سناٹے کا راج تھا' لوگ بے تحاشہ تفریح اور شور شرابے کرنے کے بعد اب تھک ہار کر سو رہے تھے......

گلنار مجھے اپنی کوٹھی نما مکان کے پچھلے حصے میں لے آئی تھی۔ یہاں ایک چھوٹا سا دروازہ موجود تھا' جو مقفل تھا۔

گلنار نے چابی نکالی اور مقفل میں گھما کر دروازہ کھول دیا۔ اس کا چہرہ بجھا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے جو کچھ ہوا تھا' شاید وہ ابھی تک اسی کے زیر اثر تھی۔ پھر اس نے مجھے اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا' میں نے چاروں طرف دیکھا' یہ جگہ مجھے جانی پہچانی دکھائی دی' یہ یقیناً مکان کا وہ حصہ تھا' جہاں ان لوگوں کا قید خانہ تھا۔ گلنار مجھے اسی طرف لے آئی۔ قید خانے کے ترتیب وار کمروں میں سے ایک میں روشنی دکھائی دے رہی تھی' اس کا مطلب یہ تھا کہ گلنار کے بھائی میرے بعد کسی اور کو بھینٹ چڑھانے کیلیے پکڑ لائے تھے...... کتنے ظالم تھے یہ لوگ...... جابر اور سفاک......!

ان لوگوں کیلیے میں نے اپنے دل میں شدید نفرت محسوس کی' جو انسانیت کو حرام کھلا رہے تھے' زنا کار بنا رہے تھے اور شیطان کے ناپاک ارادوں کو پروان چڑھانے میں مددگار ثابت ہو رہے تھے۔

گلنار مجھے قید خانے کی عقبی جانب سے لے کر آگے بڑھی۔ جہاں ایک چھوٹا سا اسٹور موجود تھا۔ اس نے اسٹور کا دروازہ آہستگی سے کھولا اور اندر جا کر مجھے بھی پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

''یہاں تو بہت اندھیرا ہے......!'' میرے منہ سے نکلا' لیکن آواز مدھم تھی۔

''فکر مت کرو...... میرے پاس ٹارچ موجود ہے...... اس اندھیرے کا مجھے پہلے ہی اندازہ تھا...... آؤ...... میرا ہاتھ تھام لو......'' اس کی بھی سرگوشی سنائی دی۔

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر اس نے نہ جانے کیا کیا' اچانک ہی دیوار میں خلاء سا نمودار ہو گیا' اب آنکھیں کسی حد تک دیکھنے کے قابل ہو چکی تھیں...... ہمارے سامنے سیڑھیاں موجود تھیں' جو نیچے جا رہی تھیں:

''چلو......!'' اس نے مجھے ٹہوکا دیا۔

ہم دونوں سیڑھیوں اترنے لگے۔ عین اسی وقت خلاء خود بہ خود ہی بند ہو گئی۔ گلنار نے فوراً ہی اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹارچ روشن کر دی...... سیڑھیاں اترنے کے بعد ہم لوگ ایک بڑے ہال میں داخل ہو گئے' ٹارچ کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ ہال میں کچھ کرسیاں بھی موجود تھیں۔ ہال کے وسط میں ایک دیو قامت بت موجود تھا۔ جو یقیناً شیطان ہی کا تھا اور اس بت کے گرد کافی اونچا اسٹیج بنایا گیا تھا۔ اس ہال کی دیواروں پر بھی عجیب و غریب قسم کی تصویریں آویزاں تھیں۔ گلنار نے مجھے دکھانے کیلیے ان تصاویر پر براہ راست روشنی ڈالی تو میں بوکھلا سا گیا۔ کیونکہ یہ سب انتہائی بے ہودہ اور شرمناک قسم کی تصویریں تھیں۔ میری گھبراہٹ دیکھ کر وہ زور سے ہنسی اور پھر اس نے ٹارچ کا رخ موڑ لیا۔

''اب کیا کرنا ہے......!'' گلنار نے پوچھا۔

''کیا تم بھی کل بھینٹ کے وقت یہاں موجود ہو گی؟''

''ہاں...... ہو سکتا ہے' لیکن لازمی بھی نہیں ہے۔''

''کیا مطلب......؟''

''بھینٹ کے وقت گیارہ افراد کی موجودگی ضروری ہوتی ہے۔ اگر آنے والے پورے نہ ہو

سکے تو میں آؤں گی......!"

"کیا میں بھی یہاں پر آ سکتا ہوں؟"

"کیا پاگل ہو گئے!" اس نے مجھے گھورا: "اس اہم موقع پر صرف خاص خاص لوگوں کو مدعو کیا جاتا ہے...... تمہارا یہاں کیا کام!"

"خاص تو میں بھی ہوں۔" میں مسکرایا' پھر سنجیدگی سے بولا: "اب تم مجھے تہہ خانے کا دروازہ کھولنے اور بند کرنے کا طریقہ بتا دو...... بس پھر یہاں سے نکل چلو......"

"آ جاؤ...... اوپر ہی بتا دوں گی......!"

یہ کہہ کر وہ واپسی کیلئے گھوم گئی' میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ اس نے مجھے تہہ خانے کے خلاء کو کھولنے کا طریقہ اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ پھر ہم دونوں باہر نکل آئے۔ لیکن پھر جیسے ہی ہم عقبی راستے کے قریب پہنچے تو عین برآمدے کی سمت روشنی دکھائی دی' دونوں وہیں ٹھٹک کر رک گئے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے......!" گلنار کے منہ سے نکلا۔

"کوئی جاگ چکا ہے شاید......" میں نے خیال ظاہر کیا۔ عین اس وقت کسی نے چیخ کر کہا:

"اس وقت کہاں گئی وہ......؟ جاؤ...... دیکھو جا کر......!" یہ جانی پہچانی آواز تھی۔ یقیناً یہ گلنار کے بھائیوں میں سے ایک تھا۔

لیکن گلنار قطعی گھبرائی نہیں تھی۔ اس نے میرا ہاتھ تھاما اور کونے سے نکلتی ہوئی عقبی دروازے کے قریب آ گئی' پھر اس نے دروازہ آہستگی سے کھول کر مجھے باہر نکال دیا:

"تم جاؤ...... میں ان خبیثوں سے نمٹتی ہوں۔"

"کیا کہو گی......؟"

"ارے جاؤ تم...... میرے پاس سو بہانے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے دھکیلا اور دروازہ بند کر لیا۔

میں چند لمحے کھڑا ہوا سوچتا رہا۔ پھر میرا رخ گھر کی طرف ہو گیا۔ پھر میں گھر کے اندر داخل ہوا اور گلنار کے متعلق ہی سوچتا ہوا بستر پر دراز ہو گیا۔ کل کا آغاز ہوتے ہی وقت کا لمحہ لمحہ قیمتی تھا۔ مجھے اب سردار چپل کو بھی یہاں لانا تھا۔ کیونکہ اس کیلئے بھی اس علاقے کا جائزہ لینا بہت ضروری تھا اور دن کی روشنی میں یہ کام بے حد آسان تھا۔ ویسے بھی کل یہاں کے لوگ اور بھی مصروفیت میں مبتلا ہو جائیں گے' کیونکہ جشن والی رات کا آغاز سورج ڈوبتے ہی ہو جانا تھا۔ میں نے گلنار سے بھی اس بارے میں معلومات حاصل کر لی تھیں۔

یہی وجہ تھی کہ میں نے فوراً ہی بستر کا رخ کیا تھا۔ دوسرے دن تازہ دم ہونے کیلئے نیند بھی بے حد ضروری تھی۔ چنانچہ میں نے ہر طرح کے خیالات کو جھٹک کر آنکھیں موند لیں اور پھر نیند کی دیوی مجھ پر مہربان ہو گئی اور اس نے مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا۔

☆☆☆

میرا اندازہ بالکل درست تھا۔ دوسرے دن صبح سے ہی بستی میں رونق اور چہل پہل بیدار ہو گئی۔ گلیوں اور چوباروں پر لوگ گروپ بنا کر باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ جلد ہی مجھے وہ جگہ بھی معلوم ہو گئی کہ جو تھوڑی دیر میں دلہن کی طرح بجنا شروع ہونے والی تھی۔ یہ وہی میدان تھا جہاں تقریب کا آغاز ہونا تھا۔ گلنار نے ٹھیک ہی کہا تھا' یہ میدان اس قدر وسیع نہیں تھا' لیکن اس میں بستی کے تمام لوگوں کے سما جانے کی گنجائش موجود تھی۔ اس میدان کو تین اطراف سے گھنے درختوں نے گھیرا ہوا تھا۔ میرے نظریے کے

مطابق یہ بات بھی سودمند ثابت ہو سکتی تھی۔

میں جائزہ لے کر گھر واپس آ گیا۔ یہاں آنے کے بعد میں نے کپڑوں کی الماری کھولی۔ جس میں باقاعدہ سوٹوں کی قطاریں موجود تھیں اور یہ سب اس بستی کی مناسبت سے تیار کیے ہوئے لباس تھے۔ میں نے دو سوٹ نکالے اور انہیں دوہرا کر کے اپنے جسم پر زیب تن کر لیا' یعنی میں دونوں سوٹ اپنے جسم پر چڑھا چکا تھا۔ پھر میں گھر سے نکل آیا اور اس گہما گہمی کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے سردار پچل کی طرف چل پڑا۔

جلد ہی میں خیموں کے قریب پہنچ چکا تھا۔ چونکہ دن کا وقت تھا اس لیے سردار کے چند ساتھیوں نے مجھے دیکھا اور پھر ان خیموں میں جو ہلڑ مچی ہے تو خدا کی پناہ......!!

ہر کوئی مجھ سے ملنے اور مجھے دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ بڑی مشکل سے ان مرحلوں سے گزرنے کے بعد مجھے سردار پچل کا مسکراتا ہوا چہرہ دکھائی دیا' وہ بڑے پیار سے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے مسکرا کر بولا:

''دیکھا بادشاہ سائیں......! تمہارے کتنے دیوانے ہیں یہ لوگ......!''

''ہاں......'' میں بھی مسکرایا: ''اور اب میں بھی تمہیں دیوانہ کرنے والا ہوں...... تیار رہو......!''

''کیا مطلب بادشاہ سائیں......! میں سمجھا نہیں......!''

''میں تمہارے لیے شیطانوں کی بستی کا لباس نکال لایا ہوں۔ اور اب تم کو میرے ساتھ چلنا ہے۔''

''حاضر ہوں سائیں......! میں تو تابعدار ہوں آپ کا......!''

''ہوں......'' میں نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا: ''لیکن ایک چیز تمہیں یہیں چھوڑ کر جانا ہوگی۔ ورنہ ہم دونوں ہی دھر لیے جائیں گے......''

''وہ کیا چیز ہے بادشاہ سائیں......! بولو......''

''تمہاری مونچھیں......!'' میں نے پرسکون انداز میں جواب دیا اور سردار کا چہرہ بالکل زرد پڑ گیا۔ اس کے ہاتھ بے اختیار اپنی مونچھوں کی طرف گئے اور انہیں اپنی گرفت میں لے لیا:

''یہ...... یہ تم کیا کہہ رہے ہو بادشاہ سائیں' اس سے بہتر تو یہی تھا کہ تم میری موت کا پروانہ جاری کر دیتے...... تم نے ایک حکم دیا اور وہ بھی......اف......!!''

''دیکھو سردار......! جو مہم ہمیں درپیش ہے' وہ کوئی معمولی نہیں ہے۔ اگر ہم نے اسے پایہ تکمیل تک پہنچا دیا تو رب العزت کے سامنے سرخرو ہو جائیں گے...... ہمارے سر فخر سے بلند ہوں گے اور ہمیں دونوں جہانوں میں کامیابی ملے گی......!''

''وہ تو سب ٹھیک ہے بادشاہ سائیں......! لیکن تم ان مونچھوں کی اہمیت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ میں ان کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوں۔''

''لیکن یہ تو سوچو کہ اگر تم اسی حلیے میں وہاں گئے تو فوراً ہی دھر لیے جاؤ گے...... اور ہم اپنے مقصد میں ناکام ہو جائیں گے۔ پھر وہاں پر ایسے ہی حرام کاریاں ہوتی رہیں گی اور نہ جانے کتنے معصوم لوگ شیطان کے نام پر اپنی جانوں سے ہاتھ دھوتے رہیں گے۔ تم جب اس بارے میں سوچو گے تو ان مونچھوں کی اہمیت ختم ہو جائے گی...... کیونکہ ان کے خاتمے کا مقصد بہت بڑا

ہے۔“
”یہ ظلم مت کرو سائیں......! میں برباد ہو جاؤں گا......!“
”ارے کچھ نہیں ہوگا......تم بسم اللہ کرو......“
”مجھے سوچنے دو......“
”وقت نہیں ہے سردار......! اگر وقت ہوتا تو میں ضرور تمہیں یہ موقع فراہم کرتا......!“
”کس مشکل سے دوچار کر دیا تم نے بادشاہ سائیں......! امتحان میں ڈال دیا مجھے......!“
سردار کی حالت رونے جیسی ہوگئی۔
یہ بڑی مضحکہ خیز سچویشن تھی۔ سردار کی حالت بہت ابتر تھی۔ یہ مونچھیں اس کی خاندانی روایت میں شامل تھیں اور میں ان ہی کے خاتمے کے در پے تھا۔ کیونکہ سردار کے پورے جسم میں وہی میرے کام میں رخنہ ڈال رہی تھیں۔
بہرحال اسے تو جان پر کھیل کر بھی میری بات ماننا تھی' چنانچہ اس نے یہ معرکہ بھی سر کر لیا اور پھر یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے علاقے میں پھیل گئی۔ ہر کوئی سردار کو دیکھ رہا تھا اور سر دھن رہا تھا۔ ادھر سردار کا حال عجیب تھا' وہ کسی نئی نویلی دلہن کی طرح سمٹا جا رہا تھا اور میرے لیے ہنسی ضبط کرنا مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ لیکن یہ بات اٹل تھی کہ مونچھوں کے بغیر اب سردار کی شخصیت بالکل ہی تبدیل ہو کر رہ گئی تھی' میں نے اسے دوسرے پہنے ہوئے لباسوں میں سے ایک اتار کر دیا' جسے سردار نے اپنے جسم پر زیب تن کر لیا۔ اب غور سے دیکھنے پر بھی اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ سابقہ ڈاکوؤں کا سردار ہے۔
پھر ہم دونوں بڑی عجلت میں وہاں سے روانہ ہوئے تھے۔ میں نے راستے میں سردار کو سمجھا دیا تھا کہ اس نے کیا کرنا ہے۔ کیونکہ میں اب اس سے بچھڑنے والا تھا' چنانچہ اپنے گھر کے دروازے کے قریب پہنچ کر میں نے اسے جشن والے میدان کا راستہ سمجھایا اور کہا:
”اب تم واپسی اسی گھر میں آ جانا' میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں......“
”ٹھیک ہے بادشاہ سائیں......!“ اس نے بے اختیار اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرنا چاہا' لیکن پھر خیال آتے ہی اس نے ہاتھ ہٹا لیا اور جلدی سے آگے بڑھ گیا۔
میں مسکراتے ہوئے اپنے گھر میں داخل ہو گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد سردار کی واپسی ہوئی' اب وہ آرام سے میرے سامنے بیٹھا تھا۔ پھر وہ بولا:
”ٹھیک ہے بادشاہ سائیں......! میں نے سارے راستے ذہن نشین کر لیے ہیں...... اور میدان کے اطراف کا بھی اچھی طرح جائزہ لے لیا ہے...... اب میں جا رہا ہوں تاکہ اپنی فوج کو تیار کر سکوں......“
”ہاں...... یہ ٹھیک رہے گا کہ تم ابھی سے تیاریوں میں مصروف ہو جاؤ...... ہوسکتا ہے کہ میں رات میں بھی تم سے رابطہ کروں۔ ویسے تو ٹھیک بارہ بجے بھینٹ ہوگی اور اس کے بعد جشن کا آغاز ہوگا......!“
”میں سارے انتظامات کرنے کے بعد خود ہی تمہارے پاس آ جاؤں گا......!“ سردار نے بتایا: ”ہم لوگ ان سب کاموں میں بہت ماہر ہیں......“
”اسی لیے تو میں نے تمہارا انتخاب کیا ہے سردار......! مجھے معلوم ہے کہ تم یہ کام خوش اسلوبی سے انجام دو گے......!“
”جو خاص لوگ رات کے وقت یہاں آئیں

گے' ان کے محافظوں کو بھی سنبھالنا ہے......!''
''تم فکر ہی مت کرو سائیں......! ابھی تم ہم لوگوں سے واقف نہیں ہو......!''
''ہاں واقف نہیں ہوں' لیکن مجھے بھروسہ پورا ہے۔''
''ہم تمہارے بھروسے کا بھرم رکھیں گے بادشاہ سائیں......! فکر مت کرو......!!''
یہ کہہ کر سردار چلا گیا اور میں سوچ میں ڈوب گیا۔ میں اس بستی کے لوگوں سے زیادہ واقفیت نہیں رکھتا تھا' بس گلنار کے بھائیوں وغیرہ سے میری تھوڑی بہت شناسائی تھی......اب اس جشن میں شریک ہونے والوں سے میرا سامنا ہونا تھا اور اپنے ساتھیوں کے ذریعے مجھے ان کو زیر بھی کرنا تھا' یعنی یہ بات تو حتمی تھی کہ مجھے جو قدم اٹھانا تھا' اس کے بارے میں سوچنے یا اسے سمجھنے کا قطعی موقع نہیں تھا......جو کچھ بھی ہونا تھا' وہ فوری طور پر کسی نتیجے کا خواہاں تھا......لیکن مجھے سردار اور اس کے ساتھیوں کی صلاحیتوں پر پورا بھروسہ تھا...... وہ لوگ پیشہ ور تھے' حالانکہ اب وہ راہ راست پر آ چکے تھے' لیکن انہیں اس قسم کے کاموں کا وسیع تجربہ تھا۔ میں نے سردار کو ہر پہلو سے آگاہ کر دیا تھا۔ اب حکمت عملی کا میدان اسی پر منحصر تھا......میں تو بس ایک شطرنج کے کھلاڑی کی حیثیت رکھتا تھا۔ جو کھیل کے احاطے سے باہر رہ کر ایک ایک مہرے پر اپنی نگاہ رکھتا ہے۔ ویسے تو میں بھی اس کھیل میں اپنی تمام تر روحانی قوتوں کو بروئے کار لانا چاہتا تھا' لیکن ابھی مجھے اندازہ نہیں تھا کہ حالات کس کروٹ بیٹھتے ہیں۔
بہر حال اب مجھے رات کا شدت سے انتظار تھا' لیکن اس سے پہلے مجھے امید تھی کہ گلنار ضرور کسی وقت میرے پاس آئے گی اور پھر یہی ہوا' وہ دوپہر کا کھانا خود ہی لے کر آ گئی' میں نے حیرت سے اسے دیکھا:
''ایسے کیوں دیکھ رہے ہو......! یہ کھانا میں نے ابھی ابھی ملازم کے ہاتھ سے لیا ہے۔ گھر سے نہیں لائی تمہارے لیے......!''
''اس طرح میری آؤ بھگت کب تک ہوتی رہے گی!''
''آج جشن گزر جائے' پھر تمہیں کوئی کام سونپا جائے گا۔ جب تک عیش کرو...... لو کھانا کھاؤ......!''
''کل کیا ہوا تھا......؟''
''کچھ نہیں۔'' وہ لاپروائی سے بولی: ''میں نے کہہ دیا تھا کہ میں تہہ خانے میں تھی اور شیطان کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔''
''اچھا......!'' میں ہنسا: ''بہت تیز ہو تم......!''
''تیز طرار تو تم بھی ہو۔'' وہ پٹ سے بولی: ''میرے جذبات سے کس طرح کنی کترا جاتے ہو......''
''یہ ذکر مت چھیڑا کرو......'' میں نے ہاتھ اٹھایا۔
''کیوں......؟ تمہیں تکلیف ہوتی ہے......''
اس نے مجھے غور سے دیکھا: ''اس کا مطلب یہ ہے کہ کچھ گڑبڑ ہے۔''
''کیسی گڑبڑ......؟''
''ہوسکتا ہے کہ تم میری خواہشوں کی تکمیل کرنے سے معذور ہو......اب مجھے کیا معلوم کہ تمہاری اندرونی کیفیت کیا ہے۔''
''کیا کہہ رہی ہو......'' میں بری طرح جھینپ گیا' وہ کس قدر بے باکی سے میری مردانگی پر حملہ کر رہی تھی: ''تمہیں شرم نہیں آتی!''

''اس میں شرم کی کیا بات ہے......'' وہ بے نیازی سے بولی: ''اگر ایسی کوئی بات ہے تو تم مجھے صاف صاف بتا دو...... فکر مت کرو تمہارا یہ راز میرے سینے میں دفن ہوگا...... میں کسی سے ذکر نہیں کروں گی۔''

''ایسا کچھ نہیں ہے......'' میں جلدی سے بولا: ''انسانی جذبات پوری شدت سے میرے وجود میں بھی موجود ہیں......''

''مجھے یقین نہیں آتا......'' اس نے منہ بنایا: ''اگر ایسا ہوتا تو تم اتنے موقعے یونہی نہ گنوا دیتے......''

ایک لمحے کیلیے میرا دل میں آیا کہ میں تمام پردے ہٹا کر اس کی باتوں کو غلط ثابت کر دوں' جو کچھ وہ میرے بارے میں سوچ رہی تھی...... ان اندازوں کو رد کرنا میرے لیے ذرا بھی مشکل نہیں تھا۔ لیکن میں اپنے آپ میں ضبط کر گیا...... اس وقت خود کو قابو میں رکھنا بہت ضروری تھا۔ وہ مجھے اکسا رہی تھی...... اور اس کی باتوں میں آکر اگر میں کوئی غلط قدم اٹھا لیتا تو رات کے معرکے کے وقت میں اپنی روحانی صلاحیتوں سے محروم ہو کر بیٹھا ہوتا۔ چنانچہ میں نے چند لمحوں کے بعد مسکرا کر کہا:

''اگر تم یہ سمجھ رہی ہو تو شوق سے سمجھو......! مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

یہ سن کر اس کا چہرہ اتر گیا۔ اس کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی تھی۔ مجھے لبھانے کی یہ ترکیب بھی کارآمد ثابت نہیں ہوئی تھی' پھر اس نے ایک طویل سانس کو اپنے حلق سے آزاد کیا اور بولی:

''تم پتھر ہو...... میں تمہیں کبھی بھول نہیں پاؤں گی......!''

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے بے ساختہ اس کا ہاتھ تھام لیا:

''کیا تم ناراض ہو گئیں؟''

''نہیں...... البتہ مایوس ضرور ہوئی ہوں۔'' اس نے آہستہ سے کہا: ''اور یہ میرا فطری حق ہے......''

''تم جس طرح میرا ساتھ دے رہی ہو۔ میرے دل میں تمہاری بہت قدر و قیمت ہے...... لیکن میں مجبور ہوں گلنار......! بہت مجبور ہوں۔''

''مجھ سے زیادہ نہیں ہو گے......'' اس کا لہجہ گلوگیر تھا۔

''میں کوشش کروں گی کہ اب تم سے اس قسم کی کوئی بات نہ کروں...... چھوڑو ان باتوں کو...... یہ بتاؤ کہ اب تمہارا کیا پروگرام ہے......''

''میں نے ساری تیاریاں مکمل کر لی ہیں...... اب صرف مجھے خاص لوگوں کی آمد کا انتظار ہے......''

''ساری تیاریاں...... مطلب......؟''

''رات میں خود ہی دیکھ لینا...... بتانے سے تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔''

''بہت گہرے ہو تم......'' اس نے کہا: ''اور شاید بے حد خطرناک بھی......''

''میں تو بے ضرر ہوں......'' میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ پھر میں سنجیدگی سے بولا: ''مجھے بھینٹ چڑھنے سے پہلے تہہ خانے میں پہنچنا ہے' کیا تم اس سلسلے میں میری مدد کر سکتی ہو......!''

''آخر تمہارے ارادے کیا ہیں......!''

''شیطانیت کا خاتمہ......'' میں نے جواب دیا: ''میری بات کا جواب دو......''

''یہ تو بہت مشکل کام ہے......'' اس نے بتایا: ''کیونکہ وہاں مخصوص لوگ ہی جا سکتے ہیں اور ان کی تعداد گیارہ ہی ہو گی۔''

''کیا ہر دفعہ وہی لوگ آتے ہیں......؟''
''نہیں...... کچھ نئے چہرے بھی ہوتے ہیں......البتہ کرسی صاحب خود مہمان خصوصی ہوتا ہے۔''
''ہوں......'' میں نے کچھ سوچ کر کہا: ''اور وہ لوگ کب آتے ہیں......!''
''قربانی سے ایک گھنٹے پہلے' ان کا قیام ہمارے ہی مکان میں ہوتا ہے۔''
''اچھا...... ان کے ساتھ حفاظت کا بھی انتظام ہوتا ہے......!''
''ہاں...... خاص طور پر کرسی صاحب کے ساتھ کئی گارڈ آتے ہیں......''
''کیا وہ گارڈ مکان کے اندر بھی آتے ہیں؟''
''نہیں...... وہ مکان کو چاروں اطراف سے گھیر لیتے ہیں اور پھر ان ہی محافظت میں یہ لوگ میدان میں بنے ہوئے اسٹیج تک پہنچتے ہیں۔''
''ٹھیک ہے......'' میں نے سر ہلایا: ''کیا تم ان میں سے ایک یا دو آدمیوں کو اپنے مکان سے نکال کر یہاں لا سکتی ہو؟''
''کیا مطلب......؟''
''میرے ساتھ ایک آدمی اور ہوگا اور ہم دونوں اس طرح تہہ خانے میں جائیں گے کہ گیارہ کا ہندسہ بھی پورا رہے اور وہاں ہم شریک بھی ہو سکیں......''
''تم کس چکر میں ہو آخر......؟'' وہ پریشان ہو گئی: ''کسی مصیبت میں اپنی ٹانگ نہ اڑا بیٹھنا......''
''کیا تمہیں ان شیطانوں سے نجات حاصل نہیں کرنی؟''
''ہاں کرنی ہے' لیکن میں اس کی خاطر تمہیں گنوانا نہیں چاہتی......''
''میری فکر مت کرو' مجھے کچھ نہیں ہوگا۔''
''اچھا...... اب میں چلتی ہوں...... اور تمہاری بات پر عمل کرنے کی کوشش کروں گی......'' اس نے مسکرا کر کہا: ''خوبصورت تو میں ہوں۔ میرے جھانسے ہر کوئی آرام سے آ سکتا ہے۔''
''یہ تم خود ہی جانو...... میں کیا بولوں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔
اس نے مجھے گھورا اور باہر نکل گئی۔ میں اسے جاتے ہوئے کافی دیر تک دیکھتا رہا۔

☆☆☆

شام کا جھٹپٹا ہوتے ہی شیطانوں کی اس بستی میں گہما گہمی اور بھی عروج پر پہنچ گئی۔ میدان کو کسی دلہن کی طرح سجایا گیا تھا اور اس کے ایک کونے میں باقاعدہ اسٹیج بنایا گیا تھا' جس میں کرسیاں ترتیب سے رکھی گئی تھیں' ان ہی میں ایک کرسی کو امتیازی حیثیت حاصل تھی اور اسے دیکھ کر پرانے زمانے کے بادشاہوں کی شاہانہ نشست کی یاد تازہ ہو رہی تھی...... میں نے میدان میں موجود لوگوں سے گھل مل کر ان کی باتوں سے اندازہ لگا لیا کہ یہ کرسی شیطان کیلئے مخصوص تھی اور ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ وہ غائبانہ طور پر خود بھی اس جشن میں شرکت کرتا ہے اور اپنے چیلوں کے کاموں سے خوش ہو کر انہیں انعام و کرام سے نوازتا ہے......
پورے سال میں جس شخص نے بھی زیادہ سے زیادہ برائیوں اور گناہوں کو اپنے گلے سے لگایا ہوگا اور گندگی کے دلدل میں قدم جمائے ہوں گے' شیطان اسی سے سب سے زیادہ خوش ہوگا اور وہ اسے اپنا خاص چیلہ بنائے گا...... اور بھی نہ جانے کتنے فضول اور من گھڑت خیالات

ان لوگوں کے ذہنوں میں گردش کر رہے تھے۔ مجھے ہول سا آنے لگا اور پھر میں نے وہاں رہنا مناسب خیال نہیں کیا۔ یوں بھی اب میرے اندازے کے مطابق سردار تچل بھی میرے گھر پر آنے والا تھا اور پھر میرا خیال درست نکلا۔ مجھے آئے ہوئے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی' میں نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا:

''کیا غضب کر رہے ہو سردار......! ابھی کسی نے نوٹ کر لیا تو دھر لیے جائیں۔'' میں نے سردار پر نظر پڑتے ہی کہا: ''آؤ......اندر آجاؤ۔''

''کیوں بادشاہ سائیں......کیا ہوا؟''

''ان لوگوں میں دستک دینے کی روایت نہیں ہے۔ جس کو جہاں جانا ہوتا ہے وہ بے دھڑک چلا جاتا ہے۔''

''ارے......! لیکن یہ تو آداب کے خلاف ہے۔'' سردار نے حیرت سے کہا۔

''ہاں......ان لوگوں کا سارا انتظام ہی الٹا ہے' کیونکہ شیطان کا یہی مقصد تو ہے کہ حکم خداوندی اور قدرت کے بالکل برعکس چلا جائے' تاکہ خوب سے خوب نافرمانیاں ہوں' حکم عدولیاں ہوں......''

''عجیب لوگ ہیں یہ بھی......'' سردار بڑبڑایا

''اب یہ بتاؤ کہ کیا کرنا ہے؟''

''کیا تم نے بستی کا اچھی طرح جائزہ لے لیا ہے سردار......!''

''کیوں بادشاہ سائیں......؟''

''ہم نے جو کام کرنا ہے' اسی وجہ سے پوچھ رہا ہوں۔''

''ارے تم اس کی فکر مت کرو' وہ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو......''

''ٹھیک ہے' اب بس ہمیں انتظار کرنا ہے' اگر اس لڑکی نے دو آدمیوں کا بندوبست کر دیا تو اچھی بات ہے' ورنہ پھر کوئی اور طریقہ اختیار کرنا پڑے گا......''

''بادشاہ سائیں......! کل تم نے مجھ سے پستول بھی لے لی تھی......!''

''ہاں......کیا واپس دوں!''

''ارے نہیں بابا......! میرا مطلب ہے کہ پھڑکا یا کسی کو......!''

''ارے نہیں بھئی......!'' میں جلدی سے بولا: ''میں نے تو احتیاطاً لیا تھا تم سے......''

''لٹا دیتے دو چار حرامزدوں کو......!'' وہ منہ بنا کر بولا: ''مجھے تو ان لوگوں سے اب گھن سی آنے لگی ہے۔''

میں خاموش ہی رہا...... پھر رات کے وقت ہم دونوں باہر نکل آئے تھے' معلوم ہوا کہ تھوڑی دیر بعد ہی گلنار وغیرہ کے یہاں خصوصی مہمانوں کی آمد ہونے والی ہے...... چاروں طرف چراغاں ہو رہا تھا اور روشنیوں کی جگمگاہٹ دکھائی دے رہی تھی۔ لوگوں میں بے پناہ جوش و خروش تھا' ایک جگہ پہنچ کر سردار نے مجھے ٹھوکا دیا:

''بادشاہ سائیں......! وہ دیکھو......'' ساتھ میں وہ مسکرا بھی رہا تھا۔

میں نے بے اختیار اس کے اشارے کی طرف نظریں گھمائیں اور پھر فوراً ہی میری آنکھیں جھک گئیں۔ یہ ایک چھوٹا سا پارک تھا' جس کی ایک بنچ پر مرد اور عورت نہایت فحش حرکتوں میں مصروف تھے...... اتنی فحش کہ بے غیرتوں کو بھی یہ منظر دیکھ کر شرم آجاتی۔

(اس دلچسپ داستان کے بقایا واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)

کراچی سے ارسال کردہ انتہائی دلخراش خیز کہانی

ریت کی گود میں

غریب لوگ تھے ایک وقت روٹی نصیب ہوتی تو دوسرے وقت فاقہ کرتے...... بچیوں کے مرنے کا دکھ تو تھا مگر اطمینان بھی تھا کہ وہ اب کبھی بھوکی نہیں رہیں گی......

منزہ سہام

میں ایک جرنلسٹ ہوں کام کی نوعیت ایسی ہے کہ اکثر ایک شہر سے دوسرے شہر سفر میں رہتا ہوں ۔ مقصد خبر کی تلاش ہوتا ہے جو بعد میں کہانی کی صورت اپنے پڑھنے والوں کی نظر کرتا رہتا ہوں۔ اخبار میں چھپنے والی ایک کالمی خبر پڑھتے ہوئے ہم گزر جاتے ہیں مگر اس خبر یا سانحے کے پیچھے کتنی طویل داستان ہوتی ہے یہ مجھے نگری نگری پھر کر اندازہ ہوا پہلے خبر کا حصول اور اس کی تصدیق میری نوکری تھی بعد میں یہ میرا جنون اور مشن بن گیا ایسی ہی ایک خبر جو آپ میں سے اکثر لوگوں نے سنی یا پڑھی ہوگی اور پھر بھول بھال گئے ہوں گے اس کی سچی کہانی آج گوش گزار کر رہا ہوں۔

جیسا کہ میں نے بتایا کہ کام کے سلسلے میں' میں اکثر سفر میں رہتا ہوں تو کچھ عرصہ قبل عید کے بعد خانیوال جانے کا اتفاق ہوا۔ موسم بہت دلفریب تھا تو سوچا کہ چند دوستوں سے ملاقات کرلوں جن سے عید پر ملاقات نہ ہوسکی تھی۔ خانیوال اسٹیشن کے عقب میں میرے عزیز از جان دوست ملک گوہر کا ڈیرا تھا۔ دوست یار مجھے اسٹیشن لینے آئے اور پھر ڈیرے پر لے گئے جہاں چائے' مٹھائی' نمکو اور بادام والے بسکٹ سے بھرپور تواضح کی گئی۔ طے یہ ہوا کہ میں کچھ دیر آرام کرلوں پھر ہم لوگ مل کر چوہدری فرمان جو میرا پرانا یار تھا اس کے گھر جائیں گے رات کا کھانا وہیں تھا۔ خوب ہنسی مذاق ہو رہا تھا جب یار بیلی جمع ہوں تو پھر وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ مغرب کی اذانوں پر ہمیں ہوش آیا کہ چوہدری فرمان کے ہاں کھانے پر پہنچنا ہے۔ ہم سب ہنستے بولتے باہر نکلے۔

اور تین موٹرسائیکلوں پر سوار ہو کر دعوت کھانے نکل پڑے بازار سے گزرتے ہوئے میری نظر ایک عورت پر پڑی جو رو رہی تھی اور اپنے سر پر مٹی ڈال رہی تھی۔ لوگ اس کو تاسف بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے گزر رہے تھے۔ میرے دل کو بہت تکلیف ہوئی ملک گوہر سے پوچھا۔

''بھائی کیا ماجرا ہے یہ جوان عورت ہے ایسے

کیوں کر رہی ہے؟''
''یار بے چاری کی بچیاں ریت میں دب کر مرگئیں بس تب سے یہی حالت ہے۔'' ملک گوہر نے موڑ کاٹتے ہوئے بتایا۔
''کیا مطلب ریت میں دب کر ......''
میرے لیے یہ اچھنبے کی خبر تھی۔
''ریت میں دب کر کون مر سکتا ہے۔'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے ملک گوہر کی پشت کو گھورا۔
''چھوڑ یار تو بھی کیا باتیں لے کر بیٹھ گیا دو دن کے لیے آیا ہمیں وقت دے صحافی نہ بن جایا کر ہر جگہ......'' ملک گوہر نے مجھے ٹالتے ہوئے بات ختم کر دی۔
مگر میرے دل میں پھانس سی چبھ گئی تھی۔

دعوت والے گھر پہنچ کر میرے دماغ سے بھی وہ عورت مکمل طور پر نکل گئی۔ دوستوں نے خوب ہلہ گلہ کیا رات دیر سے واپسی ہوئی دوسرا سارا دن بھی ملنے ملانے میں گزرا شام کو میری واپسی تھی سوچا بیگم بچوں کے لیے خانیوال کا مشہور حلوہ لے لوں بازار میں جیسے ہی داخل ہوا تو سڑک پار اُسی روتی بلکتی عورت کو دیکھا مگر آج وہ سر پر مٹی نہیں ڈال رہی تھی بلکہ دونوں ہاتھوں میں مٹی دبائے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی بند مٹھیوں کو تک رہی تھی آنسو اُس کی آنکھوں سے رواں تھے۔
''بھائی کیا دکھ ہے اس بدنصیب کو؟'' میں نے مٹھائی والے کو پیسے دیتے ہوئے پوچھا۔
''کیا کہیں جی عید سے دو روز قبل اس کی تینوں



بیٹیاں لاپتہ ہوگئی تھیں اور عید والے دن اُن کی لاشیں ملیں تب سے اُس کا یہی حال ہے۔" دکان دار نے رحم آمیز نظروں سے اس عورت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کسی نے اغوا کرلیا تھا اور بچیوں کی عمریں کیا تھیں؟" میرا دل غم سے پھٹنے لگا اور آنکھوں کے سامنے میری صوبیہ اور رزوبیہ آگئیں۔

"صاحب آپ کون ہیں؟" میرے بازو میں کھڑے بوڑھے نے پوچھا۔

"میرے بھائی میں صحافی ہوں دوستوں سے ملنے آیا تھا اب واپسی ہے مگر اس عورت کے دکھ نے مجھے متجسس کردیا ہے شاید میں اِس کے کام آسکوں۔" میں نے مڑ کر جواب دیا۔

"آپ کونے میں ٹھیلے پر کیلے بیچنے والے کو دیکھ رہے ہیں؟" اُسی بوڑھے شخص نے سامنے کی طرف اشارہ کرکے پوچھا۔

"جی وہ ضعیف آدمی نا؟" میں نے تائید چاہی۔

"جی جناب وہ اس عورت کا شوہر ہے صبح جب بازار کے اس کونے پر ٹھیلا لے کر آتا ہے تو یہ بھی اس کے ساتھ آجاتی ہے سارا دن گلیوں میں رُلتی ہے بڑی کوشش کی کہ یہ گھر پر بیٹھے مگر جھلی ہوگئی ہے آپ اس کے شوہر سے ملیں وہ آپ کو ساری کہانی بتائے گا۔" میرے پاس ابھی دو گھنٹے تھے دوستوں سے فون پر معذرت کی اور ٹھیلے والے کے پاس پہنچ گیا۔

قریب جاکر اندازہ ہوا کہ وہ 35 چالیس کے پیٹے میں تھا مگر دیکھنے میں 70 سال کا لگ رہا تھا۔

"آؤ باؤ جی کتنے کیلے دوں؟"

"مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔" میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"کہو صاحب جی کیا بات ہے؟"

"بچیوں کو کیا ہوا تھا؟" میرے سوال پر اس کے چہرے پر جو درد پھیلا وہ ایک باپ ہی محسوس کرسکتا ہے۔

"دیکھیے میں صحافی ہوں سرکار تک پہنچ ہے شاید آپ کی دادرسی کرسکوں مجھے بتایئے کیا ہوا تھا؟" آئے دن بچیوں کے ساتھ ہونے والے ظلم کی خبریں چھپتی رہتی ہیں میں سمجھ چکا تھا کہ یہ بھی ایسی ہی دردناک داستان ہوگی۔

تب اس نے مجھے اپنی دکھ بھری داستان سنانا شروع کی۔

"میرا نام نصیر ہے میں مزدور پیشہ آدمی ہوں گھر میں بیوی اور چھے بچے تھے۔ 3 لڑکے 3 لڑکیاں، غربت نے تو جیسے ہمارا گھر ہی دیکھ لیا تھا۔ ایک وقت روٹی ملتی دوسرے وقت سب بھوکے رہتے۔ آس پڑوس میں بھی سب کے تقریباً ایسے ہی حالات تھے میں نے ہر طرح سے کوشش کرکے دیکھا مگر گھر کا چولہا اکثر ٹھنڈا ہی پڑا رہتا تب میری بہن جو بہاولنگر سے آگے تحصیل فورٹ عباس کے صحرا کے قریب گاؤں میں رہتی ہے اُس نے کہا۔

"تم لوگ یہاں آجاؤ کاشت کاری کے لیے زمیندار کو مزدور درکار ہیں تم کام کروگے تو اچھے پیسے مل جائیں گے۔

میں اچھے دنوں کی آس میں بہاولنگر روانہ ہوگیا۔ بیوی بچے سب ساتھ تھے۔ پورا رمضان خوب کام ملا بچوں نے بھی پیٹ بھر کھانا کھایا عید کے کپڑے بنائے، ہمارا ارادہ عید کے بعد گاؤں واپس لوٹنے کا تھا۔ عید سے دو روز قبل زمیندار نے پیسے دے کر فارغ کردیا میری تینوں بیٹیاں ہمارے ساتھ ہی کام کرتی تھیں ضد کرنے لگیں کہ پھوپو کے گاؤں میں مہندی والی آئی ہے ہم بھی مہندی لگوائیں گے، اُن کی ماں نے پیسے دے کر پھوپو کے ہاں بھیج دیا اور تاکید کی کہ ساتھ رہنا اور مہندی لگوا کر مغرب سے پہلے گھر آجانا......" اتنا کہہ کر نصیر

خاموش ہو گیا۔ وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا جیسے سانس لینے میں دشواری ہو۔ میں نے سائیکل پنکچر والے کی دکان سے پانی کا گلاس مانگ کر اُس کو پلایا تب اس کی سانسیں بحال ہوئیں۔ جب نصیر نے سر اٹھایا تو اُس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ لوگ آتے جاتے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ اُس کی بیوی بھی نجانے کب سڑک پار کر کے ہمارے قریب آ کر بیٹھ گئی تھی اور اب تنکوں سے زمین پر لکیریں کھینچ رہی تھی۔

''نصیر بھائی صبر کرو میں مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچاؤں گا آپ ہمت کریں اور مجھے بتائیں آگے کیا ہوا؟''

''میری بڑی دھی رانی دس سال کی تھی اور صاحب بہت سمجھدار تھی چھوٹی دونوں بہنوں کا ہاتھ تھام کر پھوپو کی طرف چلی گئی مگر جانے سے پہلے ماں سے کہہ گئی کہ شام کھانے میں مرغی کا سالن بنانا ہم وہی کھائیں گے۔ جانتی تھی نہ کہ ماں کے پاس پیسے ہیں' بس صاحب ہم شام میں انتظار کرتے رہے تینوں بہنیں واپس نہیں آئیں۔ ہم نے یہ سوچا کہ پھوپو کی طرف ٹھہر گئی ہوں گی پھر صبح سے دوپہر ہونے کو آئی اُن کی کوئی خبر نہ تھی۔

''تب میں بہن کے گھر گیا تو پتہ چلا کہ وہ تینوں تو پچھلی دوپہر ہی مہندی لگوا کر چلی گئیں تھیں میرے تو پیروں تلے زمین نکل گئی۔ بیوی کو بتایا تو وہ بھی گھر سے باہر دوڑ پڑی ہم لوگ گاؤں کے دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر انہیں تلاش کرتے رہے۔ پر کچھ پتہ نہیں چلا...... میرے گھر اور بہن کے گھر کے درمیان چولستان کا صحرا ہے جس کے کنارے ہمارے گھر بنے ہوئے تھے۔ صحرا میں کسی کو تلاش کرنا صاحب بہت مشکل ہے۔ پھر شدید گرمی اور طوفانی ہواؤں نے تلاش کا کام تقریباً ناممکن کر دیا تھا۔ ہم غریب لوگ ہیں بس اپنے طور انہیں ڈھونڈتے رہے۔ میری بیوی نے تو اپنی نند سے جھگڑا بھی کیا کہ تیری بھتیجیاں تھیں روک لیتی میں آ کر لے جاتی۔ میری بہن بھی بہت غمزدہ تھی وہ بھی یہی کہتی رہی کہ کاش میں جانے نہ دیتی پر تیری بیٹیاں ضد کر کے چلی گئیں کھانا بھی نہیں کھایا کہ اماں نے مرغی کا سالن بنایا ہوگا وہی کھائیں گے۔ بس صاحب جی عید والے دن تینوں بچیوں کی ریت میں دھنسی لاشیں مل گئیں وہ گرمی اور لو کے جھکڑوں میں راستہ بھٹک کر صحرا میں نکل گئیں اور پھر بھوک پیاس سے نڈھال تینوں مر گئیں پر صاحب میری بڑی دھی رانی سمجھدار تھی اس نے مرتے مرتے بھی ماں کی بات رکھی بہنوں کا ہاتھ نہ چھوڑا۔''

نصیر تو خاموش ہو گیا تھا مگر میرے اندر تو جیسے ایک طوفان برپا تھا۔ ان معصوم بچیوں کی بے بسی پر دل بلک بلک کر رو رہا تھا۔ ماں باپ کے لیے اس سے بڑی کیا آزمائش ہوگی کہ ان کے سامنے ان کی اولاد دنیا سے چلی جائے۔

''صاحب جی اب میری بیٹیاں کبھی بھوکی نہیں سوئیں گی ان کے منہ میں حلق تک ریت ہی ریت تھی۔ وہ اب کبھی بھوکی نہیں سوئیں گی۔'' یہ کہہ کر اس بدنصیب عورت نے اپنے سر میں مٹی ڈالنا شروع کر دی۔ جو کب سے سر جھکائے بیٹھی تھی۔

مٹھائی اور حلوے کے تھیلے میرے ہاتھ میں لرزنے لگے میں نے خاموشی سے وہ تھیلے اور جیب میں موجود تمام پیسے نصیر کے ٹھیلے پر رکھے...... اس کے کاندھے کو تھپکا اور خاموشی سے آنسو پونچھتا اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ دور افق پر سورج ڈوب رہا تھا اور میری ٹرین جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

☆☆......☆☆

کراچی سے ارسال کردہ بالکل سچی کہانی

غفلت کے پردے

رشتوں میں بھی حدود اور قیود ہوتی ہیں اور ان حدود کو پھلانگ لیا جائے
تو زندگی بس دھواں سی رہ جاتی ہے جو نظر تو آتا ہے مگر ہاتھ نہیں آتا......

صائمہ صدیقی

یہ دھواں تو لگ رہا ہے ہر طرف ہی پھیل گیا ہے۔ مجھے اپنے اندر اور باہر ہر طرف دھواں ہی دھواں محسوس ہو رہا ہے......اس کے علاوہ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا...... کون کیا کہہ رہا ہے...... کچھ ملی جلی سی آوازیں ہیں اس کے بعد میرا ذہن تاریکی میں چلا گیا۔

جب ذرا ہوش آیا تو ثنا نے اپنے آپ کو اسپتال کے بستر پر پایا۔ سامنے ہی امی کھڑی تھیں۔ امی نے اُسے ہوش میں آتا دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔ ماتھا چوما اور سر سہلاتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کرتی رہیں۔

''یا اللہ! تیرا شکر ہے میری بچی کو ہوش آ گیا۔ اب کیسی طبیعت ہے میری بیٹی کی......''

امی نے ثنا پر جھکتے ہوئے کہا۔ اُس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ بس سر ہلا کر رہ گئی۔ اتنے میں ڈاکٹر بھی آ گئیں دوبارہ سے چیک کیا اور ایک دو باتیں کر کے تسلی کا اظہار کیا...... کچھ دیر بعد ڈسچارج کر دیا گیا۔

گھر آ کر بھی امی نے ثنا کا بہت خیال رکھا۔ لیکن اس کی آنکھیں تھیں کہ برسے جاتی تھیں امی دودھ کا گلاس اور دوائیں لے کر ثنا کے پاس آئیں تو اُسے روتے دیکھ کر کلیجے سے لگا لیا۔ ثنا بھی ماں کی مامتا سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''امی یہ میرے ساتھ کیا ہو گیا؟'' امی نے اُسے جی بھر کر رونے دیا اور جب اُس کی ہچکیاں کچھ تھمیں تو تسلی دلاسے دیتے ہوئے کہا۔

''بیٹا حوصلہ کرو خدا کی مصلحت یہی تھی جو دکھ ہمارے نصیب میں لکھے ہیں وہ ہمیں مل کر رہتے ہیں۔''

☆......☆......☆

ثنا کی شادی کو چند دن ہوئے تھے اور وہ بہت خوش تھی ریاض اُس کا شوہر اُسے بہت چاہتا تھا......اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔

ثنا تین بہنیں اور تین بھائی ہیں۔ ثنا اور اس سے چھوٹے رمیز کی شادی ہو چکی تھی ان کے بعد

حنا' نورین' وقاص اور معاذ تھے حنا کی بھی اپنی خالہ کے گھر منگنی ہو چکی تھی۔

شادی کے شروع کے چند دنوں میں ریاض اسے گھمانے بھی لے گیا تھا۔ کسی دن ساحل سمندر اور کبھی کسی پارک...... اور اکثر اسے میکے ملانے لے جاتا تھا لیکن بس ایک خامی تھی۔ ریاض ثنا کو میکے میں دو چار دن کے لیے ٹھہرنے نہیں دیتا تھا۔

ثنا اس میں بھی خوش تھی کہ ریاض اس کا خیال تو رکھتے ہیں میکے ملانے بھی لے جاتے ہیں دن یونہی خوشیوں کے جھولے میں بسر ہو رہے تھے۔ ان خوشیوں میں چار چاند مزید لگ گئے جب ثنا امید سے ہوئی ثنا کے تو مانو پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے ریاض کے لیے بھی یہ خوشی کی خبر تھی۔ وہ اب پہلے سے بھی زیادہ ثنا کا خیال رکھتا تھا۔ سسرال والے سب بہت خوش تھے۔ ثنا کی ساس جو بڑے بیٹے کے پاس کبھی منجھلے اور کبھی چھوٹے بیٹے کے ساتھ رہتی تھیں اب مستقل ریاض کے گھر رہنے آ گئیں ثنا کا خیال کر کے' کیونکہ ثنا کو اس وقت ان کی زیادہ ضرورت تھی۔ ثنا بھی ساس کے آ جانے سے بہت خوش تھی ساس جو کہ ثنا کی تائی بھی تھیں ثنا کا بہت خیال رکھتیں اور احتیاطی تدابیر اُسے سمجھاتی رہتیں۔

دن' ہفتے اور مہینے گزرتے رہے اور آخر ایک دن ثنا نے ایک پیاری سی بچی کو جنم دیا...... سب ہی خوش تھے۔ ثنا تو بس بچی پر اپنی ماتا نچھاور کرنے کے لیے بے قرار ہوئی جا رہی تھی زندگی



خوشیوں کے جھولے میں ہلکورے لے رہی تھی۔ خوشیوں کی ساعتیں ویسے بھی بہت تیزی کے ساتھ گزرتی محسوس ہوتی ہیں۔

ساس دو مہینے ریاض کے گھر ٹھہر کر اور بہو کو اچھا برا سمجھا کر دوسرے بیٹے کے گھر کو سدھاریں۔ میکے والے بھی جلدی جلدی چکر لگا لیتے تھے۔

اب کی بار ثنا کی چھوٹی بہن نورین آئی تو ثنا نے امی سے کہہ کر نورین کو زبردستی روک لیا کچھ دن یہاں رہے گی میرے پاس......

وقت دھیرے دھیرے بیت رہا تھا۔ ثنا اپنی بیٹی مناہل کو دیکھ دیکھ جیتی تھی۔ اسے اردگرد کا ہوش ہی نہ تھا۔ نورین کے جانے کے دن قریب آ رہے تھے۔ ایک دن ریاض کام سے واپسی پر ثنا کے لیے سوٹ لے آیا۔

ثنا کو سوٹ بہت پسند آیا۔ لیکن نورین کا خیال کرتے ہوئے ریاض سے کہا۔

''ایک نورین کے لیے بھی لے آتے...... اتنے دن اس نے میرا کتنا ساتھ دیا ہے اب وہ چلی جائے گی۔'' ریاض کو افسوس ہوا۔

''کوئی بات نہیں کل لے آؤں گا اس کے لیے......لیکن اِسے پسند بھی آ جائے گا میرا لایا ہوا سوٹ۔'' ثنا کچھ دیر سوچتی رہی پھر ریاض کو مخاطب کر کے کہا۔

''آپ ایسا کرنا کل گھر واپس آ کر اسے ساتھ لے جانا سوٹ دلوا کے لے آنا۔''

ریاض اور ثنا کے خاندان میں تعلیم کا زیادہ رجحان نہیں تھا کوئی میٹرک کر لے بڑی بات تھی۔ زیادہ تر بس پرائمری پاس تھے یا مڈل......اور دین کی تعلیم کی طرف رجحان اس سے بھی کم...... جو باتیں خاندان میں یا آس پاس دین کے حوالے سے مشہور ہیں بس وہی جانتے تھے۔ لاعلمی اور کم فہمی انسان کو بہت سی پریشانیوں میں مبتلا کر دیتی ہے اور بعض اوقات زندگیاں ہی تلپٹ ہو جاتی ہیں۔

دوسرے دن ریاض فیکٹری سے واپس گھر آیا تو چائے پی کر نورین کو ساتھ چلنے کے لیے کہا ثنا نے نورین کو پہلے ہی بتا دیا تھا اور وہ تیار بیٹھی تھی۔ ریاض کے کہتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنا گاؤن پہن کر اوپر سے دوپٹہ لپیٹ لیا اور ریاض کے ساتھ بائیک پر بیٹھ کر چل دی۔

خریداری کے بعد واپسی پر ایک آئس کریم پارلر سے دونوں نے آئس کریم کھائی اور ثنا کے لیے بھی لے لی۔

تین دن بعد نورین کو اپنے گھر چلے جانا تھا لیکن ریاض نے روک لیا کہ اتوار کے دن چھٹی ہو گی میں چھوڑ آؤں گا۔'' ثنا بھی خوش تھی کہ ریاض اس کی بہن کا کتنا خیال کر رہا ہے۔

نورین کو گئے ایک ہفتہ ہی ہوا تھا کہ فیکٹری میں 2 چھٹیاں ایک ساتھ آ گئیں۔ ریاض نے ثنا سے کہا۔

''دو دن کی چھٹی آ رہی ہے چچا (ثنا کے ابو) کے گھر چلتے ہیں کیا خیال ہے؟ دو دن وہاں رُک جائیں گے تم بھی کہتی ہو میکے میں رہنے نہیں دیتے۔ اب یہ تمہارا ارمان بھی پورا ہو جائے گا۔''

ثنا کی تو مراد بر آئی۔ میکے جانے کے نام پر تو ہر لڑکی خوش ہوتی ہے۔ وہ بھی خوش تھی اُس نے فون پر اپنی امی سے بھی کہہ دیا ہم دونوں رُکنے آئیں گے۔ ثنا خوشی خوشی شوہر کے سنگ میکے چلی گئی۔

جب دو دن وہاں رُک کر شام کو واپس آنے لگے تو ثنا اور ریاض نے نورین کو بھی کہہ دیا چلنے کے لیے...... نورین تو گویا تیار ہی بیٹھی تھی چلنے

کے لیے' امی سے کہہ کر ثنا کے ساتھ اُس کے گھر آ گئی۔

پھر تو اکثر یہ ہونے لگا۔ نورین ثنا کے گھر آ کر کئی کئی دن رہ جاتی۔ پردے حجاب کا کوئی خاص ماحول نہ تھا۔ بازار سے کچھ لانا ہے مناہل کا سوٹ یا کوئی اور چیز...... نورین فوراً ریاض کے ساتھ بائیک پر جانے کو تیار ہو جاتی۔ ثنا بھی خوش ہو جاتی۔

عمر رسیدہ زیرک نگاہوں سے بھلا یہ سب کیسے پوشیدہ رہ سکتا تھا۔ گلی کے نکڑ پر ثنا اور ریاض کی پھوپو کا گھر تھا۔ ایک دن ثنا کے پاس آئیں۔ جب انہیں اندازہ تھا کہ وہ گھر پر اکیلی ہو گی اور آتے ہی اُسے آڑے ہاتھوں لیا۔

''ثنا بیٹی یہ تم کیا آنکھیں بند کر کے زندگی گزار رہی ہو۔''

''کیا ہو گیا پھوپو' بہت غصے میں لگ رہی ہو۔''

''بیٹا غصہ تو آئے گا۔ جب اتنا سب کچھ کسی کی ناک کے نیچے ہو رہا ہو اور وہ سب ہونے دے۔''

''پھوپو پہیلیاں کیوں بوجھوا رہی ہو' صحیح بتاؤ کیا ہوا ہے؟''

''ثنا تم آنکھیں کھلی رکھو اپنے میاں اور نورین کو اتنی کھلی چھٹی نہ دو...... بعد میں پھر تم روؤ گی۔''

''خدا نہ کرے پھوپو ایسا ہو۔'' ثنا لرز گئی۔

''لیکن یہ نورین والی بات...... پھوپو ایسا کچھ نہیں ہے ریاض تو نورین کو بیٹی کی طرح سمجھتے ہیں۔'' پھوپو تاسف سے ثنا کو دیکھ کر رہ گئیں۔

''دیکھ لو بیٹا...... میں نے تو تمہیں سمجھا دیا ہے۔'' یہ کہتے ہی پھوپو اپنے گھر کو چل دیں۔

ہائیکو

کالے منظر دیکھ رہی ہوں
اندھی آنکھیں کھولوں کیسے
تاریکی سے سیکھ رہی ہوں

☆......☆

میں غلام ہوں
میرے پی بتا
کس دام ہوں

☆......☆

کروٹوں سے لکھ دی میں نے
اپنے بستر پر یہ کہانی
جیون دھارا اور جوانی

☆......☆

تیرا درد چھپانے کو
میں دوڑی آنگن میں
روتی رہی ساون میں

شمع حفیظ

غفلت کے پردے دبیز ہو جائیں تو پھر کچھ بھی نظر نہیں آتا اور جب یہ پردے چاک ہو جاتے ہیں تو حالات بہت بھیانک شکل اختیار کر چکے ہوتے ہیں۔

مناہل تین سال کی ہو گئی تھی۔ وہ اپنی توتلی زبان میں بہت سی باتیں کرنے لگی تھی۔ ثنا کا ارادہ تھا کہ اب مناہل کو اسکول داخل کرا دیا جائے۔

ایک دن ریاض فیکٹری سے واپس گھر آیا تو کچھ تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔ ثنا نے پوچھا۔

''کیا بات ہے؟ آج کچھ زیادہ تھک گئے ہیں۔''

''ہاں آج کام کچھ زیادہ تھا بس تھکن ہو گئی۔''

''اچھا تم ہاتھ منہ دھو لو میں چائے لے کر آتی ہوں۔'' ریاض ہاتھ منہ دھو کر آ کے پلنگ پر بیٹھ گیا ثنا چائے لے آئی۔

چائے پیتے ہوئے ریاض نے کہا۔

''کافی دن ہو گئے تم میکے نہیں گئیں۔ کل تمہیں چھوڑ آؤں گا' دو چار دن وہاں رہ رک جانا۔'' ثنا بھی خوش تھی میکے جانے کے نام سے......

دوسرے دن ریاض ثنا اور مناہل کو لے کر چچا کے گھر چھوڑ آیا۔ میکے رہتے دو دن ہوئے تھے کہ ثنا کے پاس 'طلاق' کے کاغذات پہنچ گئے۔ ثنا کو تھوڑا بہت پڑھنا تو آتا تھا۔ پڑھا یقین نہیں آیا دوبارہ پڑھا اُسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ نورین جو دوسرے کمرے میں فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ باہر صحن میں آئی ثنا کو ڈھونڈتی ہوئی۔ ثنا وہیں صحن میں تخت پر گم صم' ہاتھ میں کاغذات پکڑے بیٹھی تھی۔ نورین نے ثنا کا کندھا ہلا کر پوچھا۔

''کیا تمہیں وہ کاغذ مل گیا جو ریاض نے بھیجا ہے؟'' ثنا ایک ٹک نورین کو دیکھے گئی۔ امی پڑوس میں گئی ہوئی تھیں۔ نورین کا چہرہ ثنا کو دھندلاتا ہوا محسوس ہوا۔ ہر طرف اسے دھواں ہی دھواں محسوس ہو رہا تھا۔

شاید دھواں اس کے اندر تک بھر گیا تھا۔ اسے اس کے علاوہ کچھ نظر نہ آ رہا تھا اور اسی لمحے وہ بے ہوش ہو گئی۔

☆......☆......☆

ثنا کو طلاق کے کاغذات ملنے کے دو دن بعد ہی نورین اور ریاض نے نکاح کر لیا تھا۔ ریاض نے کچھ دن بعد مناہل کو بھی ثنا سے لے لیا تھا۔ مناہل کے لیے زیادہ مسئلہ یوں نہیں ہوا کہ وہ نورین سے کافی ہلی ہوئی تھی۔ شروع میں اپنی امی کو یاد کیا۔

اور پھر ماں کا عکس دھندلا گیا۔ لیکن ثنا بیٹی کے لیے شروع میں بہت تڑپی' آخر کو اسے صبر آ ہی گیا۔

☆......☆......☆

اس بات کو تین سال بیت گئے مناہل ثنا کی بیٹی اب 6 سال کی ہو گئی نورین کی اپنی بھی ایک بیٹی ہو گئی۔ ثنا کی اب دوسری جگہ شادی ہو چکی ہے بیٹی کو یاد کرتی ہے۔ لیکن یہی کہتی ہے۔

''اچھا ہے بیٹی مجھے یاد نہ کرے جب اُسے وہاں رہنا ہے تو وہیں اُس کا دل بھی لگے۔'' ثنا کی امی کا اب نورین سے ملنا ہو گیا ہے۔ کبھی کبھی جب نورین کے گھر جاتی ہیں تو آ کر ثنا کو تسلی دیتی ہیں کہ نورین مناہل کا بہت خیال رکھتی ہے۔ ثنا مطمئن ہو جاتی ہے۔

''اللہ تعالیٰ ثنا کے دل کو قرار دے آمین۔''

☆☆......☆☆

کراچی سے ارسال کردہ سچی کہانی

وہ ایک ڈکیتی

وہ بظاہر ڈکیتی کی ایک دوسطری خبر تھی مگر ایسی خبروں کے پیچھے

کتنے بڑے سانحے ہوتے ہیں کراچی والے ہی بخوبی سمجھتے ہیں......

رفعت خان

بروز اتوار کو سب گیارہ بجے ناشتے سے فارغ ہوئے بھائی اور ان کے بچے ٹی وی دیکھنے میں لگ گئے اور گھر کی خواتین گھر کے کاموں میں مصروف ہوگئیں۔

اچانک داخلی دروازے سے چار نقاب پوش گھر میں داخل ہوگئے داخل ہوتے ہی انہوں نے تمام افراد کو ایک کمرے میں جمع کرلیا' لڑکوں کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے باندھ دیے گئے بڑے بھیا گھر سے باہر تھے جب وہ گھر واپس آئے تو ڈاکو انہیں بھی کمرے میں لے آئے اور باندھ کر زمین پر اوندھا کردیا اور بھائی کو گن پوائنٹ پر لے لیا کیونکہ وہ اس گھر کے سربراہ تھے اور ایک اچھی پوسٹ پر فائز تھے اور بہت غمزدہ بھی تھے کہ کچھ عرصے پہلے ہی ان کی وائف کی ڈیتھ ہوگئی تھی اور وہ اُن کے غم میں ابھی تک سوگوار تھے اس اچانک سے حملے سے بعد میں ان کا ذہن بالکل ماؤف ہوگیا تھا ان ڈاکوؤں نے ظلم و بربریت کی انتہا کردی تھی مگر وہ تو صرف زیور کے ہی ڈکیت نہیں تھے بلکہ وہ تو انسانون کے جذبات واحساسات کے بھی قاتل تھے بے رحمی لگتا تھا ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔

ان ڈاکوؤں نے بھائی کے سامنے ہی ان کی بیٹی اور بہو دونوں کو گن پوائنٹ پر لے لیا تھا چار بندے تھے وہ ایک بھائی کے سر پر سوار تھا دوسرا گھر کا جائزہ لے رہا تھا پھر ان میں سے ایک دھاڑا۔

''گھر کا جتنا بھی زیور اور کیش وغیرہ ہے سب ان کے حوالے کردیا جائے انکار کی صورت میں بیٹی اور بہو دونوں کو گولی ماردی جائے گی۔''

اِدھر ان کی بیٹی اور بہو کا ڈر وخوف سے برا حال تھا۔ چہرے بالکل زرد اور پیلے پڑ چکے تھے جسم سوکھے پتوں کی طرح سے لرز رہے تھے۔ بے بسی کی انتہا ہوگئی تھی۔ اِدھر بھائی گڑگڑائے۔

''میری بیٹی اور بہو کو کچھ نہ کہا جائے جو چاہے لے جاؤ۔ لیکن خدارا ان کو چھوڑ دو بہت معصوم اور کمزور دل ہیں کہیں ہارٹ فیل ہی نہ ہوجائے۔''

مگران ظالموں کو کیا احساس لگتا تھا ان کی ٹریننگ ہی بے حسی کی دی جاتی تھی کہ ان لوگوں نے اپنے کان اور آنکھیں بند کر لیں تھیں ان کو تو صرف محنت اور حلال کی کمائی کا خزانہ نظر آ رہا تھا شاید وہ دوسروں کا بھی اپنی طرح کا حرام سمجھ رہے تھے۔

برسوں کی محنت سے بھائی نے پائی پائی جوڑی تھی اور اب کچھ ہی دنوں بعد ان کی لاڈلی بیٹی ہانیہ کا نکاح تھا اور گھر میں سب کچھ اس کی شادی کے لیے ہی رکھا ہوا تھا ایسا لگتا تھا کہ کسی نے مخبری کی ہو۔

خیر بھائی کے سامنے ہی بیٹی اور بہو کو غلیظ نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ بے چاری ہانیہ اور بھابی زبیدہ آہ وزاری کرنے لگیں۔

''ہم سب کچھ دے دیں گے مگر پلیز ہمارے ساتھ کوئی بدتمیزی نہ کریں۔''

یہ بولنا قیامت سے کم نہ ہوا اور ان کے نازک سے گالوں پر طمانچوں کی بوچھاڑ کر دی' کتنے بے رحم تھے یہ انسان نہیں نہیں یہ انسان نہ تھے بلکہ درندے تھے جن کے اندر انسانیت مر گئی تھی ضمیر مردہ ہو چکے تھے۔ تب بھائی چیخے۔

''خدارا کچھ تو لحاظ کرو کیا تمہاری ماں بہنیں نہیں ہیں کیا تم لوگ انسان نہیں ہو۔'' پھر اس کے بعد بھائی کو بیڈ پر ہی پٹخ دیا۔ البتہ ایک ڈاکو بولا۔

''چلو چلو یہ سب چھوڑو جس کام سے آئے ہیں اسے پورا کرو مگر اتنی دیر میں بھابی زبیدہ بے ہوش ہو گئیں تھیں۔



بے چاری ہانیہ اس کا تو دم ہی اٹک گیا خوفزدہ نظروں سے اور پھولی سانسوں سے دیکھنے لگی پھر ایک ڈاکو آگے بڑھا اور بولا۔

”جلدی بتا لڑکی زیور اور کیش کہاں ہے ورنہ تجھے دوسری دنیا میں پہنچا دیں گے۔“ پھر وہ لرزتے قدموں سے الماری کی طرف بڑھی۔ لگتا تھا وہ بھی بھابی کی طرح بے ہوش ہو جائے گی یا پھر مر ہی جائے گی۔

مگر اس میں شاید حوصلہ باقی تھا کانپتے ہاتھوں سے اس نے الماری کے خانوں کی طرف اشارہ کیا۔ ظالموں نے پوری الماری خالی کر دی انہیں بہت کچھ مل گیا۔ مارے خوشی کے ان سب نے ایک دوسرے کے ہاتھوں پر تالیاں مارنی شروع کر دیں۔

الماری کے سارے کپڑے خوشی سے اِدھر اُدھر اچھالنا شروع کر دیے ایک شادی کا جوڑا ہانیہ کے اوپر گرا بے اختیار ہانیہ حسرت سے اپنے اس شادی کے جوڑے کو دیکھنے لگی کہ کچھ ہی دنوں بعد تو اس کو پیا دیس جانا ہے مگر شاید اب نہیں جانے یہ خیال کیونکر اس کے ذہن میں کوندا کتنے ظالم ہوتے ہیں یہ ڈاکو سب کچھ جانتے ہوئے بھی کسی کی خوشیوں کو لوٹ رہے تھے۔

لگتا تھا قارون کا خزانہ مل گیا ہو پاگلوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے یہ ڈاکو بالکل شیطان کے چیلے لگ رہے تھے بلکہ شیطان بھی ایک طرف کھڑا ہو کر شرمارہا ہوگا۔ پھر اچانک ڈاکوؤں نے ہانیہ کو خونی نظر سے دیکھنا شروع کیا۔ جیسے کہ ان کو یاد آ گیا ہو۔

”ارے ابھی تو اور بھی لوٹنا ہے۔“ ہانیہ کی سماعت سے ایک دم چیخ کی آواز آئی۔

”چل اوپر ڈاکٹر کی فیملی سے بھی انجوائے کرنا ہے۔ او جلدی کر اوپر چل کر دروازہ کھلوا...... خبردار کوئی بھی چالاکی کی تو تمہیں بھون دیں گے۔“ پھر ہانیہ بڑے مضبوط دل و دماغ کے ساتھ قدم اٹھانے لگی ایسا لگتا تھا اس وقت سب کچھ اس کے نازک کندھوں پر بوجھ ڈال دیا ہو جسے اٹھاتے ہوئے اس کے جذبات‘ احساسات‘ اور نفس کے کیسے کیسے ٹکڑے ہو رہے ہوں اور پھر بھاری قدموں سے فرسٹ فلور پر پہنچ کر دروازے پر دستک دی۔

تھوڑی دیر میں ہی دروازہ ڈاکٹر کی وائف مس میری نے کھولا جو کہ کرسچن تھیں۔

دونوں میاں بیوی بہت اچھے تھے انہوں نے حیران ہو کر ہانیہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑتی دیکھیں پھر ان کو لگا کہ ان کے گھر میں بھونچال آ گیا ہو ہینڈز اپ کی کڑک دار آواز کے ساتھ ہی ان کے بھی ہوش گم ہو گئے۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہانیہ کو اور اس کے پیچھے اور اپنے برابر میں کھڑے ڈاکو کو دیکھا جن کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔

ڈاکٹر واش روم میں تھا جب وہ باہر نکلا تو اسے بھی زد میں لے لیا گیا۔ پھر ڈاکو زور سے دھاڑا۔

”جو کچھ ہے خاموشی سے حوالے کر دو۔“ میری نے لرزتی آواز کے ساتھ کہا۔

”وہ تو سب کچھ بینک میں ہے گھر میں کچھ نہیں ہے۔“ مس میری کا اتنا کہنا غضب ہی ہو گیا تڑاخ تڑاخ کی آوازوں سے کمرہ گونج اٹھا مس میری نازک سی اور دھان پان سی تھیں مرد کے ہاتھوں کو برداشت نہ کر پائی لڑکھڑاتی ہوئی دیوار سے جا ٹکرائی اور سر پکڑ کر دیوار سے ہی لگ کر بیٹھ گئیں۔ نازک سے گالوں پر نیل پڑ گئے ظالموں

نے ان کا بھی سارا گھر الٹ پلٹ کر دیا وہاں بھی ان کو بہت کچھ مل گیا۔ پھر دونوں میاں بیوی کو بڑی بے دردی سے باندھ کر اوندھے منہ زمین پر لٹا کر ہانیہ کو واپس نیچے لے کر آئے۔ جلدی جلدی سب سمیٹ کر جاتے جاتے وارننگ دے گئے۔

"خبردار جو کسی نے پولیس کو فون کیا ورنہ نتیجے کے خود ذمہ دار ہو گے۔" اور پھر وہ ایک منٹ میں رفو چکر ہو گئے ان کے جانے کے بعد ہانیہ کا دماغ پندرہ منٹ تک ماؤف رہا اور پھر ایک دم اپنے باپ کے کراہنے پر جیسے ہوش میں آئی ہو۔ صرف اس وقت ہانیہ ہی آزاد تھی۔

بھو بے ہوش تھی اور باقی سب تو بندھے پڑے تھے بڑی مشکل سے ہانیہ نے سب کے ہاتھ پاؤں کو کھولا سب کی رسیاں کھولتے ہوئے آنسو بے اختیار اس کی آنکھوں سے بہنے لگے زبان سے سسکیاں اور کراہیں نکلنے لگیں رسیوں سے آزاد ہوتے ہی بھائیوں نے فوراً اپنی معصوم بہن کی طرف دیکھا اور اسے سینے سے لگا کر تسلیاں دینی شروع کیں پھر باپ کی طرف دیکھا جو کہ بالکل خاموش بیٹھا جیسے کہ اپنے آپ میں نہ ہو تینوں بچے باپ کی طرف بڑھے اور اس سے لپٹ کر سب نے رونا شروع کر دیا۔

سب نے بہت دیر سے ضبط کیا ہوا تھا دل کا غبار آنسوؤں سے بہنے لگا پھر باپ نے بہت پیار سے بچوں کو بہلایا سمجھایا پھر بڑے بھائی کو اپنی بیوی زبیدہ کا خیال آیا کہ وہ کہاں ہے ہانیہ کو بھی ایک دم یاد آیا کہ بھابی تو بے ہوش پڑی ہیں جلدی سے جا کر ان کو ہوش میں لانے کی کوشش کی تھوڑی ہی دیر میں وہ جب ہوش میں آئی تو ہانیہ سے لپٹ کر بری طرح سے رونا شروع کر دیا۔

ان کی طبیعت ویسے بھی ٹھیک نہیں تھی ان کا ٹائم باقی تھا لیکن شاید ٹینشن نے ان پر بری طرح سے اثر کیا وہ بے چاری بے حال ہو گئیں اور فوری طور پر ان کو ہاسپٹل لے جانا پڑا جہاں پر ان کی وقت سے پہلے ڈیلیوری کی وجہ سے کیس بگڑ گیا بچہ ہو تو گیا مگر وہ مردہ پیدا ہوا۔

"پتہ نہیں سانس رکنے سے یا دم گھٹنے سے

اِدھر زبیدہ بھابی کی حالت بھی کافی تشویشناک ہو گئی لیکن ڈاکٹروں کی بھرپور توجہ سے ان کی جان بچا لی گئی۔

پہلا بچہ تھا کیسے بتایا جائے کہ وہ دنیا میں مردہ ہی آیا اور یہ سب کچھ حالات کی وجہ سے ہوا ایک ماں سے اس کا بچہ بچھڑ گیا باپ کا دل بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا کتنے ارمانوں سے آنے والے بچے کی شاپنگ کی گئی۔ آنے والے مہمان کے لیے یہ ہو گا وہ ہو گا یہ اس گھرانے کی پہلی بڑی خوشی تھی جو کہ ان سے چھن گئی خیر سب نے اپنے آپ کو بڑے حوصلے دیے اور پھر زبیدہ بھابی کو بتا دیا گیا کہ ان کا بچہ اب اس دنیا میں نہیں رہا وہ ایسی بلک بلک کر روئیں کہ دوسرے لوگوں کا بھی دل بھر آیا اور انہوں نے ڈاکوؤں کو بددعائیں دیں کہ یہ سب کچھ ان کی وجہ سے ہوا نہ وہ ڈکیتی کرتے نہ زبیدہ بھابی خوفزدہ ہوتیں اور نہ یہ سب کچھ ہوتا آہستہ آہستہ لوگ آتے گئے جاتے گئے اپنے اپنے طور پر سب تسلیاں دیتے۔ یہ تو اس ملک کا رواج بن چکا تھا کہ جب جس کا دل چاہے کچھ بھی کر لے اور عوام پستی رہے۔ سب حیران تھے کہ آخر ڈاکو اتنے آرام سے اندر کیسے آ گئے اور جب انکوائری ہوئی تو سب سخت حیران رہ گئے اس گھر کی ماسی کی ملی بھگت سے یہ سب کچھ طے ہوا۔

وہ ایسے کہ گھر کے بڑے دروازے کی چابی اندر ہک ہولڈر میں ٹانگتے تھے تو ماسی نے صابن

سے اس چابی کا ناپ لے کر ڈاکوؤں کو دیا اور ان ڈاکوؤں نے اس کی ڈپلی کیٹ چابی بنوا کر اپنا کام کر دکھایا اسی ڈکیتی کے بعد ماسی بھی غائب ظاہر ہے اس نے رہ کر اپنا بیڑا غرق کرنا تھا۔

ہانیہ کی شادی کا سارا زیور قیمتی ملبوسات کیش رقم بھابی زبیدہ کا زیور کچھ بانڈز موبائل' لیپ ٹاپ وغیرہ اچھا خاصہ اماؤنٹ وہ سب لوگ لوٹ کر لے گئے اماؤنٹ تو گیا تو گیا ان سب کے دل و دماغ پر اس ڈکیتی کا بہت برا اثر پڑا اور بہت نقصان ہوا وہ اس طرح سے ہانیہ کا رشتہ ختم ہو گیا۔

پتہ نہیں کیسے لوگ تھے. بجائے اس کے وہ ان کو تسلی دیتے بغیر کسی وجہ کے ان لوگوں نے رشتہ ختم کر کے کم ظرفی کے ریکارڈ قائم کر دیے۔ کتنے ارمانوں سے ہانیہ کی منگنی دھوم دھام سے ہوئی تھی اتنی معصوم سی ہانیہ کا بھی ان کم ظرفوں کو خیال نہ آیا اور اسے اندھیروں میں ڈبو کر اپنا راستہ الگ کر لیا ۔ چلو ایک طرح سے ان لوگوں کی اصلیت پتہ چل گئی کہ کتنے لالچی لوگ تھے۔

قارئین بات یہیں تک ختم ہو جاتی تو اچھا تھا منگنی کو ایک سال ہو چکا تھا اور دلی طور پر ایک دوسرے سے انسیت ہو گئی تھی اس انسیت کو دل سے نکالنا آسان کام تو نہ تھا اس کا اثر ہانیہ پر بہت برا پڑا اور وہ شدید بیمار پڑ گئی اس کا مان اس کا یقین کیسے ٹوٹ کر بکھر گیا تھا وہ اندر تک ٹوٹ گئی مگر ایک لفظ نہ بولی بس معصومیت سے سب کو دیکھے گئی ایسے جیسے وہ ایک معمولی سا کھلونا ہو جسے لات مار کر توڑ دیا گیا ہو۔

جس کی کرچیاں دل میں پیوست ہو گئی ہوں شادی میں ایک ماہ ہی تو رہ گیا تھا ہال کی بکنگ تو ہو بھی گئی تھی اور ایڈوانس بھی دے دیا گیا تھا بلکہ کارڈ بھی چھپ گئے تھے صرف بانٹنا رہ گیا تھا یہ سب میرے کزنز برداشت نہ کر سکے۔

ان کو شدید قسم کا دل کا دورہ پڑا اور وہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ختم ہو گئے۔ سارا خاندان ماتم کدہ بن گیا اس غم نے سب کے دل ہلا دیے سب خوشیاں ختم ہو گئیں اس ڈکیتی نے اس خاندان کا کتنا نقصان کیا سب سے بڑا نقصان تو میرے کزنز کے ساتھ ہوا کہ وہ یہ سب کچھ برداشت نہ کر سکے۔

سارے غموں سے آزاد ہو کر خالق حقیقی سے جا ملے۔ ہانیہ کا رشتہ ختم ہو گیا اور وہ گم صم ہو گئی آنے والا مہمان ان ڈاکوؤں کی نظر ہو گیا سارا مال چلا گیا۔

دیکھا جائے تو اس ڈکیتی نے ان کی خوشیاں مال و زر اور سرپرست چھین لیا۔ کیا ملا ان ڈاکوؤں کو' کیا وہ قیامت کے روز جواب دہ نہ ہوں گے وہ تو یہ سب مال و زر لوٹ کر خوشیاں منا رہے ہوں گے کیا ان کو یہ پتہ ہو گا کہ ان کے پیچھے اس خاندان پر کیا بیت رہی ہو گی اور کیا بیتنے والا ہو گا۔

اگر وہ ان سب باتوں کا سوچتے تو ڈکیتی ہی کیوں ڈالتے وہ بے حس اور بے ضمیر انسان تھے جن کے پاس دل نہ تھا جنہیں اپنی خوشیوں سے مطلب تھا۔

مگر وہ شاید یہ بھول گئے ہیں کہ ان سب باتوں کا حساب تو ان کو قیامت کے روز دینا ہو گا پھر کیا کریں گے وہ بھی اس وقت ایسے ہی بے بس ہوں گے خدا کے آگے جیسے میرے کزنز کے خاندان والے تھے۔

مگر میرا ماننا ہے کہ آخرت میں تو سب کو اپنے کیے کا حساب دینا ہی ہو گا مگر دنیا میں بھی بدی اور نیکی دونوں کا حساب کتاب شروع ہو جاتا ہے۔

☆☆......☆☆

سرگودھا سے ارسال کردہ تحریر

قسمت کی لکیریں

وہ بدکردار عورت تھی اسی لیے اس کے شوہر نے اُسے کھڑے کھڑے طلاق دے دی، مگر زندگی نے ابھی مزید کھیل کھیلنے تھے موبائل کے غلط استعمال کی سزا بہت سخت تھی......

ممتاز احمد

میری بربادی کی داستان اُس وقت شروع ہوئی جب میرے شوہر کی ٹرانسفر دوسو کلومیٹر دور ایک شہر میں ہوئی اُس وقت میری عمر ستائیس سال تھی۔ میری شادی تین سال پہلے ہوئی تھی۔ میں بہت خوبصورت اور حسین وجمیل تھی گوراچٹا رنگ لمبا قد بڑی بڑی گہری جھیل جیسی آنکھیں تیکھی ناک اور رس بھرے ہونٹ میرا سراپا بہت دلکش اور پُرکشش تھا۔ جو بھی مجھے دیکھتا بس دیکھتا ہی رہ جاتا۔ بدقسمتی سے مجھے پڑھائی کا کوئی شوق نہیں تھا بس گرتے پڑتے مڈل کا امتحان واجبی سے نمبروں سے پاس کیا اور گھر بیٹھ گئی امی ابو نے بہت زور لگایا۔

''بیٹا اور آگے پڑھ لو پڑھائی کام آئے گی۔'' تو میں کہتی۔

''جب اتنا پڑھ لکھ کر ہانڈی چولہا ہی کرنا ہے تو پڑھنے کا کیا فائدہ مجھ سے اور نہیں پڑھا جاتا۔'' میرا یہ جواب سن کر امی ابو خاموش ہو جاتے۔ مجھے بچپن سے ہی بننے سنورنے کا بہت شوق تھا آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اُلٹا سیدھا میک اپ کرتی رہتی تو امی مجھے ڈانٹ دیتیں۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی تو یہی وجہ تھی کہ امی ابو میرے بہت ناز نخرے اٹھاتے وہ بہت پیار کرتے۔ میرے ابو ایک سرکاری محکمے میں کلرک تھے اور اسی سرکاری محکمے کی ایک کالونی میں چھوٹا سا کوارٹر ہمیں رہنے کے لیے ملا ہوا تھا جس میں ہم تین لوگ رہ رہے تھے۔ ابو کی بہت تھوڑی تنخواہ تھی جس میں تین ٹائم کھانے کے علاوہ ہماری گزر بسر ہو جاتی تھی۔ امی ہر ماہ تھوڑا بہت پس انداز کر کے میرے جہیز کی کوئی چھوٹی موٹی چیز بنا لیتیں۔ میری عمر جب تیئس سال ہوئی تو ابو کے ایک کولیگ کے بیٹے کا رشتہ میرے لیے آیا لڑکا گریجویٹ تھا اور کسی محکمے میں آفس سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز تھا۔

لڑکے کا نام اصغر تھا اور سانولے رنگ کا واجبی شکل وصورت کا لڑکا تھا۔ میری وہ عمر تھی جس میں چاہے جانے کا بہت جذبہ تھا۔ میری شدید خواہش تھی کہ کوئی خوبصورت لڑکا مجھ سے ٹوٹ کر عشق و محبت کرے مگر گھر سے نکلنے اور کہیں آنے جانے کی

اجازت نہ تھی۔ میرے چوبیس گھنٹے گھر میں ہی گزرتے۔ جیسے ہی اصغر کا میرے لیے رشتہ آیا تو میرے والدین نے تھوڑی سوچ بچار کے بعد ہاں کردی۔ ایک مختصر سی تقریب میں میری منگنی کی رسم ادا ہوئی اور ایک سال بعد شادی طے ہوئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سال کا عرصہ پلک جھپکتے گزر گیا میرے ابو اپنے آفس میں صبح سے لے کر شام تک بہت کام کرتے تھے جس کی وجہ سے اُن کے اعصاب بری طرح تھک گئے اور وہ بیمار رہنے لگے۔

انہوں نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی اور جو واجبات انہیں ملے وہ انہوں نے سارے میری شادی پر خرچ کردیے۔ میری شادی کے بعد انہوں نے سرکاری کوارٹر چھوڑ دیا اور ایک کمرے والا چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیا۔ میں بیاہ کر اپنے سسرال آ گئی جہاں کمبائنڈ فیملی تھی۔ ساس سسر کے علاوہ تین دیور اور دو نندیں تھیں۔ میرے شوہر اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ میرے سسر بھی جاب کر رہے تھے اور میرے شوہر بھی جبکہ دیور اور نندیں ابھی پڑھ رہے تھے۔ یہاں بھی آمدنی کم تھی اور اخراجات زیادہ بس جیسے تیسے کر کے اچھا وقت گزر رہا تھا۔

میرے سسرال والوں نے جہیز کے نام پر کوئی چیز نہیں لی تھی انہوں نے سختی سے منع کر دیا تھا کہ انہیں جہیز نہیں چاہیے ایک تو ان کا گھر چھوٹا تھا جہیز رکھنے کی جگہ نہ تھی دوسرا وہ لالچی لوگ نہ تھے بس وہی چند چیزیں جن میں کمبل، گدے، باورچی



کھانے کے برتن وغیرہ جو میری امی نے بنائے تھے وہ میں اپنے ساتھ لے کر آئی۔ میرے سسرال والے اچھے لوگ تھے۔ میرا ہر طرح سے خیال رکھتے۔ اصغر اپنے کام سے کام رکھنے والا لڑکا تھا۔ وہ کوئی فضول بات نہ کرتا تھا میرے ساتھ اچھا برتاؤ کرتا تھا۔ وقت اچھا گزر رہا تھا۔

میرے ہاں ابھی تک اولاد پیدا نہیں ہوئی تھی۔ تین سال کا عرصہ بیت گیا تھا ایک دن اچانک میرے شوہر کے ٹرانسفر آرڈرز آ گئے۔ انہوں نے بہت کوشش کی آرڈرز رکوانے کی مگر کامیاب نہ ہوئے۔ مجبوراً انہیں دوسرے شہر ڈیوٹی جوائن کرنے کے لیے جانا پڑا۔ پہلے پہل تو وہ ہفتے بعد گھر آ جاتے۔ مگر انہیں وہاں رہنے اور کھانے پینے کا مسئلہ تھا۔

بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ وہ اُسی شہر میں کوئی چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیں اور مجھے اپنے ساتھ رکھیں چنانچہ انہوں نے ایک کرائے کا گھر لے لیا اور ضروریاتِ زندگی کا ضروری سامان ڈالا اور مجھے اپنے ساتھ وہاں لے گئے۔ جو مکان کرائے پر لیا تھا اُس کا کرایہ تو بہت تھوڑا تھا وہ نسبتاً ایک کم آبادی والے علاقے کی ایک نئی کالونی تھی۔ مجھے شروع میں وہاں ایڈجسٹ ہونے میں تھوڑی مشکل پیش آئی کیونکہ زندگی میں پہلی بار میں دوسرے شہر میں آئی تھی۔ میرے شوہر صبح سویرے ناشتہ کر کے گھر سے آفس کے لیے نکل جاتے اور شام کے ساڑھے چار بجے واپس آتے۔

انہوں نے رابطے کے لیے مجھے ایک سیکنڈ ہینڈ موبائل فون لے دیا۔ دن میں ایک دو بار وہ کال کر کے میری خیریت پوچھ لیتے۔ ابھی اُس شہر میں مجھے آئے پندرہ سے بیس دن ہی ہوئے تھے کہ ایک شام میرے دانت میں درد ہونا شروع ہو گیا تو میرے شوہر مجھے قریبی ایک ڈینٹل سرجن کے پاس لے گئے۔ ڈینٹل سرجن ایک جوان، گورا اور خوبصورت ڈاکٹر تھا۔ اُس ڈاکٹر نے مجھے بڑی پُر اشتیاق نظروں سے دیکھا اور تسلی سے میرے دانت کا معائنہ کیا۔ تکلیف تو معمولی سی تھی مگر ڈاکٹر نے مجھے ڈرا دیا اور کہنے لگا۔

''آپ کو ٹریٹمنٹ کے لیے روزانہ آنا پڑے گا۔'' دو تین دن ہم ڈاکٹر کے پاس جاتے رہے۔ چوتھے دن گئے تو اُس کا کلینک بند تھا۔ اگلے دن میں نے ڈاکٹر کو بتایا کہ ہم کل بھی آئے تھے مگر آپ کا کلینک بند تھا تو ڈاکٹر نے کہا۔

''جی ہاں مجھے کچھ ضروری کام ہیں تو کبھی کبھی میرا کلینک بند ہوا کرے گا۔'' اُس نے مجھے اپنا موبائل نمبر دیا اور کہنے لگا۔

''آپ آنے سے پہلے مجھے کال کر لیا کریں۔'' میں نے ڈاکٹر کا نمبر اپنے موبائل میں محفوظ کر لیا۔ چنانچہ پورا ہفتہ ہم اُسے کال کر کے جاتے رہے۔ میرے دانت کی تکلیف تو معمولی تھی مگر ڈاکٹر نے پورا ہفتہ مجھے اپنے کلینک پر بلایا۔ میرے دانت کا درد ٹھیک ہو گیا تھا۔ اب میں نے اُس کے کلینک جانا چھوڑ دیا۔ کوئی دو یا تین دن گزرے تو دن کے ٹائم مجھے ڈاکٹر کی کال آ گئی اُس نے میری خیریت پوچھی اور اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔ اب یہ ہونے لگا کہ ہر روز ڈاکٹر کی مجھے کال آتی۔ ایک دن میں نے اُس سے پوچھا۔

''میرے دانت کی تکلیف تو معمولی سی تھی مگر آپ نے مجھے پورا ہفتہ اپنے کلینک پر کیوں بلایا؟'' میری بات سن کر ڈاکٹر خاموش ہو گیا میں نے دوبارہ پوچھا تو وہ کہنے لگا۔

''آپ میری بات کا برا تو نہیں مانیں گی؟''

میں نے وعدہ کیا کہ برا نہیں مناؤں گی تو ڈاکٹر کہنے لگا۔

''جی ہاں آپ کی تکلیف تو بہت معمولی تھی۔ مگر آپ مجھے بہت اچھی لگیں تو آپ کو دیکھنے کے لیے روزانہ بلاتا تھا۔'' الغرض ڈاکٹر نے اپنی چاہت اور محبت کا اظہار کر دیا میں نے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب میں شادی شدہ عورت ہوں' یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' تو ڈاکٹر نے کہا۔

''جو بات سچ تھی وہ میں نے آپ کو بتادی ہے۔ باقی آپ شادی شدہ لڑکی ہیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا' پیار تو پیار ہوتا ہے جس سے بھی ہو جائے۔'' میں ڈاکٹر کی بات سن کر خاموش ہو گئی اور کال کاٹ دی۔ اب ڈاکٹر روزانہ مجھے میسج کرنے لگا اور کال پر بات کرنے پر مجبور کرنے لگا۔ زندگی میں پہلی بار کسی نے مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا اور وہ بھی ایک خوبصورت ہینڈسم ڈاکٹر نے میرے دل میں چاہے جانے کی خواہش نے سر اٹھایا کیونکہ میرے دل میں بھی تھا کہ کوئی مجھ سے ٹوٹ کر پیار کرے جو کہ ڈاکٹر کر رہا تھا۔ اُس کا اپنے پیار کا اظہار میرے لیے کرنا مجھے بہت اچھا لگا۔

دوسری صبح اصغر کے آفس جانے کے بعد میں گھر میں اکیلی بور ہوتی رہتی تھی تو اصغر کے جانے کے بعد گھر کے ضروری کام نمٹانے کے بعد میں ڈاکٹر نے نمبر پر مس بیل دیتی تو فوراً اُس کی کال آ جاتی۔ پورا گھنٹہ ہماری بات ہوتی وہ کھل کر اپنی چاہت کا اظہار کرتا میری خوبصورتی کی بہت تعریف کرتا زمین آسمان کے قلابے ملاتا۔ میری سوہنی' میری میٹھی' میری جان' میری جان من وغیرہ کے الفاظ استعمال کرتا جو مجھے بہت اچھے لگتے جواب میں میں بھی اپنے پیار اور عشق کا اظہار کرتی۔ ڈاکٹر کا کلینک اتنا چلتا تھا یا نہیں مگر اُس کی زبان بہت چلتی تھی۔ وہ گفتگو کرنے کا ماہر تھا۔ مختلف اشعار اور لطیفے سناتا مزے مزے کی باتیں کرتا۔ اب میں بھی ہفتے میں ایک دو بار کسی نہ کسی بہانے سے ڈاکٹر سے ملنے اُس کے کلینک پہنچ جاتی۔ میں خوب میک اپ کر کے بن ٹھن کے اُس کے پاس جاتی وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہو جاتا۔ میں پندرہ بیس منٹ اُس کے پاس بیٹھ کر آ جاتی۔ اسی طرح چار پانچ ماہ گزر گئے۔ ڈاکٹر مجھے تنہائی میں کسی جگہ ملنے پر مجبور کرتا۔ مگر میں ڈرتی تھی کہ کسی کو پتہ نہ چل جائے۔ میں ڈاکر کے کلینک کے علاوہ کسی اور جگہ اُس سے نہیں ملی۔

اصغر شام ساڑھے چار بجے آفس سے واپس گھر آ جاتے اور سارا دن وہ آفس کا کام کر کے تھک جاتے تھے تو رات کا کھانا کھا کر وہ جلدی گہری نیند سو جاتے' رات گیارہ بجے کے بعد میں میسج پر ڈاکٹر سے باتیں کرتی' ہمارے میسجز زیادہ تر عشقیہ ہوتے اب تو ڈاکٹر میرے ساتھ سیکس چیٹ بھی کرتا جس سے مجھے بہت مزہ آتا۔ میں ساتھ ساتھ ڈاکٹر کے اور اپنے تمام میسج ڈیلیٹ کر دیتی ایک رات میسج پر بات کرتے کرتے مجھے پتہ ہی نہ چلا اور میں سو گئی میرا موبائل اصغر والی سائیڈ پر گر گیا۔ صبح جب جاگی تو مجھے میرا موبائل نہ ملا میں دیوانگی سے تلاش کرنے لگ گئی۔ اصغر نے پوچھا۔

''کیا ڈھونڈ رہی ہو؟'' تو میں نے کہا۔

''پتہ نہیں میرا موبائل کدھر گیا۔'' اصغر کہنے لگے۔

''مل جائے گا اِدھر اُدھر ہی ہوگا۔'' وہ ناشتہ کر کے اپنے آفس چلے گئے' ان کے جانے کے بعد میں نے گھر کا کونا کونا چھان مارا مگر میرا

موبائل نہ ملا۔ میں سخت پریشانی کے عالم میں گھوم رہی تھی کہ ایک گھنٹے کے بعد اصغر واپس گھر آ گئے اور مجھ سے کہنے لگے۔

”تیاری کرو ہم کچھ دنوں کے لیے واپس اپنے شہر جا رہے ہیں۔“ مجھے موبائل کی بہت فکر تھی پتہ نہیں کہاں گیا۔ میں نے جلدی جلدی اپنے کپڑے وغیرہ ایک بیگ میں ڈالے اور گھر کو لاک کیا اور لاری اڈے پہنچ گئے۔ جہاں ہمیں ہمارے شہر جانے والی بس مل گئی۔ تقریباً چار گھنٹے کے بعد ہم اپنے شہر پہنچ گئے۔ اصغر مجھے لے کر میرے ماں باپ کے گھر گئے۔ امی ابو ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے ہمیں پیار کیا اور بیٹھنے کا کہا۔ مگر اصغر نے بیٹھنے سے انکار کر دیا اور کہا۔

”میں کھڑے کھڑے آپ کی بیٹی آپ کو واپس کرنے آیا ہوں، میں اب اسے نہیں رکھ سکتا۔“ اصغر کی بات سن کر میرے امی ابو حیران رہ گئے اور اصغر سے پوچھنے لگے۔

”کیوں کیا ہوا؟ کیا کر دیا ثروت نے؟“ تو اصغر نے کہا۔

”ثروت نے وہ کچھ کیا ہے جو کسی بھی شریف گھر کی بیٹی نہیں کرتی۔ یہ بدچلن آوارہ اور بدکردار ہے۔ خاوند کے ہوتے ہوئے اس نے غیر مرد سے ناجائز تعلقات استوار کیے۔“ اتنا کہہ کر اصغر نے اپنی پاکٹ سے میرا موبائل نکالا اور کہا۔

”ثبوت کے طور پر اس کے اور ڈاکٹر کے میسجز پڑھ لیں اور دیکھیں کتنی کالز اس ڈاکٹر کی آئی ہوئی ہیں۔“ اصغر نے موبائل میرے ابو کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ اُف میرے خدایا تو میرا موبائل اصغر کے پاس تھا۔ اُس رات ہم دونوں نے بہت عشقیہ میسجز ایک دوسرے کو بھیجے تھے اور سیکس چیٹ بھی کی تھی مجھے پتہ ہی نہ چلا اور میں سو گئی۔ ابو میرے اور ڈاکٹر کے میسجز جوں جوں پڑھتے جا رہے تھے میں شرم سے زمین میں گڑھی جا رہی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور میں زمین میں سما جاؤں۔ میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ جب ابو نے سارے میسجز پڑھ لیے تو وہ حیران پریشان مجھے دیکھنے لگے۔ اصغر کہنے لگا۔

”انکل اب آپ ہی بتائیں کہ شریف گھر کی بیٹی ایسا کرتی ہے؟ میں اب اسے اپنے پاس نہیں رکھ سکتا یہ آج سے مجھ پر حرام ہے۔“ اتنا کہہ کر اصغر نے مجھے طلاق دے دی اور گھر سے چلا گیا۔

میرے ابو جو میرے میسجز پڑھنے سے پریشان تھے جب انہوں نے میری طلاق کا سنا تو انہیں جان لیوا دل کا دورہ پڑا اور وہ وہیں ڈھے گئے۔ میں چیخ چیخ کر رونے لگی۔ میرے رونے کی آواز سن کر آس پڑوس کے لوگ آ گئے مگر میرے ابو یہ دنیا چھوڑ گئے تھے میری امی اسکتے کی کیفیت میں بیٹھی تھیں اُن کا وجود ایسا تھا جیسے کاٹو تو خون ہی نہیں۔ انہیں سخت گہرا صدمہ ہوا تھا جس سے وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھیں۔ ہمارے محلے والوں کو میری طلاق کا تو پتہ نہ چلا وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ امی نے ابو کی موت کا صدمہ لیا ہے۔

میں ابو کی لاش سے لپٹ لپٹ کر روئی ایک تو ابو کے ایک دم دنیا سے چلا جانا میرے لیے صدمہ عظیم تھا ہمارے گھر سے سائبان چھن گیا تھا دوسرا مجھے اپنی طلاق کا بہت قلق تھا اور تیسرا یہ کہ ابو میری صفائی نہ سن سکے مجھے بولنے کا موقع تک نہ دیا میری کوئی بات سنے بغیر وہ دنیا چھوڑ گئے تھے۔ اُن کی نظر میں میں مجرم تھی۔ ہاں میں مجرم تھی شادی شدہ ہونے کے باوجود ایک غیر مرد سے عشق کا اظہار کیا تھا اور یہی میرا سب سے بڑا جرم ابو کی موت اور میری طلاق کی وجہ بنا۔ میں ساری

رات روتی رہی اور اگلے دن صبح فجر کی نماز کے بعد ابو کی تدفین ہو گئی۔

میری امی کو بیک وقت دو صدمے ہوئے ایک تو میری طلاق کا صدمہ اور دوسرا ابو کا ہمیں چھوڑ جانا۔ وہ گم صم پڑی رہتیں اور خلاؤں کو گھورتی رہتیں انہیں کھانے پینے کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ میں زبردستی اُن کو کچھ نہ کچھ کھلاتی پلاتی رہتی اُن کو نہلاتی اُن کے کپڑے تبدیل کرتی میں دل و جان سے اُن کی خدمت کر رہی تھی ہر وقت اُن کی دلجوئی میں لگی رہتی مگر وہ بہتر نہ ہو سکیں۔ ابو کی وفات کے بعد ان کی قلیل پنشن میری امی کے نام ہو گئی۔ میں نے امی کو بہت سارے ڈاکٹروں کو دکھایا بہت دوائیاں دیں مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی' ایک دن میں نے ڈینٹل سرجن ڈاکٹر کو کال کی ابو کو موت کا اپنی طلاق اور امی کی بیماری کا بتایا تو وہ افسوس کرنے لگا۔ میں نے اُسے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب آپ مجھے اپنا لو مجھ سے شادی کر لو۔'' میری بات سن کر وہ بولا۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ میں تو پہلے سے ہی شادی شدہ ہوں میرے تین بچے ہیں میری بہت اچھی زندگی گزر رہی ہے تو میں بھلا تم سے کیسے شادی کر سکتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب تو وہ پیار اور عشق کیا تھا؟ آپ سے عشق کرنے کے جرم میں ہی مجھے طلاق ہوئی۔ میرے ابو کی وفات ہوئی میری امی بیمار ہوئیں اور اب آپ مجھ سے شادی کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔'' تو ڈاکٹر نے جواب دیا۔

''میں اپنی بیوی سے بہت خوش ہوں ہماری خوشحال زندگی ہے مجھے اپنی بیوی سے بہت پیار ہے تو میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔'' میں نے ڈاکٹر کی بہت منتیں کیں اللہ رسول کے واسطے دیے اور کہا۔

''میں نوکرانی بن کر آپ سب کی خدمت کروں گی آپ کے گھر کے کسی کونے میں پڑی رہوں گی تو خدا کے لیے مجھے مت ٹھکراؤ آپ تو مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔'' میری بات سن کر ڈاکٹر ہنسنے لگا اور کہنے لگا۔

''وہ پیار تو صرف ٹائم پاس تھا میں تمہیں اپنے بستر کی زینت بنانا چاہتا تھا جو تم نہیں بنیں۔ کان کھول کر میری بات سن لو مجھے تم سے کوئی عشق نہیں ہے اور نہ تھا اور خبردار اب آئندہ مجھے کال کی۔'' اتنا کہہ کر ڈاکٹر نے کال کاٹ دی۔ ڈاکٹر کا جواب سن کر میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔''

ڈاکٹر نے میری آس امید توڑ دی مجھے ٹھکرا دیا۔ یہ تیسرا بہت بڑا صدمہ تھا جو میری زندگی میں آیا۔ میں بکھر گئی تھی۔ دل چاہا کہ خودکشی کر لوں مگر امی کی حالت دیکھ کر میں رک گئی کیونکہ امی کو سنبھالنے والا میرے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ امی کو میری ضرورت تھی۔ اب میں نے اپنے آپ کو امی کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ دن رات انکی خدمت کرتی ہر طرح سے ان کا خیال رکھتی ساتھ ساتھ پانچ وقت کی نماز ادا کرتی۔ روزانہ قرآن پاک کی تلاوت کرتی اور رو رو کر اپنے رب سے گناہوں کی معافی مانگتی۔ ہاں میں نے ڈاکٹر سے اپنے عشق کا اظہار کیا تھا مگر میرے جسم کو میرے شوہر کے علاوہ کسی نے چھوا تک نہ تھا۔ ڈاکٹر نے مجھ سے ناجائز تعلقات استوار کرنے کی بہت کوشش کی مگر اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے میں اُس کے جھانسے میں نہ آئی اور میری عزت محفوظ رہی مگر میں اپنے خاوند اور ابو کی نظر میں فاحشہ تھی۔ جبکہ حقیقت صرف اللہ جانتا ہے۔ ڈاکٹر سے عشق کا

اظہار میری سب سے بڑی غلطی تھی میں بہک گئی تھی مجھے کیا پتہ تھا کہ ڈاکٹر کا عشق صرف ڈھکوسلہ اور ٹائم پاس تھا۔ وہ مجھ سے فلرٹ کر رہا تھا جبکہ میں اُس کے جھانسے میں آ گئی تھی۔

میں نے اپنے آپ کو گھر میں گم کر لیا میری نہ تو کوئی سہیلی تھی اور نہ ہی کوئی رشتے دار شادی سے پہلے بھی میں کہیں آتی جاتی نہ تھی اور اب بھی کہیں نہ جاتی۔ صرف اتنا تھا کہ ہر ماہ کی یکم تاریخ کو ابو کی پنشن مل جاتی تو میں مارکیٹ سے گھر کا تمام سودا سلف اور مہینے کا پورا راشن لے آتی۔ ساتھ ساتھ امی کا علاج بھی ہو رہا تھا مگر کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ اسی روٹین میں پورے چار سال گزر گئے۔ حالات جوں کے توں رہے۔ مجھے اللہ کی عبادت کرنے میں بہت سکون ملتا۔ میں مہینے میں چھ قرآن پاک ختم کر لیتی اور اُن کا ثواب اپنے ابو کی روح کو بخش دیتی ساتھ ہی اپنے گناہوں کی معافی ہر نماز کے بعد مانگتی۔ ایک دن امی بھی مجھے تنہا چھوڑ کر اس دنیا سے چلی گئیں۔ امی کی موت کے بعد میں بالکل بے آسرا یتیم و بسیر ہو گئی۔ امی کی وفات کے بعد ان کو ملنے والی پنشن بھی بند ہو گئی۔ اب میرا کوئی ذریعہ آمدنی نہ رہا۔ مکان کا کرایہ، بجلی کا بل اور پیٹ تین ٹائم کھانا مانگتا ہے یہ سارے اخراجات کیسے پورے ہوں گے میرے پاس پھوٹی کوڑی تک نہ تھی تو مجبوراً مجھے گھر سے نکلنا پڑا اور کافی تلاش بسیار کے بعد مجھے تین چار گھروں میں ماسی کا کام ملا۔ مگر ہر مہینے مجھے کام چھوڑنا پڑتا وجہ یہ تھی کہ میں بہت خوبصورت اور جوان تھی۔ ہر گھر کے مرد اور لڑکے مجھ پر گندی اور بری نظر رکھتے۔ ذو معنی جملے بولتے، پیسوں کی آفر کرتے نتیجتاً میں وہاں سے کام چھوڑ دیتی مجھے مرد ذات سے نفرت ہو گئی ہر مرد ہوس بھری نظروں سے مجھے دیکھتا۔ ہوتے ہوتے سب گھروں کے کام چھوٹ گئے کسی گھر سے مجھے عزت نہ ملی میں بہت روتی اور اپنے اللہ سے مدد کی درخواست کرتی۔

میری ایک جاننے والی عورت نے مجھے ایک ایڈریس دیا جو کہ ایک بہت بڑی کمپنی کا تھا یہ کمپنی بہت سی گھریلو روزمرہ کی چیزیں تیار کرتی تھی۔ میں اُس کمپنی کے ہیڈ آفس گئی اور جاب کی درخواست کی۔ انہوں نے میری تعلیم پوچھی تو میں نے ان کو بتا دی۔ وہ کہنے لگے۔

''مڈل پاس کی ہمارے ہاں کوئی جاب نہیں ہے۔ اب مجھے امی ابو کی باتیں یاد آنے لگیں وہ ٹھیک کہتے تھے کہ بیٹا پڑھائی کر لو کام آئے گی۔ آج مجھے ان کی کہی ہوئی باتیں بڑی شدت سے یاد آ رہی تھیں۔ میرے آنسو نکل آئے کمپنی کے سیلز منیجر نے مجھے تسلی دی۔

''بیٹا گھبراؤ مت......'' میں نے کہا۔

''انکل کیسے نہ گھبراؤں میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے مجھے جاب کی ضرورت ہے تو پلیز مجھے کوئی جاب دے دیں۔'' انہوں نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا۔

''ہاں ایک جاب ہے اور وہ یہ کہ کمپنی کی تیار شدہ مصنوعات کو گھر گھر جا کر سیل کرنا ہے۔ جتنی زیادہ سے زیادہ اشیاء کی سیل کرو گی اتنا ہی زیادہ کمیشن ملے گا۔'' چنانچہ میں نے وہ جاب آفر قبول کر لی۔ انہوں نے میرے تمام کوائف نوٹ کر لیے اور اگلے دن آنے کا کہا۔ چنانچہ اگلے دن میں کمپنی آفس میں گئی تو انہوں نے مجھے ایک ٹیم کے ساتھ ایک گاڑی جس میں تیار شدہ مصنوعات تھیں روانہ کر دیا۔ اُس روز ہم مختلف علاقوں میں گئے ہر گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا کسی نے چیزیں لیں

کسی نے نہ لیں الغرض شام تک ہم پھرتے رہے اور پھر جا کر سارا حساب کتاب کمپنی کے آفس میں کیا تو اُس روز کی پانچ سو روپیہ میری کمیشن بنی۔

اب میں روزانہ صبح سویرے گھر سے نکلتی اور شام کے سات بجے واپس گھر لوٹتی۔ ہفتے میں دو چھٹیاں ہوتی تھیں تو اس طرح پورے مہینے کے دس یا گیارہ ہزار روپے مجھے ملتے جن سے پانچ ہزار روپے مکان کا کرایہ ادا کرتی ہزار روپے بجلی کا بل ہزار روپیہ میرا آفس آنے جانے کا کرایہ خرچ ہو جاتا تو باقی کے تین ہزار روپے بچ جاتے جن سے میں مہینہ گزارتی اسی طرح کام کرتے مجھے پورا سال ہو گیا میں شام کو بہت تھک جاتی گھر آ کر کھانا بناتی اور نماز پڑھ کر سو جاتی' اسی طرح صبح اٹھ کر فجر کی نماز ادا کرتی اور قرآن پاک کی تلاوت کرتی پھر ناشتہ کر کے آفس چلی جاتی۔ یہ کام بہت مشکل تھا سارا دن مختلف علاقوں میں ہر گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتی گرمی ہو یا سردی بس روزانہ یہی کام تھا۔ میری کوئی لگی بندھی تنخواہ نہیں تھی صرف کمیشن ہی ملتا۔ اب تو سیل بہت کم ہوتی جا رہی تھی پورے مہینے کا حساب کتاب ہوا تو صرف سات ہزار روپے ملے۔ اُس روز بہت گرمی تھی گھر میں کھانے کو کچھ بھی نہ تھا۔ بس چند روپے تھے میرے پاس تو میں صبح بھوکی آفس پہنچی اور وہاں سے ٹیم کے ساتھ علاقہ گھومنے لگی۔ بھوک کی وجہ سے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے مجھے سخت پیاس لگ رہی تھی اور چکر آ رہے تھے ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو ایک پینتالیس سالہ مرد نے دروازہ کھولا۔ وہ مرد بہت مہذب اور شائستہ زبان میں مجھ سے بات کر رہا تھا میں اُسے اپنی کمپنی کی اشیا اور ان کی قیمت اُسے بتا رہی تھی کہ یکلخت مجھے زور کا چکر آیا اور میں فرش پر گرنے لگی تو اُس مرد نے آگے بڑھ کر مجھے سہارا دیا اور مجھے اپنے ساتھ گھر کے اندر لے گیا ایک کرسی پر بٹھایا اور فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل لے آیا۔

میں نے دو تین گلاس پانی پیا تو میری طبیعت کچھ بحال ہوئی مجھے بہت کمزوری ہو رہی تھی اور میں بہت نڈھال تھی اُس نے اندازہ لگا لیا کہ میں نے کچھ نہیں کھایا اور بھوکی ہوں۔ اس نے کمرے کا پنکھا چلایا اور خود باورچی خانے چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ آیا تو اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں کھانا رکھا تھا مجھ سے کہنے لگا۔

''پلیز آپ کھانا کھا لیں۔'' میں حیرانگی سے اُسے دیکھنے لگی تو وہ دوبارہ بولا۔

''پلیز آپ کھانا کھا لیں۔'' میں کھانا کھانے لگ گئی اور وہ چائے کا کپ بنا لایا۔ میں نے کھانا کھا کر چائے پی تو میری طبیعت ہشاش بشاش ہو گئی۔ میں نے اس سے کہا۔

''سر آپ کا بہت شکریہ آپ نے مجھے کھانا کھلایا بس آپ یہ کچھ چیزیں مجھ سے خرید لیں۔'' اُس نے کہا۔

''کوئی مسئلہ نہیں کچھ کیا میں آپ سے ساری چیزیں خرید لیتا ہوں۔ کتنے کی ہیں یہ سب؟'' میں نے حساب لگایا تو پورے تین ہزار کی چیزیں میرے پاس تھیں اُس نے فوراً اپنی پاکٹ سے تین ہزار روپے نکالے اور مجھے دے دیے۔ میں واپسی کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی اور جاتے جاتے اُس کا شکریہ ادا کیا تو وہ کہنے لگا۔

''آپ کا نام کیا ہے؟'' میں نے بتایا۔

''ثروت میرا نام ہے۔''

''ثروت صاحبہ کبھی کوئی مسئلہ پرابلم ہو تو آپ صبح گیارہ بجے سے پہلے مجھے گھر میں مل سکتی ہوں مجھے آپ کے کام آ کر بہت خوشی ہوگی۔''

میں نے دوبارہ اُس کا شکریہ ادا کیا اور اُس کے گھر سے نکل آئی۔ میں نے اُس کا مکان نمبر گلی محلہ اور علاقہ یاد کرلیا اور وہاں سے چل کر اپنی ٹیم کے پاس پہنچ گئی۔ اُس بندے نے مجھے اپنا نام احمد نواز بتایا۔ اگلا پورا ہفتہ میں علاقے علاقے گھومتی رہی مگر میری اتنی سیل نہ ہوئی۔ اُس روز چھٹی تھی تو صبح صبح میرے دروازے پر دستک ہوئی تو دیکھا محکمہ بجلی کے لائن مین کھڑے تھے اور مجھے بجلی کا بل دکھانے کو کہہ رہے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ دو ماہ سے میں نے بجلی کا بل ادا نہیں کیا تھا۔ وہ بجلی کا کنکشن کاٹنے لگے تو میں نے اُن سے درخواست کی کہ کل شام تک کا ٹائم دیں میں کل شام تک بل جمع کروادوں گی اصل میں کل مجھے تنخواہ ملنی ہے تو فوراً بل جمع کرادوں گی۔ وہ مان گئے اور کہنے لگے۔

''ٹھیک ہے کل شام کو وہ بل دیکھنے آئیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ اب میں نے جھوٹ بولا تھا کہ کل تنخواہ ملنی ہے حالانکہ مجھے تنخواہ تو ملتی نہیں تھی۔ میرے پاس صرف سو روپے تھے۔ اور بجلی کا دو ماہ کا بل بارہ سو روپے تھا کہاں سے آئیں گے بارہ سو روپے......؟ یہی سوچ مجھے کھائے جارہی تھی۔ ظہر کی نماز کا وقت ہوگیا میں نے وضو کیا اور جائے نماز پر کھڑی ہوگئی۔ اُس روز میرے آنسو نہیں رک رہے تھے میں نے پوری نماز روتے روتے ادا کی اور نماز کے بعد سجدے میں گر کر اللہ سے گڑگڑا کر اپنے گناہوں کی معافی مانگی۔ میں بہت روئی یہاں تک کہ مجھے ہچکیاں لگ گئیں۔ اللہ سے مدد مانگی۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے سکون مل گیا۔ میں واش روم میں جا کر نہائی اور دوپہر کا کھانا کھا کر سوگئی۔ عصر کے وقت میری آنکھ کھلی۔ خلاف توقع آج بہت طمانیت اور سکون محسوس کررہی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے میرے اللہ نے مجھے معاف کردیا ہے۔

میری روح کو لگا میل کچیل اتر گیا ہو جیسے میری روح پاک صاف ہوگئی ہو۔ میری روح کو لگے زخم ٹھیک ہوگئے ہوں۔ آج میں بہت پُرسکون تھی۔ اگلے دن صبح فجر کی نماز کے بعد میں نے تلاوت کلام پاک کی اور تلاوت کے بعد درود پاک کا ورد کیا اور اللہ سے دعا کی کہ وہ میری مدد فرمائے کیونکہ آج شام تک میں نے بجلی کا بل جمع کروانا تھا۔ میرے پاس صرف سو روپے تھے۔ ایک دم مجھے احمد نواز کا خیال آیا۔ اُس نے مجھے کہا تھا کہ کوئی مسئلہ پرابلم ہو تو مجھے بتانا۔ میں نے ناشتہ کیا اور گھر سے نکل پڑی۔ آج میں آفس جانے کی بجائے احمد نواز سے ملنے جارہی تھی اُس کا علاقہ گلی محلہ اور مکان کا نمبر مجھے یاد تھا تقریباً ایک گھنٹے کے بعد میں احمد نواز کے گھر کی ڈور بیل بجارہی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد احمد نواز نے دروازہ کھولا۔ میں نے سلام کیا تو اُس نے جواب دیا اور کہا۔

''آیئے ثروت صاحبہ پلیز......'' میں کمرے میں داخل ہوگئی اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ آج احمد نواز کے تینوں بچے بھی گھر تھے۔ ایک لڑکی بنش اور دو لڑکے حماد اور سجاد تھے۔ احمد نواز میرے لیے کولڈ ڈرنک لے آیا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے انہوں نے کہیں جانا ہو تو احمد نواز نے خود ہی بتایا کہ آج بچوں کی اسکول سے چھٹی ہے تو ہم پکنک منانے جارہے ہیں۔ میں نے بچوں کی ماں کا پوچھا تو احمد نواز نے بتایا۔

''اسے فوت ہوئے آٹھ مہینے ہوگئے ہیں۔''

''اوہ ہو......'' میں نے افسوس کیا تو وہ کہنے

لگے۔

''جی بس اللہ نے اتنا ہی ہمارا ساتھ لکھا تھا اس ایک دن وہ روڈ کراس کر رہی تھی تو ایک تیز رفتار گاڑی نے اُسے کچل دیا۔'' میں نے پوچھا۔

''آپ نے دوسری شادی نہیں کی؟'' تو وہ کہنے لگا۔

''ڈرتا ہوں کہیں سوتیلی ماں میرے بچوں پر ظلم وستم نہ کرے بس اسی خوف کی وجہ سے اب تک دوسری شادی نہیں کی۔'' میں نے کہا۔

''ضروری تو نہیں کہ ہر سوتیلی ماں ظالم ہو بہت اچھی عورتیں بھی ہیں تو آپ کوئی اچھی سی عورت دیکھ کر دوسری شادی کرلیں۔'' احمد نواز نے کہا۔

''جی ضرور سوچوں گا۔'' میں نے تینوں بچوں کو بہت پیار کیا اور وہ بہت سلجھے ہوئے بچے تھے۔ پھر میں نے واپسی کی اجازت مانگی تو احمد نواز کہنے لگا۔

''اُس روز تو آپ چیزیں بیچنے آئی تھیں مگر آج خالی ہاتھ ہیں؟'' میں نے کہا۔

''جی وہ بس ایک ضرورت آن پڑی تھی بجلی کا بل جمع کروانا تھا تو میرے پاس پیسے نہیں ہیں اگر آپ مجھے بارہ سو روپے ادھار دے دیں تو میں ایک ماہ میں آپ کو واپس لوٹا دوں گی۔'' احمد نواز نے کہا۔

''کوئی مسئلہ نہیں۔'' اُس نے اپنی پاکٹ سے دو ہزار روپے نکالے مجھے دیے ساتھ ہی کہنے لگا۔

''واپس لوٹانے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' میں نے کہا۔

''واپس ضرور لوٹاؤں گی یہ صرف اُدھار ہے' مجھے یہ ضرورت آپ کے دروازے پر لے آئی

غزل

مصلحت کا کوئی خدا ہے یہاں
کام وہ سب کے کر رہا ہے یہاں

لوگ محتاط ہیں رویوں میں
قربتوں میں بھی فاصلہ ہے یہاں

روشنی منتقل نہیں کی گئی
بس دیے سے دیا جلا ہے یہاں

عادتاً پوچھنے لگے ہیں لوگ
کیا کوئی حادثہ ہوا ہے یہاں

جس کی خوشبو ہوئی تھی رشکِ چمن
گل وہی شاخ سے گرا ہے یہاں

علم تو دفن ہو چکا کب کا
بس کتابوں کا سلسلہ ہے یہاں

اور ملتا بھی کیا فقیری سے
صرف اِک حوصلہ ملا ہے یہاں

شورِ دستک سے وا نہیں ہوا در
کوئی چپ چاپ بھی کھلا ہے یہاں

علی زبیر

ہے۔'' اتنا کہہ کر میں وہاں سے واپس آ گئی۔ آ کر بجلی کا بل جمع کروایا۔ آٹھ سو روپے میرے پاس بچ گئے۔ میں پورا مہینہ کمپنی کی اشیاء کی سیل کرتی رہی اور یکم تاریخ کو مجھے نو ہزار روپے کمیشن کی مد میں ملے۔ میں فوراً احمد نواز کے گھر گئی کہ اُسے دو ہزار روپے واپس لوٹا دوں۔ احمد نواز بہت پُرتپاک طریقے سے ملا اور عزت واحترام سے بٹھایا۔ میں نے اُسے دو ہزار روپے دینے کی کوشش کی مگر اُس نے لینے سے انکار کر دیا میں نے اُس کی بہت منتیں کیں۔

''پلیز آپ یہ پیسے واپس لے لیں۔'' تو اُس نے کہا کہ ایک شرط پر واپس لوں گا۔ میں نے کہا۔

''جی کونسی شرط؟'' تو وہ کہنے لگا۔

''شرط یہ ہے کہ آپ مجھے اپنے مکمل حالات بتائیں۔'' اُس کی یہ بات سن کر میں سوچ میں پڑ گئی اور تھوڑی دیر کے بعد میں نے اُسے اپنی ساری داستان شروع سے آخر تک سنا دی اور خاموش ہو گئی۔ احمد نواز میری داستان سننے کے بعد بولا۔

''جب آپ پہلی مرتبہ چیزیں بیچنے آئی تھیں تو میں نے اُسی وقت اندازہ لگا لیا تھا کہ آپ بہت مظلوم اور ضرورت مند ہیں۔ مجھے آپ سے اُسی وقت ہمدردی ہو گئی تھی اسی لیے آپ سے کہا تھا کہ کوئی مسئلہ پرابلم ہو تو آپ بلا جھجک مجھ سے کہہ سکتی ہیں۔ مجھے بے حد خوشی ہے کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا۔ اب میری ایک بات دھیان سے سنیں وہ یہ کہ زندگی بہت مشکل ہے یہاں قدم قدم پر آزمائشیں اور امتحان ہیں۔ آپ بہت عظیم خاتون ہیں جو اب تک اپنی عزت کو سنبھال کر بیٹھی ہیں مگر آخر کب تک؟ اکیلے زندگی گزارنا بہت مشکل ہے۔ ابھی تو آپ جوان ہیں مگر بڑھاپے میں سو طرح کی بیماریاں لگ جاتی ہیں کس طرح گزاریں گی۔؟'' میں نے کہا۔

''تو کیا کروں زندگی کا بوجھ تو اٹھانا ہی ہے ناں۔''

''تو آپ بتائیں میں کیا کروں؟'' احمد نواز فوراً بولا۔

''شادی کر لیں۔'' میں نے کہا۔

''کس کے ساتھ؟'' احمد نواز نے کہا۔

''میرے ساتھ شادی کر لیں اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو......'' میں حیرانگی کے ساتھ احمد نواز کو دیکھنے لگی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ قسمت اچانک مجھ پر مہربان ہو جائے گی۔ میں نے آمادگی کا اظہار کر دیا اور وہاں سے چلی آئی۔ آنے والے ایک ہفتے میں احمد نواز اپنی دو بہنوں اور تین بھائیوں کے ساتھ میرے گھر آیا۔ شادی کے تمام معاملات طے کیے اور مجھ سے نکاح کر لیا احمد نواز بہت ہی اچھا اور امیر انسان ہے اُن کا اپنا کاروبار ہے جو بہت اچھا چل رہا ہے۔ ان کے پاس اپنی گاڑی اور اپنا ذاتی مکان ہے۔ ہر طرف خوشحالی اور سکون ہے۔ سہاگ رات کو احمد نواز نے ایک اور انکشاف کیا وہ یہ کہ اُن کو پہلی نظر میں ہی مجھ سے محبت ہو گئی تھی اور انہوں نے اپنی دعاؤں میں صرف مجھے ہی مانگا۔ احمد نواز مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں مجھے بہت عزت دیتے ہیں ہر طرح سے میرا خیال رکھتے ہیں۔ میں احمد نواز کی رفاقت پا کر اپنے آپ کو دنیا کی خوش قسمت ترین عورت سمجھتی ہوں۔ اللہ نے مجھ پر بہت بڑا کرم فرمایا میری بہت خوشحال زندگی ہے اور ہاں اب تو میں امید سے ہوں اور احمد نواز کے بچے کے ماں بننے والی ہوں۔

☆☆......☆☆

کراچی سے ارسال کردہ دلدوز تحریر

ستارہ

عورت چاہے تو گھر کو جنت بنا سکتی ہے اور اگر ہٹ دھرمی پر اتر آئے تو نسلیں برباد ہو جاتی ہیں......

فوزیہ اختر

سرد ہوا کا جھونکا میرے چہرے کو چھو کر گزرا تو میں چونک گئی۔

"اُف کتنی سرد ہوا ہے۔" شام کے دھندلکے سائے چاروں جانب پھیل چکے تھے۔ پرندوں کی چہچہاہٹ مدھم پڑ چکی تھی کہ وہ اپنے گھروں کو لوٹنے کی تیاری کر رہے تھے۔

"او خدایا! کافی دیر ہو گئی ہے۔" میں نے گرم شال اپنے گرد لپیٹی اور کمرے سے باہر آ گئی۔

ابو تسبیح پڑھ رہے تھے۔ میں نے جلدی سے چائے کا پانی رکھا اور چائے بنانے لگی۔

"ابو چائے پی لیجیے۔"

"بیٹی آؤ تم بھی بیٹھ جاؤ چائے پی لو......"

"نہیں ابو مجھے کچھ کام ہے آپ چائے پئیں۔" ابو سے کہہ کر میں کچن میں آ گئی اور شام کے کھانے کی تیاری کرنے لگی۔

ہم چار بہن بھائی تھے۔ میں سب سے بڑی تھی مجھ سے چھوٹے تین بھائی تھے۔

ابو نہایت اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے پڑھے لکھے اور سنجیدہ آدمی تھے۔ اگر کوئی ایک بار اُن سے مل لیتا تو اُن کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔

میرے دادا ڈاکٹر تھے اور دادی پڑھی لکھی گھریلو خاتون تھیں۔

صوم صلوٰۃ کی پابند تھیں نہایت سلیقہ شعار اور دوسروں کی مدد کرنے والی اکثر خواتین اپنے مسائل کے حل کے لیے اُن سے مشورہ کیا کرتیں تھیں میرے دادا دادی نے 1947ء میں انڈیا سے ہجرت کی' دادی کی سات بہنیں تھیں۔

مگر پانچ انڈیا میں ہی رہ گئیں اور دو پاکستان آ گئیں۔

میرے ابو سے بڑے تین بھائی تھے اور ایک بہن تھیں۔ میرے ابو جب پاکستان آئے تو صرف میٹرک پاس تھے دادا نے ابو کو مشورہ دیا کہ وہ آگے تعلیم جاری رکھیں۔

ابو نے یہاں ایک کالج میں داخلہ لے لیا اور ساتھ ساتھ بچوں کو ٹیوشن پڑھانے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی محنت کا صلہ دیا اور امتحانات

ہوئے اور والد صاحب فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو گئے یوں تعلیمی سلسلہ جاری رہا۔

ابو کے ایک دوست احمد صاحب نے ذکر کیا کہ اُن کے پڑوس میں واجد صاحب رہتے ہیں۔ اُن کی بیٹی سعدیہ کو ٹیوشن کی ضرورت ہے وہ چاہتے ہیں کہ کوئی اچھا استاد مل جائے۔ میں نے تمہارا ذکر کیا تھا اگر تم چاہو تو ٹیوشن پڑھا دو۔''

والد صاحب راضی ہوئے اور یوں وہ واجد صاحب کے گھر ٹیوشن پڑھانے جانے لگے۔

واجد صاحب کی بیٹی سعدیہ پڑھنے لکھنے میں بالکل توجہ نہیں دیتی تھی۔

دوسرے مشاغل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی۔ اس طرح امتحان میں اکثر فیل ہو جاتی تھی۔ اُن کے والد ایک سنار تھے اور کافی جہاندیدہ آدمی تھے۔

جب انہوں نے دیکھا لڑکا پڑھا لکھا اور شریف ہے تو انہوں نے میرے دادا سے راہِ رسم بڑھانا شروع کر دے۔

اپنے گھر آنے کی دعوت دی اس طرح ایک دوسرے کے گھر آنا جانا ہو گیا۔ ایک دن موقع محل دیکھ کر اپنی بیٹی کی بات ڈال دی۔

دادا کو ایسے شیشے میں اتارا کہ وہ رشتہ کرنے پر آمادہ ہو گئے جبکہ میری دادی جان اس رشتے کے بالکل خلاف تھیں۔

اسی دوران ابو کے ایک دوست جو بینک میں ملازمت کرتے تھے ان کے توسط سے ابو کو بینک



میں جاب مل گئی۔
گھر میں سبھی بہت خوش تھے اُس زمانے میں رواج یہ تھا کہ لڑکے اور لڑکی کی شادی کم عمری میں کر دی جاتی تھی۔ ابو مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے۔
دادا جان نے ایک نہ سنی دادی نے بھی انہیں بہت سمجھایا۔ اس طرح سعدیہ بیگم بیاہ کر ہماری دادی کے گھر آ گئیں۔
بس یہیں سے میرے والد کی بدقسمتی کا آغاز ہو گیا۔
رفتہ رفتہ سعدیہ بیگم نے اپنے پر پرزے نکالنا شروع کر دیے وہ زیادہ تر باہر کے کھانے پسند کرتیں تھیں۔ گھر کے کسی کام سے اُن کو دلچسپی نہیں تھی۔ البتہ صبح اٹھتے ہی گانے سننا اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔
دادی نے جب اپنی بہو کے رنگ ڈھنگ دیکھے تو سمجھانے کی کوشش کی۔
''صبح فجر کے ٹائم اٹھ کر نماز ادا کیا کرو صبح اٹھ کر گانے سننا شریف عورتوں کو زیب نہیں دیتا گھر کے کاموں میں دلچسپی لو۔'' مگر سعدیہ بیگم اُن کی ایک نہ سنتیں۔
دونوں تایا نوکری کے سلسلے میں دوسرے شہروں میں مقیم تھے اور اُن کی بیویاں بھی اُن کے ساتھ تھیں۔
دادی کو گھر کے کام خود کرنا پڑتے وہ اس بڑھاپے میں کھانا پکاتی برتن دھوتی دادی خود بلڈ پریشر کی مریضہ بھی تھیں۔
مگر وہ چپ چاپ کام کرتی رہتیں اور حرف شکایت زبان پر نہ لاتیں بہو بیگم کو بھلا چین کہاں تھا' اُن ہی دنوں سعدیہ بیگم کی طبیعت خراب تھی۔ دائی کو بلایا گیا دائی نے خوشخبری سنا دی۔
دادی بہت خوش ہوئی اور پورے محلے میں مٹھائی تقسیم کی۔
سعدیہ بیگم جو پہلے ہی گھر کے کام کرنا پسند نہیں کرتی تھیں وہ اب ہل کر پانی بھی نہ پیتی تھیں۔ دادی کی صحت دن بدن گرتی جا رہی تھی اب وہ کھانا پکاتی تو بہت تھک جاتی تھیں۔ اللہ اللہ کر کے پیدائش کے دن قریب آئے اور میری پیدائش ہوئی۔
سب بہت خوش تھے میرے والد نے میرا نام ستارہ رکھا۔
میرے آ جانے سے میری دادی پر بوجھ بڑھ گیا۔ جب میں روتی تو دادی دودھ بنا کر دیتی میرا خیال رکھتیں رات کو ابو اٹھ اٹھ کر مجھے سنبھالتے' والدہ سر درد کا بہانہ کرتیں اور سوتی رہتیں۔
دیکھتے ہی دیکھتے میں پانچ برس کی ہو گئی۔ دادی نے مجھے کلمے یاد کروائے اور وہی مجھے باقاعدگی سے سپارہ بھی پڑھایا کرتیں۔
ایک رات دادی جان کی طبیعت اس قدر خراب ہوئی کہ انہیں اسپتال منتقل کرنا پڑا۔ دادی کو فالج کا اٹیک ہوا تھا اب تو میری امی پر سارا بوجھ آ گیا وہ بھلا گھر کس طرح سنبھال سکتی تھیں یہ تو صرف دادی ہی تھیں جن کی وجہ سے گھر کا نظام چل رہا تھا۔
میری والدہ نے طوفان کھڑا کر دیا وہ ہوٹل سے کھانا منگواتیں یا پھر جب ابو دفتر سے گھر آ جاتے تو وہ خود کھانا پکاتے میں سارا دن میلے کپڑے پہنے پھرتی مگر انہیں خیال نہ آتا کہ کپڑے بدل دوں۔
زیادہ تر اپنے حسن کا خیال رکھتیں اور آئینے کے سامنے کھڑی رہتیں۔

جب بھی ابو سمجھانے کی کوشش کرتے تو وہ اُن سے اُلجھ پڑتیں' کچھ ہفتوں بعد دادی جب اسپتال سے گھر واپس آئیں تو میری والدہ نے سوچا کہ ان کی خدمت کون کرے گا اس لیے وہ لڑ جھگڑ کے میکے جا بیٹھیں اور یہ شرط عائد کردی کہ میں اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔

ابو ان دنوں بہت پریشان تھے۔

صبح ڈیوٹی جاتے اور دوپہر میں آ کر کھانا پکاتے دادا بھی بوڑھے تھے۔ ابو ایک بار پھر امی سے ملنے گئے اس بار تو نانی نے بھی کہہ دیا کہ مکان الگ کرلو تو سعدیہ کو لے جانا۔''

ابو نے نہیں بہت سمجھانے کی کوشش کی بہت منت سماجت کی مگر وہ نہ مانیں۔

ابو نے دفتر سے کچھ دنوں کی چھٹیاں لے لیں اور سارا دن گھر کے کاموں میں جتے رہتے۔ ایک دن پڑوس سے خالہ صغراں آئیں انہوں نے بتایا کہ ایک بے سہارا خاتون ہیں جس کے شوہر کا نتقال ہو چکا ہے اور وہ کام کی تلاش میں ہیں۔

''اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔''

ابو پہلے ہی پریشان تھے ابو کے اصرار پر خالہ نے خاتون سے بات کی اور وہ راضی ہوگئیں وہ خاتون گھر آ کر کھانا پکا جاتیں اور دادی کی دیکھ بھال کرتیں۔

اس طرح میرے والد کو بھی سکھ کا سانس نصیب ہوا۔

''خالدہ آنٹی بہت شریف خاتون تھیں اور حالات کی ستائی ہوئی تھیں۔ وہ صبح سات بجے گھر آجاتیں' ناشتہ بناتی دادی دادا کو ناشتہ کرواتیں۔ دادی کا خوب خیال رکھیں دوپہر کا کھانا تیار کرتیں رات کا کھانا بناتیں مجھے نہلاتی گھر کی صفائی ستھرائی کرنے کے بعد واپس چلی جاتیں ابو انہیں معقول تنخواہ دیتے اور ہر مہینے ان کے گھر راشن بھی ڈلوا دیتے اس طرح اُن کا گزر بھی اچھا ہو جاتا تھا۔

ابو امی کی وجہ سے سخت پریشان رہتے تھے دو ماہ ہو چکے تھے والدہ آنے کا نام نہ لیتی تھیں۔ آخر ایک دن دادا نے ابو کو سمجھایا۔

''تم اپنا گھر خراب نہ کرو ہم تمہیں خوش دیکھنا چاہتے ہیں' تم اپنا مکان الگ کرلو۔''

یوں ایک دن مکان بھی الگ ہوگیا۔ ہم اُس وقت اپنے دادا دادی کو چھوڑ آئے جب انہیں ہماری اشد ضرورت تھی۔

علیحدہ ہونے کے بعد میری امی مزید آزاد ہوگئیں صبح دیر سے اٹھنا ہار سنگھار کرنا اور باقی وقت محلے کی عورتوں سے بیٹھ کر گپ شپ کرنا ان کے محبوب مشغلے تھے۔

وقت یونہی گزرتا رہا اب میں سات برس کی ہوگئی میرے والد چاہتے تھے میں پڑھائی کروں میں اسکول سے گھر آتی تو میری امی محلے کے کسی گھر میں موجود ہوتیں دروازے پر کنڈی لگی ہوتی۔

میں اندر آتی تو گھر منہ کو آ رہا ہوتا ہر چیز پھیلی ہوئی ملتی۔

سب سے پہلے میں گھر سمیٹتی جھاڑو لگاتی' میں جب دوسری بچیوں سے اپنا موازنہ کرتی تو میرا دل خون کے آنسو روتا میری سہیلیاں صاف ستھرے کپڑے پہنتیں' صاف ستھری رہتیں یہاں مجھے تمام کام خود کرنا پڑتے تھے میں وقت سے پہلے ہی سمجھدار ہوگئی تھی۔ ابو جب امی کو سمجھانے کی کوشش کرتے تو امی جو منہ میں آتا کہہ دیتیں ابو خاموش ہو جاتے۔

''میرے بعد اللہ نے مجھے ایک ننھا سا بھائی

دے دیا میں بہت خوش ہوئی کہ چلو مجھ سے باتیں کرنے والا تو کوئی آ گیا ہے۔" اب مجھ پر مزید بوجھ پڑ گیا۔

بھائی کو سنبھالنا اُسے فیڈر بنا کر دینا اور اس کے کپڑے دھونا' گھر کے کاموں کی وجہ سے میں بے حد تھک جاتی اور اسکول سے غیر حاضر رہتی۔

ایک دن میری دوست شبانہ جو محلے ہی میں رہتی تھی گھر آئی اس نے بتایا کہ میرا اسکول سے نام کٹ گیا ہے۔

جب اس نے یہ خبر سنائی تو میں بہت روئی میں نے امی سے ذکر کیا تو ماں نے مجھے ایک تھپڑ جڑتے ہوئے کہا۔

"لڑکیوں کو پڑھ لکھ کر بھی چولہا چوکھا ہی سنبھالنا ہے خبردار تم نے اپنے ابو کو بات بتائی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

اور یوں میرا پڑھنا لکھنا بھی چھوٹ گیا۔

دوسرے بھائی کی آمد ہوئی تو اُس وقت میری عمر تقریباً بارہ سال ہو چکی تھی میں سارا دن گھر کے کام کرتی اپنے چھوٹے بھائیوں کو سنبھالتی' کبھی شبانہ آ جاتی تو وہ مجھے اسکول کی باتیں بتاتی تو میرا دل کرتا کہ میں بھی اسکول جاؤں میرے والد مجھے بے حد پیار کرتے تھے اور میری اس حالت پر بہت کڑھتے تھے۔

انہوں نے امی کو بہت سمجھایا۔

"ستارہ کو پڑھنے دو۔ اس پر گھر کا اتنا بوجھ نہ ڈالو مگر امی کہتیں کہ پڑھ لکھ کر کیا کرے گی آخر گھر داری ہی تو کرنی ہے۔"

میرا بچپن کسی اور نے نہیں بلکہ میری سگی ماں نے چھین لیا تھا۔

جب میں پندرہ برس کی ہوئی تو گھر کے تمام کاموں میں ماہر ہو چکی تھی۔

میں سارا سارا دن گھر کا کام کرتی تین چھوٹے بھائیوں کو سنبھالتی اور رات کو اس قدر تھک جاتی کہ گھوڑے بیچ کر سو جاتی صبح فجر کی نماز کے وقت بیدار ہو جاتی۔

کبھی کبھی اپنے والد کے ساتھ دادی کے گھر جاتی تو دادی مجھ سے بہت پیار کرتی مجھے کسی کام کو ہاتھ لگانے نہ دیتیں۔

دادا اور دادی کی تنہائی کو دیکھتے ہوئے میرے بڑے تایا نے اپنا ٹرانسفر کراچی کروا لیا تھا۔

اب میری تائی دادی کے ساتھ رہتی تھیں وہ نیک اور سلجھی ہوئی خاتون تھیں۔ وہ دادی دادا کا بہت خیال رکھتیں تھیں اُن کے بچے بڑے بڑے اسکولوں میں زیرِ تعلیم تھے۔ اُن کی بڑی بیٹی تحریم میڈیکل میں پڑھتی تھی وہ مجھ سے بہت پیار کرتی تھی۔

میں یہاں آتی تو میرا دل چاہتا تھا کہ میں کبھی واپس گھر نہ جاؤں۔

یوں زندگی کے دن گزرتے رہے میں محرومی اور احساس کمتری کی چادر اوڑھ کے جوان ہو گئی۔ مجھ سے چھوٹا بھائی شکیل مشکل سے انٹر پاس کر سکا ابو نے اُسے الیکٹرونکس میں ڈپلومہ کروا دیا اور وہ سعودیہ چلا گیا اُس سے چھوٹے بھائی کو پڑھنے کا شوق تھا اُس نے ایم ایس سی کیا اور نوکری پر لگ گیا۔ سب سے چھوٹے بھائی کو پڑھنے لکھنے سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔

میرے بھائی بھی گھر کے اس ماحول سے بیزار رہتے تھے۔

میرے ددھیالی رشتے داروں کو گھر آنے کی اجازت نہ تھی۔ جبکہ میرے نانا' نانی اکثر گھر آتے رہتے تھے۔ میری امی ان کی بہت آؤ بھگت

کرتیں۔

جب میری عمر اٹھارہ برس ہوگئی تو میرے رشتے آنا شروع ہوگئے ہمارے پڑوس میں خالہ سکینہ رہتی تھیں ان کا بیٹا خالد انتہائی نیک سیرت اور پڑھا لکھا لڑکا تھا۔ خالہ مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں۔ ایک دن خالہ میری امی سے رشتے کی بات کرنے آگئیں۔

امی تو جیسے ہتھے سے ہی اکھڑ گئیں۔ خالہ کو خوب باتیں سنائیں اور کہا۔

''آپ کی ہمت کیسے ہوئی یہ بات کہنے کی آپ نے اپنی حیثیت دیکھی ہے آپ کا بیٹا ایک معمولی کلرک ہے۔'' خالہ ایک بیوہ تھیں نہایت شریف صوم وصلوٰۃ کی پابند اُن کے بیٹے کے سوا اس دنیا میں کوئی نہ تھا وہ ہمارے حالات سے اچھی طرح واقف تھیں۔

وہ امی کا جواب سن کر سخت مایوس ہوئیں جاتے وقت اُن کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ خالہ نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور چلی گئیں۔

میں خالہ کو حسرت سے جاتا دیکھتی رہی جب ابو کو اس بات کی خبر ہوئی تو وہ سخت خفا ہوئے اور کہا۔

''سعدیہ بیگم کچھ تو خدا کا خوف کرو خالد اچھا لڑکا ہے سب سے بڑی بات یہ کہ وہ نیک سیرت ہے۔ اب ہمیں ستارہ کی شادی کر دینی چاہیے مجھے یقین ہے کہ ستارہ خوش رہے گی۔'' ماں نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

''ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے ابھی تو بچی ہے۔'' یوں میرے رشتے کی بات ٹال دی گئی۔

زندگی کے دن یونہی روکھے پھیکے گزر رہے تھے میری ہم عمر لڑکیاں یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہی تھیں اور کچھ لڑکیاں شادی شدہ ہو چکی تھیں۔

میں ہی تھی جس کے ارمانوں کا بار بار خون ہوتا رہا۔

وقت تیزی سے گزرتا رہا میں پچیس برس کی ہوگئی میرا جو رشتہ آتا میری امی اس میں کوئی نہ کوئی نقص نکال دیتی تھیں۔

چھوٹا بھائی جو کسی آفس میں جاب کرتا تھا وہاں اُسے کوئی لڑکی پسند آگئی اور دونوں نے شادی کر لی ایک دن بھائی اپنی بیوی کو لے کر گھر آیا تو امی نے خوب شور مچایا۔

بھائی بھی ضدی تھا وہ اپنی بیوی کو لے کر الگ ہوگیا۔ میری بڑی تائی مجھ سے بے حد محبت کرتی تھیں۔ ایک دن انہوں نے ابو کو بلوایا اور کہا۔

''اب ستارہ کی شادی کر دو۔ میری نظر میں ایک لڑکا ہے جو کسی کمپنی میں ملازمت کرتا ہے۔''

میرے ابو میری شادی کرنا چاہتے تھے مگر ماں کے آگے کچھ نہ کر پاتے تھے۔

یوں ایک دن میری تائی نے مجھے گھر بلایا لڑکا اور اس کے گھر والے مجھے دیکھ کر چلے گئے۔

دوسرے دن تائی نے ابو کو بلایا اور خوشخبری سنائی ابو نے ضروری معلومات حاصل کی اور خاموشی سے میرا نکاح ہوگیا۔ جب امی کو علم ہوا تو انہوں نے بہت شور مچایا۔

مگر امی کچھ نہ کر سکیں کیونکہ تایا' تائی' دادا' دادی سب ایک طرف ہوگئے اور اُن کی ایک نہ چلنے دی دادی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ستارہ میرے پاس رہے گی اگر تم چاہو تو شادی میں شرکت کر لینا رخصتی تین مہینے بعد ہے باقی تمہاری مرضی ہے۔''

یوں میری شادی احسان سے ہوگئی احسان ایک شریف النفس انسان تھے اور پیار کرنے

والے شوہر گھر میں زیادہ افراد نہ تھے صرف میری
ساس ایک چھوٹا دیور اور ایک نند تھی۔ احسان کی
ماں ایک خداترس اور نیک دل خاتون تھیں انہیں
میری محرومیوں کا علم تھا۔ دادی نے ان سے کوئی
بات نہیں چھپائی تھی۔ میری ساس نے مجھے حوصلہ
دیا اور مجھے لکھنے پڑھنے کی جانب راغب کیا کیونکہ
وہ ایک ٹیچر تھیں اور اب ریٹائرمنٹ کی زندگی
گزار رہی تھیں۔

اس طرح میری ساس نے سب سے پہلے
کلام پاک پڑھایا کیونکہ میں قرآن پاک نہیں
پڑھ سکی تھی۔

ساتھ ساتھ انہوں نے مجھے آٹھویں کلاس کا
کورس پڑھانا شروع کیا۔ اس طرح انہوں نے
مجھے پڑھنا لکھنا سکھایا۔ پھر میں نے پرائیویٹ
میٹرک پاس کیا۔

اسی دوران اللہ نے میری گود ہری کر دی میں
نے اپنی بیٹی کا نام کرن رکھا میرا آنگن خوشیوں
سے بھر گیا۔ میں اپنی بیٹی کو بہت پیار کرتی تھی جس
طرح میں ماں کی ممتا کو ترسی ہوئی تھی میں نہیں
چاہتی تھی کہ میری بیٹی میری طرح زندگی
گزارے۔

وہ سب کی آنکھوں کا تارا تھی۔ مجھے ساس
کے روپ میں ماں مل گئی تھی۔

میں نے اپنی ساس کی خوب خدمت کی وہ
مجھے بہت دعائیں دیتی تھیں۔ اس طرح میں نے
فرسٹ ایئر کی تیاری کی اور پھر سیکنڈ ایئر اور اللہ
کے فضل سے میں کامیاب ہوگئی میری ساس نے
محلے میں مٹھائی تقسیم کی میرے شوہر احسان بھی
بہت خوش تھے۔

انہوں نے مجھے بی اے میں داخلہ دلوادیا اور
میں نے محنت اور لگن سے پڑھنا شروع کر دیا۔
کیونکہ مجھے پڑھنے کا شوق تو بچپن سے ہی تھا۔ پھر
میں نے بی اے کا امتحان بھی اچھے نمبروں سے
پاس کر لیا۔

میں بہت خوش تھی اب میرا ارادہ بی ایڈ کرنے
کا تھا۔ میں بہت خوش تھی۔ مگر مجھے خوشی بہت کم ہی
راس آتی تھی۔ ایک دن احسان آفس سے لوٹ
رہے تھے کہ ایک تیز رفتار کار نے انہیں ٹکر
مار دی۔

وہ موقع پر ہی ہلاک ہوگئے۔ فون پر خبر سن کر
مجھ پر سکتہ طاری ہوگیا میری زندگی میں خوشیوں
کے دن اتنے مختصر کیوں تھے۔

یوں ایک دن میں عدت پوری کر کے دوبارہ
اسی گھر میں واپس آ گئی۔ میری ماں کے رنگ
ڈھنگ وہی تھے وہ اس عمر میں بھی نہ بدلی تھیں۔

میرا سب سے چھوٹا بھائی بری صحبت میں
پڑ گیا اور نشے کا عادی ہو گیا۔ میرا دل گھر کے
حالات دیکھ کر خون کے آنسو روتا تھا والد صاحب
بھی گھر کے حالات سے دلبرداشتہ نظر آتے تھے۔

پھر ایک رات والدہ پر فالج کا اٹیک ہوا و
چارپائی سے لگ گئیں۔ ابو نے اُن کا بہت علاج
کروایا مگر افاقہ نہ ہوا۔

اب انہیں اپنی زیادتیوں کا احساس ہوا و
روتی رہتی تھیں۔

میں انہیں سمجھاتی وہ جیسی بھی تھیں میری والد
تھیں میں نے اپنی ماں کی بہت خدمت کی۔ مگر و
پھر بستر سے نہ اٹھ سکیں۔

ہر وقت روتی اور معافی مانگتی، وہ بہت شرمند
تھیں میں انہیں حوصلہ دیتی اور اُن کی دل جوئ
کرتی۔

ایک رات وہ اس دار فانی سے کوچ کر گئیں
والدہ کی وفات کے بعد والد صاحب بھی چپ

چپ رہتے وہ مسجد جاتے اور گھر آ کر اپنے کمرے میں بند ہو جاتے اور کسی سے ملتے جلتے نہ تھے۔

والدہ کی وفات پر سعودیہ عرب سے چھوٹا بھائی بھی واپس آ گیا اور دوبارہ نہیں گیا۔ بھائی سعودیہ جا کر بیمار ہو گئے تھے۔

اب بھائی بے روزگار تھے ابو کی پنشن پر گزارہ ہوتا تھا۔

بھائی جو پیسہ سعودیہ سے کما کر لائے تھے وہ گھر میں خرچ ہو رہا تھا۔ میں نے بھائی کو مشورہ دیا بیٹھک والا کمرہ جس کا دروازہ گلی میں کھلتا تھا وہاں ایک دکان کھول لی جائے اس طرح ہمارا گزر بسر ہو جائے گا۔

بھائی نے دکان کھول لی اور چھوٹی موٹی چیزیں لا کر رکھ لیں۔ میں نے بھی بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کر دیا۔ اس طرح کئی بچے میرے سینٹر میں پڑھنے لگے۔ میں اکثر اپنی ساس سے ملنے جاتی ہوں اور کرن کو اُس کی دادی سے ملوا لاتی ہوں جس طرح مجھے اپنی دادی سے محبت تھی اس طرح کرن کو بھی اپنی دادی سے بے حد پیار ہے، بہت لگاؤ ہے۔

کچھ عرصے بعد میرے والد کا بھی انتقال ہو گیا بڑے بھائی نے بیماری کے باعث شادی نہیں کی وہ کرن کو ہی اپنی بیٹی سمجھتے ہیں اور کرن کو بہت پیار کرتے ہیں۔

آج ہم دونوں بہن بھائی اس گھر میں اکیلے رہتے ہیں۔

آج میں سوچتی ہوں ماں وہ بھی تھی جس نے مجھے جنم دیا اور ماں وہ بھی تھی۔ جس نے مجھے علم کی روشنی دی مجھے پڑھایا لکھایا میری تربیت کی۔

مائیں تو دونوں تھیں مگر دونوں کی سوچوں میں اور دونوں کی تربیت میں کتنا فرق تھا۔ میری ماں نے اپنی کم عقلی اور جہالت کی وجہ سے گھر کو گھر نہ سمجھا۔

گھر کا شیرازہ بکھر گیا وہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم نہ دلوا سکیں اور نہ تربیت کر سکیں جبکہ ان کے پاس وسائل بھی تھے۔ ہمیشہ انہوں نے اپنے سسرال والوں کو اپنے بچوں سے دور رکھا اور میکے کو ترجیح دی۔ یہاں ایک کمزور پہلو میرے والد کا بھی ہے، جنہوں نے اپنی بیوی کے ہر حکم کی تعمیل کی اور بیوی کے آگے کبھی زبان نہ کھولی اور اپنی ماں کے گھر کو چھوڑا۔

میری کہانی یقیناً کوئی خاص نہیں ہے۔ لیکن میں یہاں اُن ماؤں سے کہنا چاہوں گی کہ اپنی اولاد کی اعلیٰ تربیت کریں۔ اپنی بیٹیوں کو تعلیم کے زیور سے آشنا کریں انہیں دوسرے گھر میں بھی جانا ہوتا ہے۔

میری قسمت اچھی تھی مجھے اچھا سسرال ملا اگرچہ تھوڑے عرصے ہی اُن کا ساتھ رہا آج اگر میں کچھ پڑھی لکھی نہ ہوتی تو میرا کیا بنتا' آج میں در در کی ٹھوکریں کھا رہی ہوتی۔

آج زندگی جیسے بھی گزر رہی ہے لیکن میں عزت سے اپنے گھر بیٹھی ہوں۔ میری ساس چاہتی ہیں کہ میں شادی کر لوں اپنا گھر بسا لوں مگر میں نے انہیں منع کر دیا ہے اور اپنی زندگی کو اپنی بیٹی کرن کے لیے وقف کر دیا ہے۔

میں نام کی ستارہ تھی مگر میرا ستارہ کبھی آسمان پر نہ چمکا۔

مگر...... میری بیٹی کرن ہے اور وہ ڈاکٹر بن کر اپنے نام کی طرح ضرور روشنی پھیلائے گی۔ مجھے اس دن کا شدت سے انتظار ہے۔

☆☆......☆☆

قبولہ شریف سے ارسال کردہ تحریر

خواب زادی

وہ تھی ہی ایسی بس خوابوں کی دنیا میں رہنے
والی الہڑ مٹیارن اور پھر اُس کی آنکھ کھل گئی......

فیصل مشتاق

دنیا میں ہر انسان خواب دیکھتا ہے اور ان خوابوں کو حقیقت میں ڈھالنے کی جستجو بھی کرتا ہے۔ انسان کے کچھ خواب خواہشوں کا روپ بھی دھار لیتے ہیں اُن کی تکمیل میں دشواری آجاتی ہے۔ خوابوں کو پورا کرنے میں اپنی نیت' محنت' لگن اور سچائی کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔

لگن سچی ہو تو خواب ضرور حقیقت کے آئینے میں اتر آتے ہیں۔

ہر سو ٹھنڈی ہوا کا راج تھا۔ پرندے ذکرِ الٰہی کرکے اپنے اپنے رزق کی تلاش میں پر تول رہے تھے۔ سورج کی کرنیں چھن چھن کر پورے گھر میں داخل ہو رہی تھیں۔ گھر کے پیچھے لہلہاتی سرسبز فصلیں اپنی خوبصورتی کا ثبوت دے رہی تھیں۔ کھڑکی سے چھن کر اندر آتی سورج کی کرنیں اس کے چہرے پر آن پڑیں تو وہ جھنجلاتے ہوئے کروٹ بدل گئی۔ گرمی کی وجہ سے لوڈشیڈنگ بہت زیادہ ہوتی ہے۔ جب پنکھا بند ہوتا تو فوزیہ کا سکون تو جیسے ہمیشہ کے لیے برباد ہو جاتا۔

''اُف اللہ...... یہ بجلی...... خدا غرق کرے ان بجلی والوں کو...... میرے رنگ برنگے خوابوں کو اندھیرا کر دیا۔ ہائے کتنا خوبصورت خواب تھا۔'' وہ دونوں ہاتھوں کو منہ پر رکھے کسی غیر مرئی نقطہ پر نظریں جمائے سوچوں کی دنیا میں مگن تھی۔ دروازہ زور سے پٹخا تو ایک بار پھر جیسے اس خواب زادی کو کسی نے حقیقت میں لا کھڑا کیا ہو اور وہ کوئی اور نہیں اس کی پیاری اماں تھیں۔

''ماہ رانی صاحبہ! اٹھ گئی یا ابھی بھی لمبی نیند کے ساتھ کچھ خواب دیکھنا باقی ہیں۔'' اماں نے ہاتھ بلند کر کے اونچی آواز میں کہا۔ اُس کی آواز میں نیند تھی۔

''اُف...... اماں کتنی بار کہا ہے مجھے طعنے نہ دیا کریں میرے خواب تو میری جان ہیں۔'' وہ کہتے ہوئے مسکرانے لگی۔

''اب...... اٹھ جا...... دیکھ سورج کیسے سر پر

آن کھڑا ہوا ہے شکر ہے تیری آنکھ کھل گئی ورنہ میں ابھی پانی لانے والی تھی۔"
وہ مسکرائی اور اماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔
"ہائے...... میری ماں کتنی اچھی ہے۔" اس نے زور سے ماں کو گلے لگایا تو اماں مسکرانے لگیں۔
"بس کر ماہ رانی...... تیری ہی ماں ہوں تجھے جانتی ہوں مکھن لگاتی ہے۔"
"ارے نہیں اماں......" وہ ہنسی۔
"اب بس کر جا نہا لے گرمی جان کھا رہی ہے۔"
وہ تیزی سے واش روم میں گھس گئی۔ مٹی کی اینٹوں سے بنا گھر تھا آدھے گھر پر تو مرغیوں اور بکریوں کا قبضہ تھا اور کچھ حصے پر فوزیہ اور اس کے اماں ابا......
نلکے سے پانی کا ٹب بھرنے کے بعد وہ نہائی۔
"ہائے کب تک یوں نلکوں کے پانیوں سے نہاتی رہوں گی، کم بخت ماری قسمت میری......"
چولہے کی طرف بڑھی تو دیسی گھی سے بھری دو روٹیاں اور دیسی فرائی انڈہ چھابے پر براجمان تھا۔
"ہائے...... یہ روز روز کے گھی بھرے پراٹھے...... کروں بھی تو کیا ابا کے پاس کون سا اتنے پیسے ہیں جو مجھے سلائس کھلائیں۔" اس نے



کئی مرتبہ رسالوں کے صفحات پر ڈبل روٹی اور جام کے کمرشلز دیکھے تھے۔ جی للچاتا تھا وہ بھی ایسے ڈائننگ ٹیبل پر کسی شہزادی کی طرح بجی دھجی آئے اور پھر نوکر چاکر اس کے لیے لذیز ناشتہ اور جوس تیار کریں۔

''اب کیا روٹی کو گھورتی رہے گی کیا معائنہ کررہی ہے اس کا؟'' اماں دونوں ہاتھوں میں کپڑوں کی پنڈ (گٹھڑی) لاتے ہوئے نلکے کی طرف آرہی تھی۔

''اچھا اماں کھا رہی ہوں تجھے تو معلوم ہے میں کتنی سادہ ہوں شکر کرتی ہوں جو ملے کھا لیتی ہوں۔'' وہ شریر انداز میں ہنسی۔

چائے کی چسکیوں سے پیتی روٹی کھاتی وہ اپنا پیٹ بھر چکی تھی۔

لذیذ ناشتہ کر کے وہ چپکے سے اماں سے نظریں بچاتی ڈائجسٹ کو اٹھائے سیڑھیوں پر تیزی سے چڑھنے لگی۔

ابھی کچھ ہی سیڑھیاں چڑھی جب کانوں میں اماں کی گرج دار آواز آن پڑی۔

''واہ واہ...... ماہ رانی یہ کپڑے کیا باہر سے آ کر کوئی لونڈی دھوئے گی چوری چپکے کاموں سے جان چھڑا کر چھت پر بھاگ رہی ہے نیچے آ...... صبح سے صفائی' ناشتہ اب کپڑے میری تو کمر ٹوٹ رہی ہے۔''

مٹی کی سیڑھیوں پر ہولے ہولے قدموں سے واپس آئی اور ہاتھ باندھے اماں کے سامنے پتلا بن کر کھڑی ہوگئی۔

''اماں جی...... کتنی بار کہا ہے واشنگ مشین لے لو کپڑے بھی دھلے کمر درد بھی گیا۔'' وہ ایسے انداز میں بولی جیسے کسی واشنگ مشین کی مشہوری کررہی ہو۔

''ارے واہ...... ماشاءاللہ آ تیرا ماتھا چوموں رے کتنی سمجھدار میری لڑکی......'' اماں کچھ سیکنڈ کے لیے مسکرائی اور پھر یکدم مسکراہٹ غصے میں بدل گئی۔

''تیرا ابا تو جیسے بڑا زمیندار ہے کروڑوں کا مالک ہے تجھے ساری چیزیں لاکر دے جن تمام چیزوں کے خواب تم دیکھتی ہو وہ تمہاری جھولی میں آ کر ڈال دے۔'' اماں کی آواز میں یکدم نمی آ گئی۔

''میری فوزیہ......خواب دیکھنا بہت آسان ہوتا ہے خواب دیکھنا یوں ہے جیسے چاند تاروں کی روشنیوں کو چمکتا دمکتا دور سے آنکھوں سے دیکھنا اور حقیقت یوں ہے انہی چاند تاروں کو توڑ کر ہمیشہ کے لیے اپنا پاس رکھ لینا۔'' تاروں کی چمکتی روشنیوں کو دیکھنا آسان ہے مگر ان تک رسائی بہت مشکل ہے۔

اماں کی باتیں سچ ہی تو تھیں۔ اماں کی یہ باتیں کبھی بری لگتی تو کبھی غصہ آ جاتا تو وہ فوراً چپ چاپ کمرے میں چلی جاتی۔

رسالے کے صفحات پر خوبصورت فرنیچر کے ڈیزائن تھے۔ اس کی خواہش تھی کاش اس کے گھر میں بھی خوبصورت فرنیچر ہو وہ سب کچھ پہلے دیکھ چکی تھی مگر کہاں...... ہاں بچپن میں وہ یاد کرتی۔ اس خواب زادی کے پاس خوابوں کو پورا کرنے والا شہزادہ شہرام تھا۔

جب بھی وہ ذہن میں آتا تو اس کا دل بے قرار ہو جاتا۔ شہرام تو اس کے بچپن کا پیار تھا۔ اس کا چچا زاد کزن ہونے کے ساتھ اس کے دل کا شہزادہ بھی تھا۔

ان کے گھر میں ہی رہ کر تو 7 جماعتیں پاس کی تھیں جب بھی چچا جان کے گھر جاتی تو شہرام

پڑھائی میں مدد کرتا آٹھویں کے پرچوں کے بعد ابا نے اسے واپس بلوالیا اب وہ بڑی ہو چکی تھی۔
وہ واپس گھر آ کر ہر شے پر نوحہ کناں ہوتی۔
اسے وہاں کا ریفریجریٹر' اے سی کی ٹھنڈی ہوا اور سکون نہ بھولتا' اسے تو گھر کی ہر شے سے نفرت ہو چکی تھی اسے تو آج بھی وہ دن یاد تھا جب شہرام نے اپنے باغیچے سے لال گلاب اس کے مخملی ہاتھوں میں تھمایا تھا جب وہ واپس گاؤں آئی تو شہرام کا ایک پھول ہی اس کی یاد تھا۔
جس کو اس نے بہت سنبھال کر رکھا تھا۔ اسے وہ دن ہمیشہ یاد رہتے جب شہرام وہ اور گڑیا اکٹھے کھیلتے چچی اسے عجیب نظروں سے گھورتی مگر معصوم ہر تلخ رویہ برداشت کر جاتی۔ شہرام ہمیشہ فائزہ کا دماغ کھاتا اسے تنگ کرتا انہی حسین لمحوں کو سوچتے وہ مسکرانے لگی دیوار سے ٹیک لگائے آنکھوں کو بند کیے وہ سنہری خوابوں کی رنگین دنیا میں کھو جاتی۔
''فائزہ...... کتنے سال ہو گئے تم مجھ سے دور ہو میرے پاس آؤ۔'' وہ فلمی ہیروئن کی طرح ساڑھی میں کھلے بالوں کے ساتھ منہ بنا کے ایک جانب کھڑی تھی اور وہ گھٹنوں کے بل بیٹھا اس سے معافی طلب کر رہا تھا۔
''معاف کر دو نا...... اب دور نہیں جاؤں گا۔'' پھر اچانک وہ دور جانے لگا تو ساڑھی کو لہراتی وہ بھاگ کر شہرام سے لپٹ کر اُس کی خوشبوؤں میں سما گئی۔
''چندا...... ناراض مت ہوا کرو۔'' بلیک پینٹ کوٹ کے ساتھ ریڈ ٹائی وہ شہزادے سے کم نہ لگ رہا تھا۔
پھر وہ دور جاتا دکھائی دیا۔
''رکو شہرام تم کہاں جا رہے ہو تم کب واپس آؤ گے۔'' وہ بھاگتی ہوئی آئی ہر طرف رنگ برنگے لال سرخ پیلے پھول کھلے تھے۔ ہری بھری گھاس تھی۔
ہلکی بارش کا سا سماں تھا ہر طرف سبزہ چھا گیا اور ان تمام مناظر سے انجان وہ شہرام کی بانہوں میں تھی۔ سر سبز گھاس میں مور ناچ رہے تھے طوطے اڑ رہے تھے۔ وہ پھولوں سے سجے جھولے پر بیٹھی شہرام سے باتیں کر رہی تھی۔
کتنا دلکش منظر تھا پھر اچانک سے بارش ہونے لگی اس کے ملائم چہرے پر پانی کے قطرے پڑنے لگے اگر وہ آنکھیں نہ کھولتی تو شاید خواب ادھورے رہ جاتے۔
''ارے واہ ماہ رانی یہ آنکھیں بند کر کے کون سے باغ میں پھول توڑ رہی تھیں۔''
اماں کی کرخت آواز اسے بہت بری لگی۔ تار پر پڑنے والے گیلے کپڑوں سے نکلتے پانی نے اس کا چہرہ بھر دیا تھا یہ وہی پانی تھا جو کچھ دیر پہلے بارش کے میٹھے میٹھے قطرے بن کر اس کی آنکھوں اور چہرے کو بھگو رہا تھا۔
''اُف...... اماں پھر سے جگا دیا......'' وہ نخوت سے بولی۔
''یہ پکڑ چار سوٹ ڈال دیے ہیں۔ باقی کے تار پر ڈال کر نیچے آ جانا...... ہانڈی کے لیے سبزی بنانی ہے جلدی آ جانا نیچے۔''
''کوئی کام نہیں سوائے آرام فرمانے کے' کھانے' ڈائجسٹ اور ہاں سب سے بڑھ کر ماہ رانی کو خواب دیکھنے کے۔'' اماں سب سنا کر سیڑھیاں اتر چکی تھیں۔
وہ غصے سے اٹھ کھڑی ہوئی' دھلے کپڑوں کو زور سے نچوڑ کر ان میں پانی رہنے کی کوئی کسر نہ چھوڑی پھر زور سے تار پر ڈال دیے۔

پوری رات وہ شہرام کے بارے میں سوچتی رہی میرے خوابوں کا شہزادہ اور میں اس کی شہزادی ویسے بھی ماہ رانیوں اور شہزادیوں سے کم تھوڑی نا ہوں اماں بھی تو مجھے ماہ رانی شہزادی ہی کہتی ہیں وہ شرارتی ہنسی ہنستے کروٹ بدل گئی۔

وہ شہزادی ہوتی بھی کیسے نہ اللہ نے اسے بے حد حسن سے نوازا تھا۔ دودھیا رنگت بلی جیسی آنکھیں لمبا قد ناگن کی طرح بل کھاتے لمبے سیاہ بال الغرض قدرت نے خوب تراشا تھا۔ اس لیے گاؤں سے کتنے رشتے آچکے تھے جن کو وہ ٹھکرا چکی تھی۔

ویسے بھی اسے اس گاؤں میں شادی کرنی ہوتی تو کب کا اکرم سے نکاح کر لیتی۔

اکرم اماں کے دور کے رشتہ داروں میں سے تھا۔ گاؤں میں سبزی کی ریڑھی لگاتا کبھی کبھار گھر میں گوشت بھی پک جاتا اس لالچ میں وہ فوزیہ سے کہتا۔

"عیش کراؤں گا تجھے کھانے کی اور پیار دونوں کی کمی نہیں ہونے دوں گا۔"

"چل دفعہ ہو اپنا راستہ ناپ۔" فوزیہ کو اس کی چھچھوری حرکتوں سے سخت نفرت تھی۔

کبھی کبھی ان حسین خوابوں میں وہ تلخ ڈراؤنا خواب اسے تنگ کرنے لگتا تو وہ بے حد پریشان ہو جاتی اسے وہ کبھی بھلا نہیں سکتی تھی۔

اس کی معصوم آنکھوں نے وہ تلخ لمحات دیکھے تھے۔

آدھے خواب تو وہیں ریزہ ریزہ ہو جاتے۔

دادا جان گاؤں کے بڑے زمیندار تھے۔ دو ہی بیٹے تھے۔ دونوں بھائیوں میں بے حد پیار تھا۔ ابا چھوٹے بھائی کو بہت چاہتے تھے۔

اس کی ہر خوشی کو پورا کرتے پھر دادا جان کے فوت ہونے کے بعد تو مزید چھوٹے بھائی کا خیال رکھنے لگے۔

ابا نے کتنی بڑی قربانی دی تھی جب چچا نے ان سے کہا وہ شہر کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں مگر وہ گاؤں میں رہنا پسند نہ کرے گی۔

ابا نے بھائی کی خوشیوں کو افضل سمجھا اور اپنی جائیداد بھی بھائی کے نام کر دی چچا نے شہر میں کتنا بڑا گھر بنایا تھا۔ ہر شے موجود تھی۔ امیروں کی سی زندگی بسر کر رہے تھے۔

پھر فوزیہ کو وہ دن یاد تھے جب وہ چچا کے گھر جاتی خوب کھیلتی اور کتنے دن وہاں رہ کر آتی ابا بھائی کی ترقی کو دیکھ کر خوش ہوتے۔ انہوں نے اپنا کاروبار شروع کر لیا تھا۔ پھر ابا شہرام اور بہرام کو بھی کتنا پیار کرتے تھے۔

ابا آرائش و زیبائش کے شوقین نہ تھے سادگی بے انتہا پسند تھی۔

اسی لیے خود گاؤں میں رہے اور بھائی پر محبت قربان کر کے سب انہیں دے دیا۔ صرف ایک ہی چیز تھی جو انہوں نے بھائی کے سپرد کی تھی یا شاید ہمیشہ کے لیے دے دی تھی۔

"فوزیہ...... ہاں...... فوزیہ میری بچی آج سے تمہاری ہے شہرام کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔"

"بھائی مجھ پر یقین رکھیں ایسا ہی ہوگا......"

چچا جان نے بڑے بھائی کو یقین دلوایا۔ چچا جان نے کتنے وعدے کیے تھے۔ پھر کیوں وہ دن آیا جس دن چچا نے اپنے بڑے بھائی کا لحاظ تک نہ کیا تھا۔

"کاش......!"

چچی جان آفت بن کر نہ آتی کاش ان کو اتنا لالچ نہ ہوتا لالچ نے انہیں اندھا کر دیا تھا۔ وہ کسی

کو اپنے گھر میں دیکھ کر راضی نہ تھیں۔ چچا جان کی جائیداد پر وہ مرمٹی تھیں۔
پھر انہوں نے چچا جان کو دھمکی دی تھی اگر وہ اپنے بھائی کو نہیں چھوڑیں گے وہ بچوں کو لے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلی جائیں گی۔ انہوں نے ابا کے خلاف کتنی سازشیں کی تھیں۔ دھیرے دھیرے ان کی لالچ کی آگ بڑھتی گئی اور بالآخر چچا جان ابا سے تلخ ہونے لگے ان سے بات نہ کرتے انہیں لگتا شاید بھائی جان بھی اس آرام دہ گھر میں رہنے کے عادی ہو گئے ہیں اور ہمیشہ کے لیے یہاں قبضہ جمالیں گے۔
رفتہ رفتہ ابا اور چچا کے درمیان دوریوں نے جنم لے لیا۔ دونوں بھائیوں میں بے انتہا محبت تھی مگر چچی نے ایسا بدظن کیا چچا نے ابا کو تلخ رویہ دکھا کر رخصت ہونے کا کہا۔
محبت نفرت میں بدل گئی۔ ابا کو چھوٹے بھائی پر کتنا یقین تھا جو انہوں نے پل بھر میں توڑ دیا تھا۔ ابا کو یہ سب ناگوار گزرا اور وہ ہمیشہ کے لیے واپس گاؤں آ گئے پھر فوزیہ کبھی شہر کی رونقیں نہ دیکھ سکی۔
مگر شاید کچھ ادھورے خواب آنکھوں میں ہی رہ گئے تھے۔ آنسو پلکوں کا حصار توڑ کر آنکھوں سے نکلتے ہوئے تکیے میں سما گئے دھیرے دھیرے یہ سب سوچتے ہوئے وہ نیند کی وادی میں کھو گئی۔
''شہرام......'' وہ بھاگتی ہوئی شہرام کو گلیوں بازاروں میں ڈھونڈتی کبھی سنڈریلا جیسی فراک پہنے خوبصورت پہاڑوں اور وادیوں کے بیچوں بیچ کھڑی ہوتی۔
شہرام کو زور زور سے آوازیں دیتی آوازیں چاروں طرف سے ٹکرا کر واپس آ جاتیں پھر وہ افسردہ ہو کر دریا کنارے بیٹھ جاتی۔
خوابوں کی دنیا بہت رنگین تھی مگر اس میں حقیقت کا رنگ بھرنے والا ایک ہی تھا۔
''اُس کا شہرام......''
''میں جانتا ہوں کیا صحیح ہے کیا غلط ہے میرا فیصلہ اٹل ہے تمہیں کیا لگتا ہے میں اپنی جان سے زیادہ عزیز بیٹی سے پیار نہیں کرتا میں نہیں چاہا اس کی آنکھوں میں ہمیشہ خواب ہی بسے رہیں...... بس تو اکرم کی اماں سے کہہ دے وہ رشتہ لے کر آ سکتی ہے۔''
ابا کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔
''تمہیں معلوم ہے وہ خوابوں کی شہزادی ہے۔ اس کے خوابوں کو نہ توڑو وہ بکھر کر کرچی کرچی ہو جائے گی اس کے خواب کبھی حقیقت نہیں بن پائیں گے۔''
اماں رونے لگی۔
''میری بچی کی خوشی اسی میں ہے وہ اکرم کے رشتے کے لیے ہاں کر دے اور اس سے بیاہ کرے۔''
ابا پگڑی کے پلو سے آنسو صاف کرتے ہوئے کھیتوں کی جانب نکل گئے۔ اماں کی آنکھیں بھی نم تھیں مگر یہاں کسی کی آنکھوں سے طوفان برپا تھا وہ فوزیہ تھی جو دروازے سے ٹیک لگائے سب سن چکی تھی اور اپنی قسمت پر نوحہ کناں تھی۔
تکیے تلے چہرہ دبا کر وہ سسکیوں سے رونے لگی۔
''میرے خواب...... میں مر جاؤں گی......''
آواز میں تڑپ تھی۔
وہ زور زور سے رونے لگی جب اماں نے اُسے آواز دی تو وہ سنبھلی۔

''فوزیہ میری بچی ہوش کرو...... یہ جو خواب ہوتے ہیں نا ہمیشہ ادھورے رہ جاتے ہیں بس کرو اب کوئی بحث نہ کرنا۔''

اکرم نے جب ماں کے منہ سے رشتے کی خبر سنی تو خوشی سے پھولے نہ سمایا اس کے خواب تو سچ ہونے والے تھے۔

مگر فوزیہ کے خواب ہمیشہ کے لیے اندھیر ہونے لگے تھے۔

چچا جان کو بھائی کی صورت دیکھے کتنا عرصہ بیت گیا تھا۔ جس کی غلطی ہوتی ہے اس کا ضمیر اسے ضرور غلط ہونے کی گواہی دیتا ہے۔ پھر چچی کے دباؤ میں آ کر انہوں نے بھائی کو کتنا کچھ کہہ ڈالا تھا۔

انہیں ڈر تھا کہ فوزیہ کا رشتہ کہیں ہو نہ گیا ہو اگر ایسا ہوا تو وہ بھائی کو دیا وعدہ کیسے نبھائیں گے۔ فوزیہ کو اپنی بیٹی کیسے بنائیں گے۔

چچی کو ان کے لالچ کی سزا آہستہ آہستہ مل گئی تھی سیڑھیوں سے ایسی گریں کہ وہیل چیئر ہی پھر ان کا سہارا بنی وہ اپنی غلطیوں پر شرمندہ تھیں۔

چچا بھی اپنی کی ہوئی باتوں اور غلطیوں پر نادم تھے۔

گڑیا اپنے گھر کی ہو چکی تھی شہرام بزنس سنبھال رہا تھا۔ مگر فوزیہ کبھی اس کے ذہن سے نہ نکلی تھی وہ آج بھی اسے چاہتا تھا اور ہر پل اسی کی آرزو کرتا تھا۔ مگر اس تلخ دیوار کی وجہ سے وہ خاموش تھا۔

''ارے خالہ جان...... یہ شگن کم ہے مگر بعد میں مزید بھجوائیں گے آپ کو تو معلوم ہے ماشاء اللہ میری سبزی کی ریڑھی ٹاپ کلاس ہے کاروبار میں برکت ہے بس آپ جلدی کریں شادی کے دن منتخب کیجیے۔''

اکرم اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔

''فوزیہ کے ابا آپ بات کیجیے میں آتی ہوں۔'' کمرے میں داخل ہوئی تو فوزیہ ماں سے لپٹ کر رونے لگی۔

''اماں...... تو سچ کہتی تھی میں صرف ایک خواب زادی ہوں خوابوں کو دیکھنا آسان ہے مگر ان کی تکمیل مشکل ہے۔''

فوزیہ نے کتنے سجدے کیے تھے کتنی دعائیں مانگی تھیں ان دعاؤں کی تکمیل کب ہو جائے یہ صرف اللہ جانتا ہے۔

فوزیہ دیوار سے ٹیک لگائے اپنی قسمت پر رشک کر رہی تھی دروازے سے آتے لوگوں کو دیکھ کر اماں کے ہاتھ سے شربت کا گلاس چھوٹنے ہی والا تھا اگر ابا سہارا نہ دیتے تو شاید دونوں گلاس گر جاتے۔

سفید داڑھی چہرے پر موٹے شیشوں والی عینک پینٹ شرٹ میں ملبوس وہ انہی کا بھائی عادل تھا۔

وقت بھی انسان کو کتنا بدل دیتا ہے۔ مگر اپنوں سے تو خون کے رشتے ہوتے ہیں نا چاہے کتنی بدگمانیاں پیدا ہو جائیں۔

خون کا خون سے جو رشتہ ہے وہ اپنوں کو فوراً پہچان لیتا ہے دلوں میں مقناطیسی قوتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور پھر اپنوں کو پہچاننے میں ذرا دیر نہیں لگتی بالکل اس طرح ابا کو بھی بھائی کو پہچاننے میں ذرا دیر نہ لگی۔

''وہیں رک جاؤ عادل......'' دور سے آتے عادل کو دیکھ کر ابا نے سختی سے انگلی کا اشارہ کیا۔

''بھائی جان......'' ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ابا نے اپنا رخ موڑ لیا آنسو پلکوں کے بندھ

توڑ کر بہہ رہے تھے۔
بھائیوں سے بھی کیا رشتہ ہوتا ہے اپنے رشتوں میں کتنی محبت رچی ہوتی ہے چاہے جتنے اختلاف آ جائیں پھر نفرتوں کا راج مٹ جاتا ہے محبتوں کے سائے ہر سو چھا جاتے ہیں دل میں سارا پیار واپس اُمڈ آتا ہے۔
''چلو اکرم بیٹا...... یہاں تو جانے کون سا ڈرامہ چل رہا ہے خواہ مخواہ بے عزتی کروانی تھی تو پہلے بتا دیتے آپ لوگ......'' دونوں ماں بیٹا تیزی سے نکل گئے۔
ابا کی آنکھوں کے آگے تمام مناظر پردہ اسکرین کی مانند چلنے لگے۔
''بھائی...... مجھے معاف کر دیں۔ میں اپنی غلطیوں پر نادم ہوں میں نے بہت برا کیا۔'' وہیل چیئر کو گھماتی ایک ہیلپر کے ساتھ چچی گھر میں داخل ہوئیں۔
''ہمیں معاف کر دیں بھائی جان...... میری لگائی ہوئی آگ نے آپ دونوں میں نفرتیں پیدا کر دیں اور پھر مجھے میرے کیے کی سزا مل گئی۔'' ابا نے مڑ کر چچی کی یہ حالت دیکھی تو حیران رہ گئے۔ چچا ابا کے قدموں میں گر کر رو رہے تھے۔
ابا کا دل بھی ٹھاٹھیں مار مار کر رونے لگا۔ گلے میں آنسوؤں کا نمکین پانی اٹک گیا تھا۔ بچپن سے لے کر اب تک کا زمانہ بھائی کا ساتھ بتایا ہر لمحہ یاد آ رہا تھا۔ پھر محبت تو محبت ہوتی ہے اس کے مقام کو کوئی نہیں چھین سکتا۔
محبت کا تو دل میں الگ مقام ہوتا ہے ایک علیحدہ خانہ ہوتا ہے۔ محبت کے اس خانے میں نہ تو نفرت سما سکتی ہے نہ کوئی اور جذبہ تو محبت کا خانہ بس محبتوں سے لبریز ہوتا ہے۔
ابا نے یکدم بھائی کو ہاتھوں سے پکڑا اور گلے لگا لیا پھر دونوں طرف آنسوؤں کا طوفان برپا ہو گیا۔
''بھیا آپ نے مجھے دل سے معاف کر دیا نا۔''
''میں نے تمہیں معاف کیا غلطیاں چھوٹوں سے ہی ہوتی ہیں مگر بڑوں کا کام معاف کرنا ہے' افسوس تمہیں بہت سالوں بعد خیال آیا۔''
''بھائی جان مجھے مزید نادم مت کیجیے۔''
''میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے......'' ابا نے مطمئن ہو کر کہا تو چچا کو بھی تسلی ہوئی۔
''بیٹا اندر آ جاؤ......'' چچا نے زور سے آواز دی۔
اونچا لمبا جوان تیکھے نقوش' بھورے بال چہرے پر تازگی اور خوبصورتی کا عنصر لیے وہ خوبصورت شہزادے سے کم نہ تھا۔
''شہرام...... میرا بچہ......'' ابا نے سینے سے لگا کر بوسہ لیا۔ پھر چچی' چچا اور شہرام کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔
ابا اور چچا نے مقابلہ بازی سے لسی کے گلاس ختم کیے دونوں بہت خوش تھے۔ گاؤں کی ہوا نے چچا کو تر و تازہ کر دیا۔
ابا نے مسکراتے ہوئے فوزیہ کو آواز دی جو جانے کب سے کمرے میں قید تھی۔
''بھئی فوزیہ تیرا رشتہ پکا ہو گیا ہے آج ہی نکاح ہو گا۔'' فوزیہ کے دل پر جیسے دھڑام سے آ کر کوئی شے گری ہو۔
''باہر آ جاؤ فوزیہ۔'' ابا نے اونچی آواز میں فوزیہ کو باہر آنے کا حکم دیا۔ ابا کے حکم پر وہ باہر آئی تو آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔ اس نے چچا چچی کو پہچاننے میں ذرا دیر نہیں لگائی۔
ہلکے فیروزی رنگ کی شوار قمیض میں سر پر

دوپٹہ لیے بلی جیسی چمکتی آنکھیں لیے وہ خوبصورتی کا پیکر بنی کھڑی تھی۔

''چچا جان......'' وہ بھاگتی ہوئی آئی اُن کے سینے سے لپٹ کر رونے لگی۔

''چچی جان......'' انہوں نے فوزیہ کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ وہ کبھی ابا کو دیکھتی تو کبھی چچا وہ سب مسکرا رہے تھے ان چہروں کے بیچ ایک جانا پہچانا سا چہرہ تھا اور وہ چہرہ کسی اور کا نہیں اُس کے شہزادے شہرام کا تھا۔

''ابا......'' اس نے ابا کو پکارا۔ ابا خوشی سے بولے۔

''اب تم صرف خواب نہیں دیکھوگی دیکھو آج ان کی حقیقت کا دن آیا ہے۔'' وہ شرماتے ہوئے کمرے کی طرف بھاگ گئی دروازہ زور سے بند کرلیا۔

دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں اسے یقین نہیں ہو رہا تھا وہ خوابوں کے سارے پل سچ ہونے لگے تھے۔ وہ پاگلوں کی طرح خوشی سے چیخنے لگی اچانک دروازہ کھلنے کی آواز آئی اس کی ہنسی کہیں گم ہوگئی۔

آنکھوں کے آگے وہی شہزادہ تھا جو کبھی اسے خوبصورت وادیوں میں ملتا تو کبھی پھولوں کی سیج پر اُس کا انتظار کرتا۔

''تم تو بہت بڑی ہوگئی اور پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت اور حسین بھی۔'' شہرام قریب ہوتے ہوئے بولا۔

اس نے شرم کے مارے گردن جھکالی دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوئی جب اس نے نرم مخملی انگلیوں کو چھولیا۔ سفید رنگ کی چمکتی انگوٹھی فوزیہ کی مخملی انگلیوں میں پہنائی۔ خود سے قریب کرتے ہوئے اس نے ہولے سے سرگوشی کی۔

''سنا ہے آپ بہت خواب دیکھتی ہیں؟''

''کس نے کہا؟'' وہ شرمائی۔

''بس ہوائیں سرگوشیاں کرتی ہیں۔'' وہ مسکرایا۔

''ہواؤں کی ایسی کی تیسی۔'' وہ شرارتی انداز میں بولی اور پھر دانتوں تلے زبان دبالی۔

''اب میں تمہیں خواب نہیں دیکھنے دوں گا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''میرا خواب آپ ہی تھے مجھے کوئی خواب نہیں دیکھنا۔'' شہرام ہنس دیا۔

''ارے اوہ ماہ رانی ...... اب اندر کونسا خواب دیکھ رہی ہو؟'' وہ دونوں کمرے سے یکدم باہر آئے۔

''اماں...... میں واقعی میں ماہ رانی ہوں دیکھو راجہ مجھے لینے آگیا۔ بس اللہ بری نظر سے بچائے۔''

''آمین...... چلو اب دیر ہو رہی ہے۔''

گاڑی شہر کی طرف دوڑ رہی تھی وہ اماں ابا کے ساتھ ہمیشہ کے لیے شہر جارہی تھی اس کی شادی کے تمام انتظامات شہر میں ہونے تھے۔

آج گاؤں کی ہر ایک شے کو دیکھ کر دکھ ہو رہا تھا مگر جیسے ہی شہرام اس کی آنکھوں کے آگے آتا تو سب خیالوں کو جھٹک کر حقیقت کی دنیا میں آجاتی۔

سچ ہے اگر لگن سچی ہو تو خوابوں کی تکمیل کو کوئی نہیں روک سکتا۔ اس میں آپ کی دعاؤں 'لگن' احساسات اور نیتوں کا بھی بڑا عمل دخل ہے اگر یہ سب ہو تو کوئی رکاوٹ آپ کے خوابوں کی راہ میں نہیں آسکتی۔ فوزیہ کی لگن سچی تھی اس لیے اس کے خواب بنے حقیقت......

☆☆......☆☆

کراچی سے ارسال کردہ کڑوی سچائی

مینا تو جھلی ہے

مینا تو جھلی تھی پر خالد چاچا بڑا کائیاں نکلا......

حقیقت جان کر بے چارہ عدنان ہونق کا ہونق رہ گیا......

عابدہ مغل

ہری بلڈنگ یعنی آصف منزل چار منزلہ عمارت تھی جس کے ہر پورشن میں تین گھر تھے ٹوٹل بارہ گھر تھے ہر گھر میں دو کمرے ایک لاؤنج ایک کچن ایک باتھ پلس ٹوائلٹ تھا گھر کیا تھے سیلن زدہ کمرے جو تاریکی میں اپنا ثانی نہ رکھتے کائی زدہ باتھ اور کچن بساند مارتے تو مانو ابکائی محسوس ہوتی' فرش جا بہ جا اکھڑے ہوئے دیواروں کے کنارے جھڑے ہوئے تھے۔ بلڈنگ کی دیواروں نے یقیناً کبھی چونے کا ذائقہ چکھا ہوگا مگر اب اتنی برہنہ تھیں کہ چونے کے ساتھ ساتھ پلستر کو بھی اُتار کر پھینک چکی تھیں۔ مگر بلڈنگ کا ایک پلس پوائنٹ تھا وہ یہ کہ کرایہ بہت مناسب تھا۔

اچھے وقتوں میں بنائی گئی آصف منزل کو آصف خان آفریدی صاحب نے اپنے بیوی بچوں کے لیے بنایا تھا مگر جب اللہ پیسے دیتا ہے تو نزاکت آ ہی جاتی ہے آصف خان میں بھی نزاکت آ گئی تھی اسی لیے یہ جگہ اور چاؤ سے بنائی گئی ہری بلڈنگ اور یہاں کا ماحول اُسے یکدم غربت زدہ لگنے لگا۔ سو انگلینڈ گئے بیٹے کے لیے لیے ڈرافٹ اُسے یہاں سے ڈیفنس لے گئے البتہ جانے سے پہلے وہ بلڈنگ کو کرائے پر دے گیا چار چھ مہینے بعد کرایہ وصولنے آتا اور بس' ان گھروں میں سب فیملیز رہتی تھیں۔

درمیانی منزل پر بوا جمیلہ اور شکیل بابا رہتے تھے۔ ان کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی ان کے سامنے پٹھان فیملی رہتی اچھے لوگ تھے اوپر کے پورشن میں بنگالی رہتے تھے ان کے اوپر خالد اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی بیوی ہائی بلڈ پریشر اور دمے کی مریضہ تھی خالد پکی عمر کا چرب زبان اور نظر باز آدمی تھا۔ تاہم محلے میں شرافت کا لبادہ اوڑھے رہتا۔ یہاں ایک فیملی اور تھی اسلم بھائی کی فیملی اسلم بھائی نہایت شریف اور وضع دار کم گو انسان تھے ذکیہ بیگم بھی بہت اچھی عادت کی مالک تھیں۔

ان کے چار بچے تھے تین تو ٹھیک ٹھاک تھے البتہ بڑی بیٹی کچھ ابنارمل تھی اللہ جانے کیا نام تھا مگر اسے سب مینا پکارتے' مینا کبھی عقل و خرد سے بے نیاز لگتی کبھی بہت ہی دانشور...... بلڈنگ کے ہر گھر میں

بلا جھجک داخل ہو جاتی کبھی کھانا مانگتی کبھی دس روپے کبھی کام کرانے لگتی کبھی مرتے کے منہ میں پانی نہ ڈالتی کبھی گھر سے ہفتوں نہ نکلتی کبھی گھروں سے ڈھونڈ کرلانی پڑتی' ماں باپ کو اکثر نام سے پکارتی بہت سمجھایا جاتا مگر ضدی گھوڑی کی طرح اڑی رہتی۔

ڈیل ڈول اچھا تھا رنگ بھی صاف تھا صاف ستھری رہتی تھی۔ دن اسی طرح گزر رہے تھے بلڈنگ والے سب ایک دوسرے کے گھروں میں آتے جاتے رہتے تھے ایک رات خالد کی بیوی کی طبیعت بگڑ گئی ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے زچہ و بچہ موت کے منہ میں چلے گئے خالد کی تو دنیا ہی اجڑ گئی بلڈنگ میں سب ہی برسوں پرانے کرائے دار تھے۔ سو سب نے ہی خالد کا غم ہلکا کرنے کی اپنی سی کوشش کی کوئی کھانا دے رہا ہے کوئی چائے پوچھ رہا ہے۔ سب ہی خالد کے غم میں برابر کے شریک تھے۔ وقت خود ایک مرہم ہے خالد کو بھی صبر آ گیا اب بلڈنگ کے جس گھر میں جو اچھا پکتا وہ خالد کو بھیجا جاتا سب خالد کی ضرورت کا خیال رکھتے۔ مینا اب اور بڑی ہو گئی تھی اکثر خالد کے لیے کھانا لاتی کبھی کپڑے لے کر جاتی دھو کر دے جاتی کبھی چائے کبھی ناشتہ لا رہی ہوتی کبھی اوپر کبھی نیچے سارا دن مینا خالد چاچا کو پکارتی سیڑھی اترتی چڑھتی نظر آتی چاچا چاچا کہہ کر مینا کا منہ واقعی سوکھ جاتا۔

بنگالی فیملیز میں مینا کے ساتھ کی دو لڑکیوں کی شادی ہو گئی کچھ محلے میں شادیاں دیکھ کر مینا کو بھی شوق چرایا کہ اس کی بھی شادی ہو گھر میں واویلا ڈال دیا۔



"میری بھی شادی کردو مجھے دلہن بننے کا بہت شوق ہو رہا ہے۔" ذکیہ بیگم حیران سی بیٹی کو دیکھنے لگیں جو شادی کی بات یوں کر رہی تھی گویا کھانے کو برگر مانگ رہی ہو۔ انہوں نے نظر انداز کر دیا مگر مینا کا مطالبہ زور پکڑتا گیا اب وہ باپ کے سامنے بھی شور مچاتی کہ مجھے شادی کرنی ہے دلہن بننا ہے روز کی تکرار سے تنگ آ کر ذکیہ بیگم بوا جمیلہ سے مشورہ کرنے چلی آئیں۔

"بوا مینا شادی کے لیے مچل رہی ہے کیسے کروں اُس کی شادی آتا جاتا کچھ نہیں عقل نام کو نہیں جھلی ہے پوری کون کرے گا شادی کون رکھے گا اسے کون پاگل کو برداشت کرے گا' وہ ہے کہ سمجھتی ہی نہیں' باپ کے سامنے بھی کہنے لگی ہے مجھے بہت شرم آتی ہے بوا تم بتاؤ میں کیا کروں۔" ذکیہ بیگم بوا جمیلہ سے کہنے لگیں۔

بوا جمیلہ پوری بات سن کر بولی۔

"گھبراؤ نہیں ذکیہ مینا اپنے منہ سے کہہ رہی ہے تو اللہ نے کچھ حیلہ وسیلہ بنایا ہوگا شادی تو کرنی ہی ہے تو اسے نکیل ڈال گھر کے کام کاج سکھا اللہ نے جوڑ بنایا ہے تو ہو جائے گی شادی میں کہیں کہہ سن کر بات چلاتی ہوں۔ مگر پہلے تو اسے سنبھال۔" بوا جمیلہ نے ذکیہ بیگم کو دلاسے کے ساتھ ہی آس کی ڈوری بھی تھما دی۔

پھر ذکیہ بیگم نے مینا کے آگے شرط رکھ دی جو وہ کہیں گی مینا مانے گی کام دھندے سیکھے گی تاکہ شادی کے بعد اپنے میاں کو پکا کر کھلا سکے گھر سنبھال سکے بات مینا کے ذہن میں آ گئی۔ ادھر بوا جمیلہ نے کہہ سن کر رشتے کی بات چلا دی عدنان کا کوئی نہیں تھا ماں باپ کب کے مر گئے تھے کباڑیے کا کام کرتا تھا ایک آنکھ سے بھینگا تھا اور دانت باہر کو نکلے ہوئے تھے رنگ توے کو بھی شرماتا تھا جبھی ابھی تک کنوارا تھا عدنان کو کوئی رشتہ نہ دیتا تھا مینا کو کسی نے لینا نہیں تھا۔ سو رب نے ملائی جوڑی والی کہاوت صادق آ گئی رشتہ ہو گیا۔ عدنان کی سیرت بہت اچھی تھی عزت اور غیرت والا تھا مینا کو قبول کر رہا تھا اور کیا چاہیے تھا فوراً شادی کی تاریخ رکھ دی گئی۔

مینا کو لال پیلے نیلے ریشمی کپڑے پہننے کی ہڑک تھی بس نہیں چل رہا تھا جہیز کے بنائے گئے کپڑے آج ہی پہن لے شاید اس کے ذہن میں شادی کا تصور یہ ریشمی ستارے والے کپڑے ہی ہوں گے۔ پھر جلد ہی بلڈنگ کے احاطے میں شامیانے لگا کر بریانی کھلا کر مینا کو رخصت کر دیا گیا اس رات پوری بلڈنگ مینا کو یاد کر رہی تھی اور یاد تو مینا خالد کو بھی بہت آ رہی تھی۔

رواج کے مطابق چار دن بعد مینا میکے چلی آئی خلاف توقع وہ خاموش سی تھی عدنان شادی کے بعد پہلی بار سسرال آیا تھا اس لیے مینا کے چھوٹے بھائی کو لیے مٹھائی لینے چلا گیا۔ بوا جمیلہ اور کچھ عورتیں مینا سے ملنے آ گئیں مگر سب نے اس کی خاموشی محسوس کر لی بوا جمیلہ کہنے لگیں۔

"کیسی ہے تو مینا؟ خوش تو ہے نا عدنان کے ساتھ......" منی نے ایک آہ کھینچی اور بولی۔

"میں سمجھتی تھی سب کی شادیاں ہوتی ہیں اس لیے شادی کرنا بہت ضروری ہوگا جانے شادی میں ایسی کیا خاص بات ہوگی مگر...... شادی کے بعد پتہ چلا...... شادی میں تو کچھ خاص نہیں...... یہ سب تو ہم...... روز دوپہر میں خالد چاچا کے ساتھ......" جھلی کی آواز پورے گھر میں گونج رہی تھی باہر سے آئے عدنان کے ہاتھ سے مٹھائی کا ڈبہ گر گیا۔ وہ مینا کی بات سن چکا تھا اور جان چکا تھا مینا اب اتنی پاگل بھی نہ تھی۔

☆☆......☆☆

ساڈا حق اتھے رکھ

عورتوں کو کم تر مخلوق سمجھنے والے مردوں کے لیے ایک سبق آموز
کہانی......تصور کو بھی اپنی زیادتیوں کا احساس ہو گیا تھا مگر شاید دیر ہو گئی تھی......

شمسہ قمر

میرے شوہر تصور حسین ایک کھاتے پیتے بزنس مین ہیں۔ ہمارے تین بچے ہیں۔ جس میں سب سے بڑا عالیان، اس سے چھوٹا ریان اور اسکے بعد ہماری بیٹی عائشہ۔

میرے شوہر پڑھے لکھے ہونے کے باوجود وہ ایک روایتی مرد ہیں۔

جب ہمارا بڑا بیٹا پیدا ہوا تھا، تو ہماری خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ مگر تصور مجھ سے کہیں زیادہ خوش تھے۔ اسکے بعد دوسرے بیٹے کی پیدائش نے انہیں مزید خوش کر دیا تھا۔ جب میں تیسری بار امید سے ہوئی تو ڈاکٹر نے الٹرا ساؤنڈ کے بعد بیٹی بتائی تھی۔

میں جب کلینک سے باہر نکلی تو تصور بے تابی سے آگے بڑھے اور پوچھا کہ۔

''ڈاکٹر نے کیا نے کہا؟'' انکے لہجے میں تجسس اور اشتیاق تھا۔

''ڈاکٹر نے کہا ہے کہ بیٹی ہے۔'' میں نے مسرور کن لہجے میں بتایا۔ ''بھئی میں نے تو بیٹی کے لئے بہت دعائیں کی تھی، اور اب تو ڈر رہی تھی کہ کہیں دوبارہ بیٹا نہ ہو اور میں بیٹی کی رحمت سے محروم ہو جاؤں۔''

''چلو تمہاری دعا قبول ہو گئی۔'' انہوں نے عام سے لہجے میں کہا مگر میں نے اس وقت اترا چہرہ نہیں دیکھا تھا کیونکہ میں اپنی خوشی میں اس وقت بہت خوش تھی۔

میری بیٹی کی پیدائش سے چند دن قبل تصور بزنس کے سلسلے میں ملک سے باہر چلے گئے۔ اس لئے بیٹی کی پیدائش پر وہ ہمارے پاس نہیں تھے۔ بیٹی کی پیدائش کے دو دن بعد جب وہ واپس آئے تو حیران ہو گئے۔

''ارے یہ کب پیدا ہوئی؟''

''دو دن پہلے۔ میں نے سوچا کہ آپ کو سرپرائز دوں۔''

''یہ تو کوئی خاص سرپرائز نہیں ہے۔'' شاید انہیں سرپرائز پسند نہیں آیا۔

''ہماری بیٹی کس پر ہے؟'' میں نے اشتیاق

سے پوچھا۔
انہوں نے غور سے بچی کو دیکھا۔ وہ صحت مند اور سرخ سی بچی تھی۔ اسکا چہرہ بہت بھرا بھرا تھا، اسلئے نقوش واضح نہیں تھے۔
''ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا، جب بڑی ہوگی تو اسکی شکل نمایاں ہوگی۔''
''اچھا!'' میں نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔
میں اپنے شوہر کے بارے میں جانتی تھی۔ وہ بے حد حسن پرست تھے۔ میں بھی اچھی شکل و صورت کی مالک تھی۔ ہمارے دونوں بیٹے بہت خوبصورت تھے۔ جو بھی انہیں دیکھتا تھا، ضرور تعریف کرتا تھا۔
میں جانتی تھی کہ تصور اب اپنی بیٹی کے خوبصورت ہونے کے لئے ابھی سے دعائیں شروع کردیں گے۔
انہیں اس بات کی بہت فکر تھی کہ انکی بیٹی خوبصورت ہو جبکہ وہ یہ بات بھول گئے تھے کہ اللہ سے بیٹیوں کے اچھے نصیب کی دعا کرنی چاہیے، نصیب بنانے والا، اچھا نصیب صرف خوبصورت لوگوں میں نہیں بانٹتا۔
جب ہماری بیٹی دو سال کہ ہوئی تو اسکے بال گھنگھریالے ہوگئے، اور رنگت سرخ و سفید۔ جو کوئی اسے دیکھتا، فدا ہو جاتا۔ مگر تصور کا رویہ ناقابل فہم تھا، وہ اپنی بیٹی سے بہت محبت کرتے تھے مگر اس کے لئے بہت تنگ ذہن کے تھے۔
انہوں نے یہ بات کہنا شروع کردی تھی کہ وہ اپنی



بیٹی کو صرف حفظ کروائیں گے۔
''بھئی میں تو اسے اسکول میں ضرور داخل کرواؤں گی۔'' جب میں نے یہ بات سنی تو ہنس کر کہا۔
''نہیں میں اسے اسکول نہیں بھیجوں گا، آج کل کی لڑکیوں کو دیکھا ہے، کیا کرتی پھر رہی ہیں۔''
''اچھا بھئی، ابھی وقت ہے۔ سوچیں گے۔'' میں نے ٹال دیا۔ مگر میں نہیں جانتی تھی کہ آگے حالات کا مقابلہ کرنا اس قدر مشکل ہوگا۔
مجھے آج بھی وہ دن یاد ہے جب میں اپنی بیٹی کا نام عرشا رکھنا چاہتی تھی۔ مگر جب تصور نے یہ نام سنا تو ریجکٹ کر دیا، اور کہا کہ۔
''ارے بھئی یہ بھی کوئی نام ہے؟ مجھے ایسے نام نہیں پسند۔ میں اسکا کوئی اسلامی نام رکھوں گا جیسے عائشہ۔''
''عائشہ اچھا نام مگر مجھے عرشا پسند ہے۔'' میں نے کمزور سا دفاع کیا۔
''ہم اسکا نام عائشہ ہی رکھیں گے۔ اسلامی نام والی لڑکیاں کچھ غلط نہیں کرتی۔''
میں خاموش ہوگئی، تصور کی سوچ بدلنا ناممکن تھا۔
ہمارے دونوں بیٹے شہر کے بہترین اسکول میں اولیول پڑھ رہے تھے۔ جب عائشہ تین سال کی ہوگئی تو ہر روز اس بات پر بحث ہونے لگی کہ اسے اسکول میں داخل کروانا ہے یا حفظ کروانا ہے۔ میں اس صورت حال پر بہت پریشان تھی۔
ایسا نہیں تھا کہ میں مذہب سے دور تھی بلکہ میں دین و دنیا دونوں کو ساتھ لے کر چلنے والوں میں سے تھی۔ میرے نزدیک دنیاوی تعلیم بھی اہم تھی۔ جبکہ تصور تعلیم کو بیٹیوں کے لیے بالکل بھی اہم نہیں سمجھتے تھے۔ میں انکی ان باتوں کی وجہ سے اندر ہی اندر کڑھنے لگی اور تصور کو قائل کرنے کے طریقے سوچنے لگی۔
بہت سوچ بچار کے بعد تصور کے بڑے بھائی سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اپنے بڑے بھائی کی بہت عزت کرتے تھے اور انکی ہر بات مانتے تھے۔
جب میں نے اپنے جیٹھ زاہد حسین سے بات کی تو پہلے تو وہ بہت حیران ہوئے کہ تصور اس سوچ کے مالک ہیں۔ اسکے برعکس زاہد حسین بہت لبرل سوچ کے مالک تھے۔
وہ اپنی بیٹیوں کے بیٹوں سے زیادہ چاہتے تھے۔ انہوں نے بیٹیوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی، انکی بیٹیاں بہت سلجھی ہوئی، فرمانردار اور نماز کی پابند تھی اس لئے انہیں تصور کی ناانصافی بلکل پسند نہیں آئی تھی۔
دوسرے دن زاہد بھائی ہمارے گھر آئے۔ تصور بھی گھر پر ہی موجود تھے۔
''اور سناؤ تصور۔ بیٹے اسکول جارہے ہیں؟''
''جی آج انہوں نے چھٹی کی تھی اس لئے جانا نہیں ہوا۔''
''اچھا اچھا اور ہماری گڑیا کو کب اسکول داخل کروانا ہے؟ اسکی عمر ہوگئی ہے اب اسکول کی۔''
''ہاں بھائی جان سوچ رہا ہوں کہ اسے حفظ کروادوں۔ تعلیم کا کیا ہے، وہ تو ہو ہی جائے گی۔ پہلے دینی تعلیم تو حاصل کر لے۔''
''تصور حفظ تو تعلیم کے ساتھ بھی کیا جاسکتا ہے اور پھر یہ کہاں لکھا ہے کہ جو حفظ نہیں کرتے ہو اسلام سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔'' انہوں نے

دلیل دی۔

”وہ دراصل آپکو تو پتہ ہے نا آج کل کے ماحول کا کہ کس قدر خراب ہے۔ اس لئے مجھے فکر ہو رہی ہے۔“

”وہ تو درست ہے لیکن میں نے بھی تو اپنی بیٹیوں کو تعلیم دلوائی ہے۔ کیا تمہیں ان میں کوئی خرابی نظر آئی ہے؟ یہ سب تربیت پر منحصر ہوتا ہے۔“

”مگر میرے خیال ہے۔۔۔۔“ وہ اٹک اٹک کر بولے۔

”تم عائشہ کو اسکول میں داخل کرواؤ گے۔ اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو میں تم سے ناراض ہو جاؤں گا۔“ انہوں نے حتمی لہجے میں کہا۔

اب تصور کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ وہ اپنے بھائی کو ناراض کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

”اچھا ٹھیک ہے، مگر میری ایک شرط ہے۔ یہ لڑکیوں کے اسکول میں پڑھے گی۔“

”تو پھر یہ اپنے بھائیوں کی طرح اولیول تو نہیں کر سکے گی۔“ مجھے فکر لاحق ہوئی۔

”خیر ہے۔ تم اسے اسکول میں تو داخل کرواؤ۔“ زاہد بھائی نے مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

کچھ دنوں بعد عائشہ کو قریب کے اسکول میں داخل کروا دیا۔ یہ ایک عام سا اسکول تھا اور میرے بیٹوں کے مقابلے میں ایک کمتر اسکول تھا۔ میرا دل رو رہا تھا لیکن میں مجبور تھی۔

ایک دن جب ڈرائیور چھٹی پر تھا، تو میں بچوں کو اسکول سے لینے چلی گئی۔ عائشہ کو لے کر جب میں عالیان اور ریان کو لینے انکے اسکول آ گئی۔ عائشہ بغور ہر چیز کا جائزہ لے رہی تھی۔

”مما بھائیوں کا اسکول کتنا بڑا ہے۔ اس میں کتنے پیارے پھول لگے ہوئے ہیں۔ کیا میں ایک توڑ لوں؟“ اس نے معصومیت سے پوچھا۔

”نہیں پھول نہیں توڑتے۔ بری بات ہے۔“

”مگر مما مجھے پھول پسند ہیں اور میرے اسکول میں بالکل بھی پھول نہیں ہیں۔“

وہ میرے ساتھ ننھے ننھے قدم اٹھاتی ہوئی مجھ سے ناک چڑھا کر بول رہی تھی۔

واپسی پر اس نے رٹ لگا دی کہ اسے اسی اسکول میں ہی جانا ہے۔

”مما آپ مجھے اس اسکول میں داخل کیوں نہیں کرواتیں؟“

اسکے اس سوال پر میرے دل کو ایک دھکا لگا۔

”بیٹا آپکے لئے وہی اسکول اچھا ہے۔“ میں بس اتنا کہہ کر چپ ہو گئی۔

مگر گھر پہنچ کر بھی عائشہ کے ننھے ذہن سے یہ بات نہیں نکل رہی تھی۔ وہ شدت سے چاہ رہی تھی کہ وہ اسی اسکول میں جائے۔ اسکو اپنے چھوٹے اسکول سے بہت نفرت ہونے لگی تھی۔ پھر ایسے ہی چند سال گزر گئے۔ عائشہ اب تیسری کلاس میں آ گئی تھی۔

مجھے اب فکر ہو رہی تھی کہ کسی طرح اب اپنی بیٹی کو بڑے اسکول میں داخل کروا دوں۔ میں اکثر تصور کو عائشہ کی باتیں بتاتی کہ وہ کس طرح اپنے اسکول سے ناخوش ہے اور بھائیوں کے اسکول میں جانا چاہتی ہے۔ مگر وہ میری بات پر کوئی خاص توجہ نہیں دیتے تھے۔

انہی دنوں اتفاقاً میری نند دبئی سے کچھ دن ہمارے گھر رہنے کراچی آئی۔ میں نے اپنی ساری پریشانی انہیں بتائی تو انہوں نے تصور سے بات

کرنے کی ٹھانی۔

جب ہم لوگ رات کے کھانے پر ساتھ بیٹھے تو میری نند نے اس ٹاپک کو چھیڑ دیا۔

''بھئی ہماری ننھی پری کونسی کلاس میں ہے؟'' انہوں نے عائشہ کو پیار سے اپنی گود میں بٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''میں کلاس تھری میں ہوں۔'' فوراً جواب دیا۔ ''مگر پھوپھو مجھے اپنا یہ اسکول بلکل پسند نہیں ہے۔'' اس نے خفگی سے بتایا۔

''کیوں بھئی؟ کیوں پسند نہیں ہماری بیٹی کو؟'' انہوں نے اسکو خود سے لپٹاتے ہوئے کہا۔

''بس یہ اسکول گندہ ہے، اس میں ڈھیر سارے پھول بھی نہیں اور نہ ہی بڑا ہے۔''

''اچھا تو پھر ہماری بیٹی کو کونسا اسکول پسند ہے؟''

بھائیوں والا۔'' اس نے جھٹ کہا۔

''وہ کیوں؟'' انہوں نے پوچھا۔

''آپکو پتہ ہے وہ بہت بڑا اور پیارا ہے۔ اس میں ڈھیر سارے پھول ہیں۔'' اس نے ایکسائٹڈ ہو کر ہاتھوں سے بڑا سا دائرہ بنا کر بتایا۔

''تو ٹھیک ہے بھی ہماری بیٹی کو اسی میں داخل کروا دو تصور۔ یہ بھی بھائیوں کے ساتھ جائے گی۔''

تصور جواب میں خاموش رہے، مجھے فکر ہونے لگی کہ نجانے کیا جواب دیں گے وہ۔

''وہ آپا دراصل بیٹوں کا اسکول کو ایجوکیشن ہے۔ اور میں اسے لڑکوں والے اسکول میں نہیں پڑھانا چاہتا۔ آپکو آج کل کے ماحول کا تو پتہ ہے۔''

''بھئی ماحول تو انسان خود بناتا ہے۔ اپنی اولاد کی تربیت تو گھر سے شروع ہوتی ہے۔ اور جس نے بگڑنا ہو وہ تو سات پردوں میں بھی بگڑ جاتا ہے۔'' انہوں نے دلیل دی۔ ''میری بیٹیاں بھی کو ایجوکیشن میں پڑھ رہی ہیں، اور انکے لئے میں نے لڑکوں کو کوئی آسمانی مخلوق نہیں بنایا۔

انہوں نے ایک حد میں رہ کر اپنی تعلیم مکمل کی۔ اپنے کلاس فیلوز سے ضرور بات بھی کی اور مجھے بھی ان سے کوئی شکایت نہیں ہوئی کبھی۔ حیا تو عورت کی آنکھ میں ہوتی ہے۔ تم اپنی بیٹی پر بھروسہ تو کرو۔

اگر تم اس طرح سے کرو گے تو وہ الجھے ذہن کے ساتھ بڑی ہوگی۔''

''اچھا میں دیکھوں گا۔'' انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا۔

میں جانتی تھی کہ مصور دوبارہ اس موضوع پر کوئی بات نہیں کریں گے۔ وہ اپنی تنگ نظری کی وجہ سے اپنی بیٹی کو ہمیشہ پیچھے رکھیں گے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ اپنی بیٹی کو آزادی دیں اور وہ پھر انکے سر جھکانے کا باعث بنے اس لئے وہ اسے کسی قسم کی کوئی گنجائش نہیں دیں گے۔

وہ شاید بھول گئے تھے کہ شادی کے بعد بچوں کو ایک تعلیم یافتہ ماں کی کتنی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنے باپ کے اس رویے کی وجہ سے میری ننھی عائشہ کے دل میں پہلی گرہ پڑ گئی تھی۔

عائشہ بے دلی سے اسکول جانے لگی تھی، وہ ذہین تھی مگر اپنی پوری توجہ اسکول میں نہیں دے پا رہی تھی۔ وہ اپنا زیادہ تر وقت پینٹنگ کرتے ہوئے گزارنے لگی تھی۔ وہ پینٹنگ کو اظہار کا ذریعہ سمجھنے لگی تھی۔ جب بھی وہ ڈپریس ہوتی تو زبردست پینٹنگ کرتی تھی۔ میں نے اکثر اسکی شاندار پینٹنگز دیکھی تھی۔

مجھے آج بھی یاد ہے جب عائشہ بے انتہا روئی تھی۔ میں اسے چپ کروانے میں ہلکان ہو گئی تھی مگر وہ چپ ہی نہیں ہو رہی تھی۔ اس کی کلاس میں سب لڑکیوں کے پاس موبائل تھا، مگر عائشہ کے پاس نہیں تھا۔

جب بھی وہ کسی دوست کے گھر جاتی تو اسے گھر والوں سے رابطہ کرنے کے لئے موبائل کی ضرورت پڑتی تھی۔ اسے اچھا نہیں لگتا تھا دوسروں سے فون مانگ کر کال کرنا۔ اسکی دوستیں بھی حیران ہو کر پوچھتی تھی کہ تمہارا فون کدھر ہے تو وہ خاموشی سے کندھے اچکا دیتی۔ اسے دنیا کو جاننے اور سمجھنے کا شوق تھا۔

وہ پوری دنیا کو اپنے موبائل سے کھوجنا چاہتی تھی۔ اس لئے اس نے موبائل کی فرمائش کی مگر تصور نے صاف انکار کر دیا تھا۔ تو وہ ناچاہتے ہوئے بھی رو دی۔

"مما بھائیوں کے پاس موبائل ہے تو میرے پاس کیوں نہیں؟"

"بیٹا بھائی بڑے ہیں، تمہارے لئے اتنی چھوٹی عمر میں موبائل ٹھیک نہیں ہے۔"

"میری عمر میں بھائیوں کو تو موبائل مل گیا تھا مجھے کیوں نہیں؟"

اب میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

"وہ بیٹا لڑکوں کے پاس ہونا چاہیے موبائل۔"

"مگر مما میری عمر کی ساری عمر لڑکیوں کے پاس موبائل ہے۔" اس نے دلیل دی۔

"بیٹا یہ انکے والدین کی غلطی ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔"

"اگر یہ صحیح نہیں ہے تو لڑکوں کے لئے کیوں صحیح ہے، بتائیں؟"

میں الجھ گئی۔ میں جانتی تھی کہ اسے ہمیشہ سے لڑکے اور لڑکیوں کے درمیان فرق ستاتا تھا۔ اس کا ذہن اس کو تسلیم نہیں کر پاتا تھا۔ وہ باپ کے اس تفرقے کی وجہ سے وہ ہر چیز سے خائف ہو گئی تھی۔ اس یہی محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔

اب میں اسے کیسے بتاتی کہ اس باپ نے ہمیشہ مجھے بھی ان زیادتیوں اور پابندیوں میں رکھا تھا۔ میری ڈریس سینس اچھی تھی۔ میں جب بھی خاندان کے کسی فنکشن میں جاتی تھی تو سب میرے کپڑوں کی تعریف کرتے تھے اور سراہتے تھے۔

میری کزن مجھ سے یہی کہتی تھی کہ تم اتنی اچھی ڈریسنگ کرتی ہو۔ تم اپنا بوتیک کیوں نہیں کھول لیتی۔ اور میں ہنس کر ٹال دیتی۔ تصور حسین کی تنگ نظری مجھے کبھی بھی یہ کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ میں چاہتی تو بہت آگے جاسکتی تھی مگر میں ایک نباہنے والی عورت تھی اور میں نہیں چاہتی تھی کہ گھر میں ناچاقی ہو۔ اس لئے میں نے اپنی خواہشوں کی قربانی دے دی۔

"اچھا ہم بعد میں بات کریں گے عائشہ۔ تم ابھی سو جاؤ۔" میں نے بری سوچوں کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

اپنی کزن کے بہت اصرار پر میں نے ایک ڈریس اس کے لئے بنا کر بھیج دیا۔ وہ بہت خوش ہوئی کہ میں نے اپنے ٹیلنٹ کو استعمال کیا ہے۔ اس نے اپنے ڈرائیور کو بھیج کر ڈریس منگوالیا۔ کچھ گھنٹوں بعد اسکی کال آگئی۔

"میں کہتی تھی نا کہ تمہیں اس فیلڈ میں آنا چاہیے۔ مگر کوئی بات نہیں، تم اسے ہی آغاز

سمجھو اور میں تمہاری پہلی کسٹمر۔ بتاؤ کتنی پے منٹ ہوئی ہے اسکی؟''

اسکی اس بات پر میں خوش ہوئی کہ کسی نے میری تخلیق کو اپنا پسند کیا ہے۔ مجھے ایک تسکین سی محسوس ہو رہی تھی اور میرے ان جذبات کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو زندگی میں کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ مگر میں قیمت بتانے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہی تھی۔

''بتاؤ یار۔ یہ تو تمہارا حق ہے، تمہاری محنت کا صلہ۔'' اس نے میرا حوصلہ بڑھایا۔

اور میں نے ایک محدود رقم اسے بتادی۔ پھر میں نے نسبتاً چھوٹے پیمانے پر یہ کام شروع کر دیا۔ جب تصور شہر سے باہر جاتے تو میں تھوڑے بہت آرڈز نمٹا دیتی تھی۔ اس دن میں اسی سلسلے میں عائشہ کے ساتھ بازار گئی ہوئی تھی تو تصور کی کال آگئی۔

''ہاں بھئی کدھر غائب ہو؟ گھر سے بھی کوئی فون نہیں اٹھا رہا۔'' وہ غصے سے بول رہے تھے۔

''وہ ہم زرا بازار میں تھے۔''

''ایسی کیا آفت آن پڑی کہ جون بیٹی کو لے کر گھر سے باہر گھوم رہی ہو؟''

''بھئی کام تھا جبھی آئی ہوں۔'' اب مجھے بھی تھوڑا غصہ آگیا۔

''ٹھیک ہے گھومو پھرو۔'' یہ کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا۔

مجھے تصور کے اس رویے پر بہت دکھ ہوا۔

''مما کیا ہم کسی جیل میں رہتے ہیں جو تھوڑی دیر کے لئے بھی باہر نہیں نکل سکتے؟'' اسکی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''یہ دیکھیں کتنی عورتیں مارکیٹ میں گھوم رہی ہیں پھر بابا ہم سے الگ سلوک کیوں کرتے ہیں؟''

''چھوڑو بیٹا دل برا نہ کرو۔ وہ انکی عادت ہے۔۔ تمہیں پتہ ہے نا کہ ہم گھر سے باہر جائیں تو انہیں اچھا نہیں لگتا۔''

''لیکن مما کب تک؟ عورتیں آج کل کیا کچھ نہیں کر رہیں؟ ہر فیلڈ میں آگے ہیں وہ، ہر جگہ اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑ رہی ہیں۔ تو ہم بھی کچھ کیوں نہیں کر سکتے؟'' وہ زچ ہو کر بولی۔

میں جانتی تھی کہ یہ ذہنی الجھن اسے پریشان رکھتی ہے۔ مگر میں اسکی الجھن دور کرنے کے لئے خود کو بے بس محسوس کرتی تھی۔ ہم لوگ شاپنگ ترک کر کے جلدی گھر آگئے۔ اور عائشہ کا موڈ اچھا کرنے کے لئے میں نے اسکے لئے میکرونی بنادی اور ساتھ میں ہم ٹی وی دیکھنے لگے۔ اس وقت تصور گھر میں نہیں تھے اسلئے، ہمیں کوئی فکر نہیں تھی۔

تصور کو عائشہ کے ٹی وی دیکھنے پر بھی اعتراض تھا۔ جب کہ میٹرک میں آنے کے بعد وہ ہر وقت اپنی کلاس فیلوز سے ڈراموں کے بارے میں باتیں سنا کرتی تھی اس لئے اسے ڈرامے دیکھنے کا شوق چڑھا۔ ہم ماں بیٹی اپنے بیڈروم کے ٹی وی پر ڈرامے دیکھا کرتی تھیں۔ لاونج والے ٹی وی پر تصور ہمیشہ ٹاک شوز دیکھتے تھے۔ وہ بار بار بیڈروم میں آ کر جھانکتے رہتے تھے اور بُرا بُرا منہ بناتے۔

''میں نے تمہیں بولا ہے کہ اسے ڈرامے مت دکھایا کرو۔ ہر ڈرامہ عشقیہ ہوتا ہے اور اس سے بچی کا ذہن خراب ہوگا۔''

''جی جی! اچھا!'' میں کہہ کر چینل بدل دیتی اور ڈسکوری یا نیشنل جیوگرافک لگا دیتی۔ جب عائشہ میری اس حرکت پر چڑتی تو میں اسے یہی

کہتی تھی کہ میں نہیں چاہتی کہ کسی وجہ سے گھر کا ماحول خراب ہو۔

اس دن ایک ڈرامے کی آخری قسط آرہی تھی۔ہم دونوں بہت انہماک سے دیکھ رہے تھے۔اس لئے تصور کے آنے کا پتہ نہ چلا۔

''میں نے بولا تھا نا کہ اسے ڈرامے نہ دکھایا کرو۔'' وہ آکر دھاڑے۔

میں نے چینل بدلنا چاہا مگر عائشہ نے میرے ہاتھ سے ریموٹ لے لیا۔

''بس مما بہت ہوگیا ،میں ڈرامہ ضرور دیکھوں گی۔''

''یہ ڈرامے نصیحت آموز ہوتے ہیں ۔لڑکیاں بہت کچھ زندگی کے بارے میں سیکھتی ہیں۔'' میں نے ہمت کر کے بولا۔

''تمہیں پتہ ہے یہ عشقیہ ڈرامے ہوتے ہیں۔'' وہ برہم ہوئے۔

''کوئی عشقیہ نہیں ہوتے اور اگر ہوں عشقیہ تو یہ بھی زندگی کی حقیقت ہے۔'' میں دوبارہ بولی۔

''کیا مطلب کیا کہا تم نے؟'' وہ بری طرح اچھلے۔انہیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ میں نے کہا ہے۔

''یعنی تم اسے جائز سمجھتی ہو؟''

'میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو کہہ رہی تھی کہ یہ جذبہ بھی اس دنیا میں موجود ہے اور آپ کسی چیز کو اچھے طریقے سے کریں یا برے طریقے سے، یہ ہمارے ہاتھ میں ہوتا ہے۔''

''اچھا بس کرو۔ مجھے سکھانے کی کوشش نہ کرو۔اور بچی کے سامنے مجھے جھوٹا ثابت نہ کیا کرو۔'' انہوں نے غصے سے انگلی اٹھا کر کہا۔

انکا غصہ دیکھ کر میں خاموش ہوگئی ،ہمیشہ کی طرح میں نے کمپرومائز کرلیا تھا۔

میٹرک کرنے کے بعد عائشہ کو پھر موبائل کی ضرورت محسوس ہونے لگی اور اس دفعہ اس نے ضد پکڑلی۔

''اب تو میں بڑی ہوگئی ہوں ،اب تو بابا منع نہیں کریں گے۔ بھائیوں کو بابا نے ویسے ہی اتنے سال پہلے ہی دلوادیا تھا۔''

''بیٹا وہ لڑکے ہیں اور تم لڑکی۔'' میں نے صاف بات بولی۔

''کیا مطلب لڑکوں کے لئے سب جائز ہے اور لڑکیوں کے لئے ناجائز۔یہ کہاں کا انصاف ہے مما؟''

''بس بیٹا یہ ہمارے معاشرے کا دستور ہے۔''

''میں ایسے کسی دستور کو نہیں مانتی۔ میں خود ہی بابا سے بات کروں گی۔''

میں یہ سن کر پریشان ہوگئی، میں نہیں چاہتی تھی کہ باپ بیٹی آمنے سامنے ہوجائیں اور لحاظ ختم ہوجائے۔

اس شام تصور گھر آئے تو عائشہ انکے کمرے میں چلی گئی۔

''اوہو۔آج ہماری بیٹی ہمارے کمرے میں کیسے آگئی؟'' انہوں نے حیرانی سے بولا۔ انکا موڈ آج اچھا تھا۔''

تصور کے رویے کی وجہ سے عائشہ انکے سامنے کم ہی آتی تھی۔

''بیٹھو بیٹا۔''

لیکن عائشہ نے بیٹھنے کے بجائے کھڑے رہ کر بات کرنا ہی مناسب سمجھا اور اپنی خواہش بتا دی کہ اسے موبائل چاہئے ۔ پہلے تو مصور نہیں مانے پھر اس شرط پر مان گئے کہ اس میں سم نہیں ہوگی۔اس سے پہلے کہ عائشہ اس بات پر کوئی نیا

مسئلہ کرتی، میں نے چپکے اسکے کان میں کہہ دیا کہ میں سم لے دوں گی۔

☆......☆......☆

کالج ختم ہونے کے بعد عائشہ کا خواب تھا کہ وہ NCA میں ایڈمیشن لے۔مصور کو پتہ چلا توحسبِ توقع انہوں نے انکار کردیا۔ وہ یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے کے حق میں ہی نہیں تھے۔انکا خیال تھا کہ بس اب عائشہ کی شادی کردی جائے، مگر میں اپنی بیٹی کی ہر خواہش پوری کرنا چاہتی تھی۔ میں جانتی تھی کہ اسے فائن آرٹ سے عشق ہے، وہ بہت آگے جانا چاہتی ہے۔اور میں اسکی خواہشوں کا مزید خون ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

اس رات وہ گھر آئے تو میں نے ان سے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ کھانے کے بعد جب وہ ٹی وی کھول کر بیٹھ گئے تو میں نے بات شروع کی۔

''میں عائشہ کو انڈس ویلی میں ایڈمیشن کروانا چاہتی ہوں۔'' میرا لہجہ سخت تھا۔

''کیا مطلب؟ میرا ایک دفعہ منع کرنا کافی نہیں ہے؟'' انہوں نے تیز آواز میں کہا۔

''آپ نے ہمیشہ میرا ہر شوق مارا ہے۔ میرے ساتھ زیاتی کی، میری صلاحیتوں کا گلا گھونٹا۔ مگر میں بغیر احتجاج کیے چپ چاپ برداشت کرتی رہی کہ یہ گھر بنا رہے۔'' میں نے اپنے اندر کا غبار باہر نکالا۔

''تو کیا تم اب گھر توڑنا چاہتی ہو؟'' انہوں نے الٹی بات کی۔

''نہیں میں بس اپنی بیٹی کا پیدائشی حق مانگ رہی ہوں، اگر خدا نے اسے باصلاحیت بنایا ہے تو ہمیں نہیں چاہئے کہ اسکی صلاحیتوں کو نہ چھینیں۔ میں اپنی بیٹی کے ساتھ اپنے جیسا سلوک نہیں ہونے دوں گی۔''

''کیا مطلب؟ تم خودسری دکھاؤ گی؟''

''ہاں کیوں کہ اب میری برداشت ختم ہوگئی ہے۔''

''ٹھیک ہے تو پھر اپنا بوریا بستر باندھو اور اپنی بیٹی کو لے کر جہاں جانا چاہتی ہو چلی جاؤ۔ چار دن اس گھر کے بغیر رہو گی تو ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔'' انہوں نے بے رحمی سے کہا۔

مجھے یہ سن کر حیرت نہ ہوئی، میں ان سے ہر ظلم کی امید کرسکتی تھی۔

صبح تصور کے اٹھنے سے پہلے ہی میں نے اپنا اور عائشہ کا سامان باندھا اور لاہور چلی گئی۔ لاہور میں میرے ماں باپ کا آبائی گھر تھا۔ جو عرصے سے خالی پڑا تھا۔ میری خالہ اور خالو اس گھر کے پورشن میں رہتے تھے اور میرے امی ابو کے گھر کا خیال رکھتے تھے۔ میرے سامنے منزل بہت کڑی تھی مگر میں نہیں جانتی تھی کہ میرے اندر اس وقت اتنی ہمت کہاں سے آگئی تھی۔ بس میں اپنی بیٹی کو اپنے خواب پورے کرتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھی۔ عائشہ کا NCA میں ایڈمیشن ہوگیا تھا، مجھے اپنی بیٹی پر پورا بھروسا تھا۔ میرے پاس جو بھی جمع پونجی اور زیور تھا وہ میں نے بینک میں جمع کروادیا تھا اور پھر ڈریس ڈیزائننگ کے کام کو واپس شروع کردیا۔ گو کہ تنہا عورتوں کا یوں اکیلے رہنا آسان نہیں تھا مگر میں نے ہمت نہ ہاری۔ اور خالہ اور خالو کی وجہ سے مجھے بہت حوصلہ تھا۔ تصور اور بیٹوں نے پلٹ کر کوئی خبر نہ لی اور مجھے کوئی امید نہ تھی، مجھے اگر کسی سے امید تھی تو وہ اللہ کی ذات تھی۔

کافی عرصہ ایسے ہی گزر گیا۔ میرا کام اچھا

چلنے لگا۔ اور عائشہ کا دوسرا سال شروع ہو گیا تھا، وہ بہت خوش رہتی تھی، اپنے خوابوں کو پورا کرنے کی خوشی تھی۔

☆......☆......☆

آج مجھے بہت فخر محسوس ہو رہا تھا۔ عائشہ کو اپنی یونیورسٹی کے بہترین پینٹر کا ایوارڈ ملا تھا، تصویریں، رپورٹرز، سوالات۔ سب کچھ اتنا اچھا لگ رہا تھا اور ان سب کے بیچ میں عائشہ سر پر آف وائٹ اسکارف اور عبایا لیے بہت پراعتماد لگ رہی تھی۔ مجھے خوشی تھی کہ میری بیٹی نے میرے فیصلہ صحیح ثابت کیا تھا، اور میرا سر نہیں جھکنے دیا تھا۔ میں جانتی تھی کہ اب یہ خبر بہت سے اخباروں کی زینت بنے گی اور بہت سے لوگ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ عورتوں کو اگر صحیح پلیٹ فارم ملے تو وہ اپنا آپ منوا سکتی ہیں۔

اس دن اتوار تھا جب ملازمہ نے کسی کے آنے کی اطلاع دی۔ میں ملنے گئی تو عائشہ بھی ساتھ ساتھ آ گئی۔ سامنے تصور بیٹھے تھے۔ بہت بیمار اور ہارے ہوئے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی کروفر کے ساتھ رہنے والے تصور ہیں۔

”مجھے معاف کر دو۔ میں نے کبھی تم لوگوں کو تمہارا حق نہیں دیا۔ میری بیٹی ایک ہیرا تھی، جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے سمندر میں پھینک دیا۔ اور اب میں چاہ کر بھی اسے نہیں پا سکتا۔ میں تم لوگوں کے قابل نہیں تھا۔

میں ایک اچھا شوہر اور باپ نہ بن سکا، جبھی سب مجھے اکیلا چھوڑ گئے۔ عالیان امریکا سے ایک بار پلٹ کر نہیں آیا اور ریان اپنی بیوی کے ساتھ اسلام آباد میں جا کر رہنے لگا۔ پچھتاوے کے احساس نے مجھے ذہنی طور پر ختم کر دیا۔ میں کبھی عورتوں کی عزت نہ کر سکا، ہمیشہ انہیں انسان سے بھی کم تر سمجھا۔ مگر تم لوگوں نے ثابت کر دیا کہ عورتیں کوئی کم تر مخلوق نہیں ہیں۔ عورتوں کے بارے میں میرے نظریے کو بدل کر رکھ دیا۔ خدارا مجھے دل سے معاف کر دو۔“ وہ ہاتھ جوڑے کھڑے تھے۔

”آپ کو احساس ہو گیا، یہی کافی ہے۔ میں نے کبھی نہیں چاہا تھا کہ آپ اس حال تک پہنچے، نہ کبھی ایسی دعا کی۔ میں بس چاہتی تھی کہ اب اپنی بیٹی کے حقوق پورے کر دیں، میں نے خود تو دل پر پتھر رکھ کر گزارا کر لیا تھا مگر میں ممتا کے سامنے ہار گئی۔ میں اپنی بیٹی کو ٹوٹتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ایک فیصلہ میری زندگی بدل گیا۔ ایک مرد کے ساتھ کی قربانی دے کر عورت کو پہچان دینے کی کوشش کہیں نہ کہیں تو کامیاب رہی ہے۔“

”تم لوگ اب میرے ساتھ چلو، میں تم لوگوں کے سارے حقوق پورے کروں گا۔ کوئی کمی نہیں آنے دوں گا۔“

”معاف کیجیے گا تصور صاحب مگر یہ اب ممکن نہیں ہے۔ ہم عورتیں اتنی بے مول نہیں ہیں کہ آپ جب دل چاہیں اپنی زندگی سے نکال دیں اور جب دل چاہے لے آئیں۔ میں آپ کی یہ خواہش پوری نہیں کر سکتی۔ ہاں مگر آپ جب چاہیں اپنی بیٹی سے ملنے آ سکتے ہیں۔ میں باپ بیٹی کے بیچ میں کوئی دیوار نہیں بنوں گی۔“ میں کہہ کر اندر چلی گئی۔ میں جانتی تھی کہ میں اس وقت زیادتی کر رہی ہوں۔ عورت ہمیشہ مرد کی ہر کوتاہی کو معاف کر دیتی ہے کیونکہ اس دل موم کا ہوتا ہے مگر اس موم کو پگھلنے میں کچھ وقت لگتا تھا، کبھی بہت زیادہ اور کبھی بہت کم۔ اور میں نہیں جانتی تھی کہ میرا دل پگھلنے میں کتنا وقت لے گا۔

☆☆......☆☆

ڈیرہ غازی خان سے ارسال کردہ تحریر

مان ٹوٹ گیا

وہ بھی اس حسینہ کی زلفوں کا اسیر تھا......مگر اپنوں کو

حقیر سمجھنے والوں کا انجام ہمیشہ برا ہی ہوتا ہے......

ایم یعقوب احمدانی بلوچ

میرا نام ابوبکر یونس ہے میں ضلع بہاول لنگر تحصیل منچن آباد سے تعلق رکھتا ہوں۔ آج اپنا گزرا وقت یاد کر کے اپنے آپ پر دکھ ہوا ہے کہ میں کیا کر بیٹھا اپنے آپ سے، میں نے مڈل کلاس کے گھرانے میں آنکھ، شاید میں......؟ ایک ٹھنڈی آہ دل کو چیر کر چھلنی کر دیا۔

اللہ پاک کا کرم تھا کہ وقت سے پہلے وقت کی روٹی مل جاتی۔ باقی سب ہر کسی کا اپنا نصیب ہوتا ہے کوئی امیر تو کوئی غریب وقت کا بے رحم پہیہ درد ناک اذیت دیتا ہوا اپنی سانت پر گامزن رہا جب میں پانچ سال کا ہوا تو مجھے آبائی گاؤں تحصیل منچن آباد پرائمری ہائی اسکول اپنے کزن خالد یوسف کے ساتھ داخل کرا دیا۔ ہماری زیادہ زمین نہیں تھی۔

دو ایکڑ ٹھیکے پر لے کر ابو کاشت کرتے اور گھر کے اخراجات پورے کرتے، میں اکثر اسکول نہ جاتا میرا دل نہیں لگتا تھا پڑھائی میں، اسکول سے میرا نام خارج ہو گیا۔

اس دوران میرا بھائی پیدا ہوا ابو معاویہ یونس، میں سارا دن آوارہ گردی کرتا کبھی شہر تو کبھی چوک، دکان ہوٹل، بازار میری چند آوارہ لڑکوں سے گہری دوستی ہو گئی۔ اور اپنا گروہ بنا لیا۔ جب محلے کے لوگ سو جاتے آدھی رات کو ہم سب کسی کا نلکا، کسی کا پنکھا کسی کی بجلی کی تار والی پانی والی موٹر، یعنی حد ہی کراس کر گئے اب تو گھر میں ڈکیتی بھی ڈالنے لگے۔

آہستہ آہستہ ہماری کارکردگی کا پتہ چلنے لگا۔ کئی بار پکڑے بھی گئے خوب ڈنڈوں سے خدمت ہوتی مگر باز نہ آتے۔ میرا چھوٹا بھائی ابو معاویہ بھی اسکول جانے لگا تھا۔ ابو معاویہ بہت شرارتی تھا۔ ہر روز اسکول میں اپنی حرکتوں سے باز نہ آتا۔

میرے ماموں نے خالد اور ابو معاویہ کے ساتھ مجھے پھر سے چھٹی جماعت کا داخلہ کرا دیا مگر جب استاد صاحب کے پاس گئے تو انہوں نے ہاتھ جوڑ لیے اور کہا۔

''ہم پہلے سے ابو معاویہ سے تنگ ہیں۔'' ہم واپس آ گئے کچھ ماہ بعد ابو معاویہ اور خالد یوسف نے بھی اسکول چھوڑ دیا۔ میں نے پھر سے محلے والوں کی خدمت کرنی شروع کر دی۔ کبھی بوڑھے ابا کے بارے میں نہ سوچا کہ وہ پانی' بوائی' کٹائی ہل کیسے چلاتے ہیں کھیتوں میں سارا دن کیسے کڑی دھوپ میں پسینے سے شرابور ہوتے ہیں اور کیسے خرچہ پورا کر کے دو وقت کا نوالہ ہمارے منہ میں ڈالتے ہیں اور امی سارا دن کپڑے سلائی کر کے ایک ایک روپیہ جوڑتی ہیں میری دو بہنیں بھی پیدا ہو چکی تھیں۔

مگر مجھے کسی بات کی پرواہ نہیں تھی۔ بس ایک بات ذہن نشین تھی رات کو بھینس چوری کرو اور پورا مہینہ عیش کرو' کڑھائی' بریانی' سوپ' کاٹن کے کپڑے اور آوارہ گردی' دو تین بار اللہ کے حکم سے جیل بھی ہو کے آئے۔

مگر باز نہ آئے ایک دن ماموں نے تنگ آ کر مجھے سمجھایا۔

''اگر تم اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو مجھے کچھ اور کرنا پڑے گا۔'' میں ماموں کی بہت عزت کرتا تھا اپنے گھر والوں کی ایک نہ سنی تھی مگر ماموں میرے لیے بہت قابل احترام تھے۔ ماموں نے مجھے اپنے دوست کے ہاں کام دلوایا۔ ہمارے گھر سے تین کلومیٹر دور میں ہوٹل پر گیا سارا دن لوگوں کے جھوٹے برتن اٹھاتا اور ان کو صاف کرتا' ٹیبل صاف کر کے پانی کا جگ رکھتا اور



آنے والے گاہک سے آرڈر لیتا۔ پہلے پہل میری تنخواہ چار ہزار مقرر تھی۔ جب میں ہوٹل پر آیا تو میرا گروہ بھی کبھی کبھار آجاتا۔ اور میں فری میں ان کو کھانا کھلاتا' میرے مالک محمد افضل بہت شریف انسان تھے۔

وہ دو بھائی تھے محمد افضل اور محمد صغیر احمد اکٹھے رہائش پذیر تھے۔ رات کو دیر تک ہوٹل کھلا رہتا اور صبح سویرے اٹھ کر مالک محمد افضل گھر جاتا۔ وہاں سے پیسے لیا اور سبزی منڈی جاتا۔ میں گھر والوں اور ماموں کی نظروں میں اچھا دکھنے لگا مگر میں اندر سے پہلے جیسا تھا۔

کبھی کبھار رات کو دوست آجاتے اور ہم شراب سپلائی کرتے اور راہ چلتے مسافر کو پستول دکھا کر بٹوا سائیکل وغیرہ چھین لیتے۔ اسی طرح کئی ماہ گزر گئے کبھی امی ابو بہنیں بھائی سے مل آیا کرتا مگر ایک روپیہ بھی نہ دیتا اس وقت میں کافی سمجھدار تھا۔ مگر اتنا عقل مند نہیں تھا کہ صحیح کر رہا ہوں یا غلط' اگر کوئی کہتا۔

''ابوبکر تم غلط کر رہے ہو تو وہ میرا دشمن بن جاتا۔'' وقت سب کچھ سکھا دیتا اس کائنات روح پر کوئی وقت سے بڑا استاد نہیں' ہوٹل مالک محمد افضل کے گھر آتے جاتے ایک چہرہ بے حد خوبصورت لگنے لگا۔

میرا اچھا وقت شروع ہونے لگا یہ پھر برے سے برا آج تک پتہ نہ چل سکا۔ پل بھر میں زندگی نے اس راہ پر لا کھڑا کر دیا دکھ درد' غم' آنسو' شام و ہجر و تنہائی میں غوطہ زن کر دیا اب نکلنے کے لیے کوئی راہ نظر نہیں آتی' کبھی کبھار انسان ایسے کٹھن دشوار راستوں پر چلنے پر مجبور ہو جاتا ہے واپسی ناممکن لگتی ہے انسان ختم ہو جاتا ہے مگر دشواری منزل ختم نہیں ہوتی' وہ کمال کی دوشیزہ تھی اس کا نام رابعہ تھا۔ اس کی عمر بارہ سے تیرہ سال ہوگی نہم جماعت کی طالبہ تھی جب وہ چاند سے مکھڑے پر نقاب کر کے اسکول جاتی تو دل کو پل بھر میں اپنی طرف مائل کر دیتی۔

بہت لاجواب قدرتی حسن کا شاہکار جوبن جوانی کی لہر سے انگ انگ میں ناز و نخرے کمزور سنگ مرمر جیسا تراشا گورا بدن جھیل نما بڑی آنکھیں درمیانہ قد گلابی گال وہ لڑکی کم پری زیادہ لگتی تھی۔ جب وائٹ سوٹ تن زیب ہوتا آسمانی مخلوق لگتی۔ کبھی محمد افضل کے گھر سے سالن کی کال آجاتی اور محمد افضل سالن اور روٹی پارسل کر دیتا اور کہتا۔

''ابوبکر بیٹا یہ گھر دے آؤ۔'' میں بائیک لے کر گھر گیا دروازے پر دستک دی۔ اندر سے آواز آئی۔

''رابعہ بیٹا دیکھو دروازے پر کون ہے۔'' رابعہ تیز قدموں سے بھاگی اور دروازہ کھولا تو میں تھا سامنے' وہ میرے سامنے تھی تیز بھاگی سانس پھولی ہوئی تھی اس کی حالت سے معلوم ہوتا کہ کوئی برسوں سے میری راہ دیکھ رہی ہو ...... خیر......

''یہ لو رابعہ جی کھانا۔'' وہ شاپر پکڑنے لگی تو اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں آگیا موم جیسی کوئل کا نرم و نازک ہاتھ جی مچل اٹھا بدن میں سرسری ہونے لگی۔

آج پہلی مرتبہ کسی پری کا ہاتھ میرے جسم پر لگا تھا کیا جادو تھا کیا اس کا نشہ تھا دل کے ارمان بیدار ہونے لگے آنکھوں میں محبت کا جنون نظر آنے لگا۔ ایسا دل چاہنے لگا یہ ہاتھ مرتے دم تک ایسے ہی ہاتھ پر رہے اتنے میں رابعہ کی امی آگئیں۔ جلدی سے رابعہ ہاتھ میں کھانا لے کر مڑ

گئی۔

''آؤ بیٹا ابوبکر پانی وغیرہ پی لو......''

''نہیں امی ابھی میں جلدی میں ہوں۔'' میں آ گیا واپس بار بار وہ مہ جبیں کا ہیرے جیسا چہرہ بار بار ہاتھ پر ہاتھ رکھنا آنکھوں میں نظر آ رہا تھا۔ واقعی میں اس کا طلب گار تھا یا میرا وہم تھا سمجھنے سے قاصر تھا۔ ہر ماہ کی پے آوارہ دوستوں میں ختم کر دیتا۔

مجھے کبھی بوڑھے ابو اور امی پر ترس نہ آیا کہ اب گھر کے افراد کے ساتھ ساتھ خرچہ بھی بہت بڑھ گیا تھا۔ معاویہ بچہ تھا اس وہ بھی میری طرح کوئی کام نہ کرتا مہنگائی نے وقت سے پہلے ابو امی کے ماتھے پر کئی بل ڈال دیے تھے۔ ایک دن محمد افضل نے کہا۔

''ابوبکر بیٹا اسکول سے چھٹی ہونے والی ہے تم بائیک پر جاؤ اور رابعہ کو لے کر آؤ۔'' مجھے بہت خوشی ہوئی اندھا کیا چاہے دو آنکھیں جو مجھے مل گئیں تھیں رابعہ کی صورت میں ایک موقع چاہیے تھا جو مل گیا تھا میں جلدی سے اسکول کے گیٹ پر تھا اس مہ جبیں دیوی کا انتظار تھا جو میرے سامنے تھی۔

''ابوبکر تم یہاں......''

''جی رابعہ آؤ میں تمہیں لینے آیا ہوں۔''

رابعہ بہت خوش ہوئی شاید وہ بھی موقع کی تلاش میں تھی۔ جو آج قدرت نے نوازا تھا۔ میں بات کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ بہت سی باتیں کر رہی تھی۔ دل کی بات کیسے دل سے کہوں دو زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ بائیک بڑے پیار سے روڈ پر گامزن تھی۔ آخر کہنے لگا۔

''مجھے کچھ کہنا تھا آپ سے......'' رابعہ نے کہا۔

''جی کہو کیا بات ہے؟''

''رابعہ آپ بہت اچھی لگتی ہو مجھے......''

''واقعی۔'' رابعہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ جیسے وہ یہ سننے کے لیے صدیوں سے بے قرار تھی۔

''ابوبکر میں بھی یہ کہنا چاہتی تھی کب سے مگر زبان میرے لفظوں کو ترتیب نہ دے سکی' بہت اچھا لگا تم نے ہی میرے لفظوں میں آسانی پیدا کر دی تھینکس......'' میں بہت خوش ہوا ہماری چاہت کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ ہر روز وعدے قسمیں کھاتے آہ قسمت کتنی بری تھی کہ ملنے سے پہلے ہی جدا کر دیا میں ہر روز اسے نئے سے نئے گفٹ دیتا۔ میں رات کی تنہائی سے بہت چور چور ہوتا اسے موبائل گفٹ کیا اس نے میری خاطر میرا ہر گفٹ تسلیم کیا۔ یوں رات کو ہم الفت کی وادی میں نئے جذبے خواب بنتے ایک پل بھی جدا نہ رہ پاتے میرا ایک ساتھی ہم راز ماموں کا بیٹا جانی دوست ابوذر غفاری تھا۔

میرے منہ پر میرا تھا مگر میری ہر بات میرے گھر والوں اور میرے ماموں کو بتا تا جب میں گھر جاتا تو خوب دھلائی ہوتی۔

''وہ کون ہے کیوں کرتے ہو یہ سب جس سے ذلت ہور سوائی ہو۔'' مگر میں نے سب کو کہا۔

''سب بکواس ہے جھوٹ ہے۔'' ابوذر قسم کھا کر کہتا میں نے کسی سے نہیں کہا۔ میرے گھر والوں کو مجھ پر شک ہو گیا میرا کام چھوڑا رہے تھے۔

مگر میرے مالک محمد افضل میرے کام سے بہت خوش تھے اپنا بیٹا سمجھا تھا انہوں نے...... ہم محبت کی راہ میں بہت دور نکل چکے تھے۔ راتوں کو ایک دوسرے سے ملنا جلنا ساتھ سونا اٹھنا ہر حد پار

کر چکے تھے اب اور ایک حد تھی دنیا کی حد......
رابعہ نے فیصلہ کیا۔

''ہمیں ایک نہیں ہونے دیں گے یہاں سے کہیں دور چلتے ہیں جہاں کوئی نہ پابند کر سکے ملنے دیکھنے سے۔'' میں بھی اتنی شدت سے اس کی زلفوں کی مستانی خوشبو میں گرفتار تھا اس کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ یہ بھی نہ سوچا پھر کیا حال ہوگا ہم بہاولنگر سے لاہور آ گئے رابعہ کی بیسٹ دوست عارفہ کے پاس جو رابعہ کی خالہ زاد تھی۔ ابوبکر نے کام کرنا شروع کر دیا۔ اور رات کو آ جاتا۔ اس طرح محبت پروان چڑھتی رہی بہت دن ہو گئے تھے رابعہ نے کہا۔

''کورٹ میرج کر لیتے ہیں۔'' میں بھی سوچنے لگا مگر انجام سے بے خبر تھا۔ کیا ہونا تھا دنیا نے کیا کرنا ہے اور میری قسمت میرا نصیب میرے ساتھ کیا کھیل کھیلتا ہے۔ میں شام کو ایک وکیل سے بات کر کے عارفہ کے گھر آیا تو عارفہ نے پہلے سے غم زدہ پریشان سوگ نما ماحول بنایا ہوا تھا۔

''خیر ہے آپی کیا ہوا۔''

''ابوبکر بھائی......وہ......وہ......رابعہ......''

''کیا ہوا رابعہ کو؟'' میں بہت پریشان ہو گیا۔ عارفہ کا رنگ فق ہو گیا تھا مجھے ایسا لگنے لگا

''کسی آفت نے آ گھیرا ہے رابعہ کو جلدی سے عارفہ نے بات مکمل کی۔

''رابعہ کے گھر والے رابعہ کو ڈھونڈتے ہوئے یہاں آئے اور رابعہ کو اپنے ساتھ لے کر گئے ہیں۔'' میرا سر چکرانے لگا میں وہیں دہلیز پر ڈھیر ہو گیا۔

اِدھر گھر والوں کی کوئی سدھ بدھ نہ تھی وہ کیسے اور کس حال میں ہیں۔ بس اپنی اور اپنے پاگل دل کی چاہت کو لیے سرِشام دربدر کی ٹھوکریں کھاتا رہا۔ وہ ہو گیا تھا جو میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا میرا گھر میرے بغیر کیسے ویران ہے میرے اپنے مجھ سے کیا امیدیں لگائے بیٹھے ہیں اور میں کس راہ پر ہوں نہ جس کی منزل نہ کوئی آسان راہ، میں کتنا بدقسمت انسان ہوں، کبھی اپنے گریبان میں جھانکا تک نہیں کبھی نسوں میں دوڑتا خون اپنوں کی خوشبو لاج تک نہ رکھ سکا۔ اِدھر میری میت کا جنازہ نکل چکا تھا رابعہ کے گھر جانے کے بعد میری خوشحال زندگی کھنڈر بن گئی۔

آس، بھرم، امید، مان ٹوٹ گیا رابعہ کی زبردستی منگنی کر دی مگر رابعہ نے قبول نہ کیا اپنی ضد پر آ گئی۔ رابعہ کے گھر والے رابعہ کے کزن شاہد سے منگنی کرنے لگے تو رابعہ نے انکار کر دیا اور دھمکی دی مگر کسی نے ایک نہ سنی رابعہ نے زہر کھا لیا اور مجھے تڑپنے کے لیے اکیلا چھوڑ گئی۔ معصوم یادوں کے سہارے چرس افیون کے نشے کی لت میں پڑ گیا۔ دنیا کی فکر رنج و غم بھول گیا۔ کیا تھا کیا بن گیا ہوں۔ کتنی بہاریں آئی کتنے دسمبر گزرے کوئی پتہ نہیں چلا۔ میں کسی رشتے دار کے ذریعے گھر پہنچا تو میری حالت پر ہر اشک آبیدہ تھی۔ امی بھائی بہنیں اور ابو بس ابو نے بہتے اشک صاف کرتے ہوئے کہا۔

''ابوبکر بیٹا بس مان ٹوٹ گیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے منہ موڑ لیا بوڑھے کاندھوں کا بوجھ مستقبل کی خوشحالی پرسکون زندگی سنوارنے کے خواب بنے تھے کیا سوچا تھا آج آہ چرسی موالی بن کر ہمارے سامنے کھڑا ہے امی مستقبل اور ماضی کا تھپڑ رسید کرتی ہوئی منہ پھیر کر بیٹھ گئیں۔

☆☆......☆☆

سلسلے وار ناول

ایک نہایت ہی منفرد، دلچسپ پُراسرار سلسلہ جسے آپ عرصۂ دراز تک یاد رکھیں گے

املتاس

علامہ سید اجتبیٰ حسین رضوی کا خیال

اس دل کا تحیر تھا آئینہ' اس سر کا تصور تھا موقلم
تمثال پہ نقطے لگا کیے' تصویر بدلتی چلی گئی

(قسط نمبر 12)

شازی سعید مغل

کمرے کا گوشہ گوشہ تیز بدبو سے بھر گیا۔ یہ ایک ایسی خاص قسم کی بدبو تھی جو ایک شیطانی جسم کے لیے مخصوص سمجھی جاتی ہے۔ نگار سنبھل کر بیٹھ گئی۔

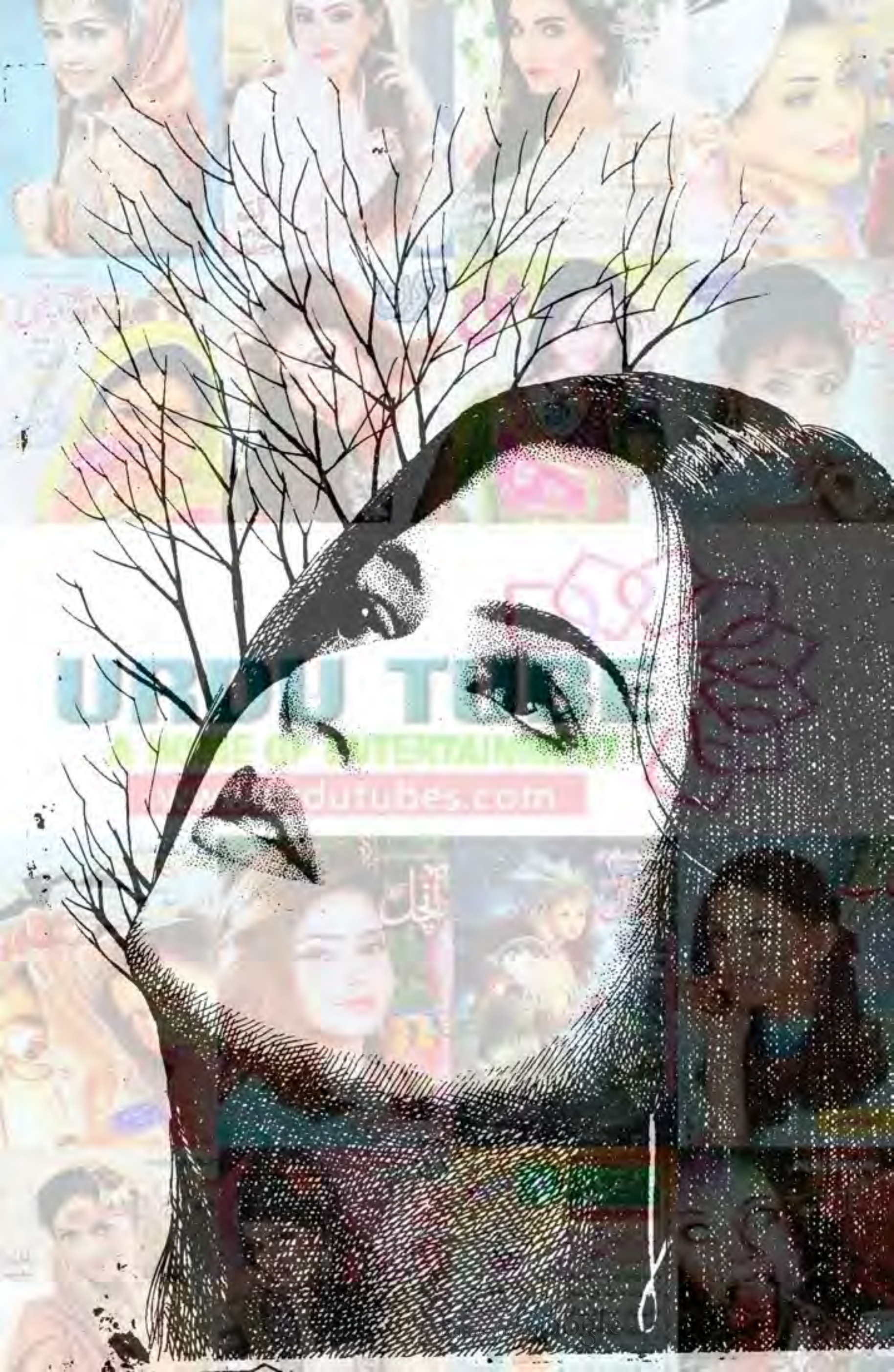
ابھی وہ اپنا مدعا بیان کرتی کہ وہ ہوا جس کی اسے امید نہ تھی۔ یکا یک اس عفریت کی غضبناک ترچھی آنکھوں سے سرخ آتشیں شعاعیں پھوٹتی ہوئی معلوم ہوئیں اور...... تیز رفتار خیالات کے جھونکوں میں لڑکھڑاتا ہوا اس کا دل اسے اپنی کنپٹیوں پر دھڑکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ نگار ایسی عورت ہرگز نہ تھی کہ وہ اپنے کسی عمل یا فیصلے پر بغیر سوچے سمجھے عمل کرے۔

لیکن اپنی زندگی میں یہ پہلی بار تھا کہ وہ اپنی حماقت پر خود کو دل ہی دل میں ملامت کر رہی تھی کہ کس منحوس گھڑی میں وہ اس آسیبی قبیلے کے اس منصوبے کا حصہ بنی۔ ہر چند کہ نگار کو بھی اس سلسلے کے کامیاب ہونے کے بعد اپنی مرضی سے جینے مرنے کی آزادی حاصل ہوتی وہ جب تک چاہتی اس دنیا میں رہ سکتی تھی ۔لیکن اس وقت جس صورت حال سے وہ نبرد آزما تھی اس نے اس پر خوب اچھی طرح آشکار کر دیا تھا کہ وہ اب تک کے اس کے سحر و جادو کے تمام تر کامیاب تجربات کے باوجود اس سلسلے میں اس نے چوک کر دی ہے یا کرنے جا رہی ہے۔

تمام ممکن انتظامات کر لینے کے باوجود اسے ایک شدید قلبی اذیت کا سامنا ہو رہا تھا۔ اس طرح تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا اپنے حواس بحال کرتے ہوئے اُس نے اپنے منتروں کا رخ الٹ دیا۔ منتروں کا رخ اُلٹتے ہی خوفناک آسیبی شکل سے چیخ نما آواز برآمد ہوئی۔

''کیا کر رہی ہے؟''

''میں کیا کر رہی ہوں...... تو مجھ سے کیسے یہ سوال کر سکتا ہے؟ تو یہاں کیا کر رہا ہے تو گیا کیوں نہیں...... میرے کام میں مداخلت کرنے کی تجھے ہمت کیسے ہوئی؟'' نگار کی آواز کی گونج ابھی کمرے میں



ہی گونج رہی تھی کہ اس کے جواب میں یکا یک ایک دل دوز چیخ کمرے میں گونج گئی جس میں ایک خوفناک غیظ وغضب تھا۔ جیسے کسی وحشی جانور کو دہکتے ہوئے انگاروں میں ڈال دیا گیا ہو۔
اس ہولناک چیخ نے رات کی تاریکی کو پارہ پارہ کر دیا۔ روشنی ایک بار پھر جھلملائی اور پھر غائب ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی خاص قسم کی بدبو جو کمرے میں براجمان تھی وہ بھی رخصت ہوگئی۔ نگار نے منتر مکمل کیے اور کمرے سے باہر آ گئی۔
اس وقت بہت نقاہت محسوس کر رہی تھی خود کو گھسیٹتے ہوئے اپنے بیڈ روم تک لائی اور بیڈ پر ڈھے سی گئی۔

☆......☆......☆

صبح سے فائزہ نے سارا گھر اُلٹا ہوا تھا ہر کمرے کی ہر الماری ہر دراز اُلٹ کر دیکھ لی تھی ایک ایک کونہ چھان مارا تھا مگر اسے وہ 'بلینک چیک' نہ ملنا تھا نہ ملا...... فائزہ بے حد پریشان تھی جمن دادا نے بھی کئی بار آ کر اس کی مدد کرائی مگر بے سود رہا۔
صبح اس کا ارادہ تھا کہ دیر تک سوئے گا کیونکہ رات بہت پریشان رہا تھا طبیعت پر عجیب بے کلی طاری رہی تھی اس وقت بھی گہری نیند میں تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی دروازہ بند نہ تھا اس لیے جمن دادا کمرے میں آ گئے۔
اس کو بے خبر سوتا دیکھ کر پہلے تو انہوں نے سوچا کہ واپس چلے جائیں کچھ دیر اورنگزیب کو دیکھتے رہے مگر اس کا اٹھنا بھی بہت ضروری ہے انہوں نے یہ خود کلامی کے انداز میں کہتے ہوئے دھیرے سے اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ چند لمحوں بعد اورنگزیب اپنی آنکھوں پر جمن دادا کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کر کے جاگ گیا نیند میں بھری سرخ سرخ آنکھوں سے دادا کی طرف دیکھا۔
''خیریت ہے جمن دادا......؟'' اس نے پوچھا۔
''خیریت ہی تو نہیں ہے بیٹا...... تمہاری ماں صبح سے ہلکان ہو رہی ہے سارا گھر اُلٹا کر کے رکھا ہوا ہے۔ مگر وہ نہیں ملا......'' اورنگزیب جمن دادا کی مبہم باتوں کو سمجھ نہیں پایا۔
''کیا نہیں ملا دادا؟'' اورنگزیب انجانے احساس کے تحت اسپرنگ کی طرح اچھل کر کھڑا ہو گیا جلدی جلدی سلیپرز پیر میں ڈالے اور باہر کی جانب دوڑ لگا دی۔
''ارے بھائی منہ ہاتھ تو دھو لو کہاں جا رہے ہو سرپٹ......'' جمن دادا پیچھے سے آواز لگاتے چلے آ رہے تھے۔ فائزہ اپنے کمرے کو از سر نو چیک کر رہی تھی۔
''امی کیا تلاش کر رہی ہیں۔'' اورنگزیب فائزہ کے سر پر پہنچ چکا تھا کمرے کی حالت زار اسے بتا رہی تھی کہ کھونے والی چیز کی نوعیت کیا ہے۔ فائزہ الماری میں سر دیے کھڑی تھی اورنگزیب کی آواز سن کر تیزی سے پلٹی۔
''تم اٹھ گئے اورنگزیب؟ تم بھی اپنا کمرہ چیک کرو...... مگر نہیں میں چلتی ہوں تمہارے ساتھ اللہ کرے تمہارے کمرے میں مل جائے۔'' فائزہ کے پریشان چہرے پر ایک امید کی کرن پھوٹتی ہوئی نظر آئی۔ فائزہ اورنگزیب کے کمرے کی طرف دوڑی۔
''آپ بتائیں گی کیا کھو گیا ہے اور میرے کمرے میں کیا مل جائے گا؟'' اورنگزیب فائزہ کے پیچھے لپکا

فائزہ سنی ان سنی کرتے کمرے میں داخل ہوئی اور سیدھا اس کی ڈریسنگ ٹیبل کی طرف گئی تھوڑی دیر میں ایک ایک چیز چھان لی جمن دادا پہلے ہی الماری کے کپڑے زمین پر ڈھیر کر چکے تھے اور اب دوبارہ الماری میں رکھ رہے تھے اورنگزیب دروازے میں ساکت کھڑا سب دیکھ رہا تھا۔

''امی آپ کو چیک کہیں بھی نہیں ملے گا...... وہ ہے ہی نہیں کہیں......'' اورنگزیب کو اپنی آواز بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔

''چیک ڈھونڈ رہی ہیں نا آپ؟''

''ہاں مگر میں نے تو تمہیں نہیں بتایا کہ میں چیک تلاش کر رہی ہوں۔'' فائزہ سر پکڑ کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اورنگزیب بھی میکانکی انداز میں چلتا سامنے رکھی کرسی پر گر سا گیا۔

''مجھے معلوم ہے اور کیوں معلوم ہے امی مجھے نہیں پتہ مجھے لگتا تھا ایسا ہی کچھ ہوگا۔ سب کچھ بہت عجیب سا ہے بہت دنوں سے......'' اورنگزیب کے گہرے اسرار بھرے لہجے پر فائزہ چونک اٹھی۔

''کیا بات ہے اورنگزیب...... تمہیں معلوم تھا یہ سب ہوگا؟'' فائزہ کے لہجے میں تشویش ہی تشویش تھی۔

''امی......'' اورنگزیب نے ایک گہری سانس لی۔

''آپ چھوڑیں یہ بات کھو گیا تو کھو گیا چیک...... پریشان مت ہوں۔''

''کیسے؟ کیسے پریشان نہ ہوں میں...... تمہاری پہلی کمائی تمہاری امانت...... مگر میں نے تو بہت حفاظت سے رکھا تھا اور جہاں باقی چیزیں رکھتی ہوں سب موجود ہے حتیٰ کہ ایک چھوٹی سی سیفٹی پن بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوئی مگر چیک...... جیسے اُڑن چھو ہو گیا ہے ہو جیسے......''

''ارے بیٹا کبھی کبھی نظر کا دھوکہ بھی ہو جاتا ہے چیز سامنے ہو اور نظر نہیں آتی رک جاؤ تھوڑا وقت تمہیں

مل جائے گا۔'' جمن دادا نے اپنی دانست میں تسلی دی۔

''امی دادا ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ اتنی پریشان مت ہوں مل جائے گا۔'' اورنگزیب نے ماں سے تو یہ کہہ دیا اور سچی بات بھی یہی تھی کہ اسے اُس چیک کی نہ کوئی خاص خوشی محسوس ہوئی تھی اور نہ کھونے کا دکھ مگر اسے ایک ایسے محاذ کا خوف تھا جو اُسے آگے درپیش تھا۔

وہ تھے اس کے دوست نہ جانے کون سی گھڑی تھی اس نے جوش میں آکر فیصل کو اپنی اس پہلی کامیابی کے بارے میں بتا ڈالا تھا اور آج شام فیصل...... ذوہیب اور سمیہ کے ساتھ آنے والا تھا دوستوں کے پرزور اصرار پر شام کو گھر پر ہی ٹریٹ رکھی گئی تھی اور نگزیب سے زیادہ تو فائزہ اس ٹریٹ کی روح رواں تھی اسی نے اورنگزیب کو کہا تھا کہ وہ اپنی اس کامیابی کو دوستوں سے شیئر کرے' تینوں تھے ہی بچپن کے دوست اور ایک دوسرے کی چھوٹی بڑی خوشیوں میں اسی طرح شریک ہوتے تھے۔ ان کے لیے یہ تو ایک بڑی کامیابی تھی ان کا دوست ایک نامور آرٹسٹ بننے جا رہا تھا۔

چنانچہ فیصل کو کہہ کر اس نے سب کو شام کی چائے پر مدعو کرلیا تھا۔ اُسے اس وقت صرف یہی ایک فکر دامن گیر تھی کہ اپنے دوستوں کے سامنے بے عزتی سے کیسے بچا جائے۔ کافی دیر اسی ادھیڑ بن میں رہا پھر خیال کی ایک لہر اُسے مطمئن کرگئی۔

ادھر فائزہ نے بھی چیک کی گمشدگی کو بالائے طاق رکھ کر ٹریٹ کا اچھا انتظام کر ڈالا تھا۔ چیک ملے نہ ملے یہ اس کے بیٹے کی پہلی کامیابی ضرور تھی۔ یہی سوچ کر اس نے سارے خیالات دماغ سے جھٹک کر اورنگزیب کے دوستوں کے لیے کھانے کا اہتمام کیا تھا۔

ویسے بھی جب تینوں دوست اورنگزیب کے گھر جمع ہوتے تو وہ ان کی من پسند غذاؤں سے اپنے دستر خوان کو بھر دیتا پھر وہ دستر خوان پر اس طرح حملہ آور ہوتے جیسے کئی سال تک اسی شکار کے انتظار میں اپنے دانت تیز کرتے رہے ہیں۔

اب بھی انہوں نے انتہائی جوش و خروش کے ساتھ ہر ایک ڈش سے انصاف کیا تھا۔ غذاؤں کو اپنے اپنے معدے میں منتقل کرنے کا کارنامہ سرانجام دینے کے بعد وہ خوشبودار قہوے کی چسکیاں لے رہے تھے۔

اورنگزیب گردن جھکائے کسی غیر مرئی نقطے پر نظر جمائے ہوئے چیک کی گمشدگی اور تصویر کی واپسی کے بارے میں سوچ رہا تھا اس نے وہ پینٹنگ کا ذکر دوستوں سے کر دیا تھا کیونکہ جس رات اسے فروخت کی ہوئی پینٹنگ کا شائبہ اپنے کمرے میں دوبارہ ہوا تھا وہ ایک حقیقت تھی فرق اتنا تھا کہ تصویر میں پتھر پر پیٹھ موڑ کر بیٹھی ہوئی لڑکی کی جگہ اس دریائی پتھر پر املتاس کے زرد پھول بکھرے پڑے تھے۔ اورنگزیب فیصل نے اسے سوچ میں غرق بیٹھا دیکھ کر پکارا تو اس کا استغراق ٹوٹا۔

''ہاں......'' اس نے خالی خالی آنکھوں سے فیصل کی جانب دیکھا۔

''اورنگزیب تم چیک کھونے کی وجہ سے زیادہ پریشان ہو یا کہ تصویر کی تبدیلی کی وجہ سے؟'' ذوہیب سمیر سے اپنی دھن میں پیچ لڑا رہا تھا اسی انداز میں اس نے اورنگزیب سے مذاق کیا۔

''اوہ یار یہ مذاق کا مقام نہیں ہے میں تمہیں راستے میں کافی کچھ بتا بھی چکا ہوں' میری محنت ضائع ہوگئی۔'' اورنگزیب نے ذوہیب کی سنی اَن سنی کرتے ہوئے کہا۔

"کچھ ضائع نہیں ہوا ہے تم ایسی ہزار ہا تصاویر ساری زندگی بناتے رہو گے یار بہر حال تمہاری تصویر مل گئی ہے واپس چیک غائب ہو گیا' جو لے کر گئے تھے ان کا حال احوال خراب ہو چکا ہے مجھے دکھ ہے تم اتنے دن سے یہ سب اکیلے کیوں جھیل رہے تھے؟ ایک بار بھی نہیں کہا شاید یہاں تک نہ آتے؟" فیصل کے لہجے میں محبت بول رہی تھی۔

"شکوہ مت سمجھنا ہاں اس کو......"

"نہیں یار مجھے پتہ تھا ایک بار تم کہو گے یہ...... مجھے معلوم تھا پریشان ہو گے میں نے بہت بار بہت بار کوشش کی مگر بہت تیزی سے حالات وقوعہ پذیر ہو رہے تھے۔"

"درست کہہ رہے ہو دوست......" فیصل نے کہا۔

"واقعی تمہارے ساتھ ہونے والے حالات و واقعات بے حد انوکھے ہیں۔ آسیبی چکر ہے کوئی۔" سمیر نے کہا۔

"یا جنات کی کارستانی......"

"نہیں......" فیصل نے کہا۔

"اس سے بھی زیادہ ہو سکتا ہے یا ملا جلا......"

"یہ کوئی پُراسرار قوت ہے۔" اورنگزیب نے کہا۔

"میں محسوس کرتا ہوں کوئی قوت ہے۔"

"ہاں تو جادو ٹونہ' سحر اسرار جنات آسیب یہ پُراسرار قوتیں ہی ہیں نہایت پُراسرار عجیب وغریب' حیرت انگیز' ناقابل فہم اور ناقابل یقین...... دنیا نے بہت ترقی کر لی ہے اور اس امر کو تسلیم بھی کرتی ہے کہ دنیا میں کوئی بھی بات ناممکن نہیں ہے جیسا کہ سائنسی ایجادات نے بھی ثابت کر دیا ہے......" فیصل کی بات سن کر اورنگزیب نے کہا۔

"ویسے ایک بات ہے میں اب ان پُراسرار واقعات سے اتنا متاثر نہیں ہوتا جتنا شروع میں ہوا کرتا تھا...... اب ایک خاص حوصلہ پیدا ہوا ہے مجھ میں اب خوف کا وہ عمل نہیں رہا جو ان پُراسرار واقعات میں ہونا چاہیے۔ بلکہ اب مجھے فکر لاحق ہے۔"

"اور ہمیں تمہاری فکر ہے اورنگزیب......" فیصل نے کہا۔

"بات خوف ڈر کی نہیں ہے اصل بات یہ ہے کہ تمہارے بتائے گئے اب تک کے واقعات سے فکر ہے کہ تم کو کہیں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ ہمیں اس مسئلے پر پوری طرح چھان پھٹک کی ضرورت ہے اور میں نے ابا کے لنکا والے چچا سے رابطہ بھی قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔"

"لنکا والے چچا؟"

"ہاں ابا جان کے دوست ہیں مگر عمر کے لحاظ سے ہم اُن کو ابا کے چچا کہتے ہیں...... ہم بھی چچا جان ہی کہتے ہیں انہیں۔"

"لنکا والے کیوں؟"

"یار بھولے ناتھ سری لنکا کا شارٹ لنکا میں نے بنایا ہے۔" فیصل نے کہا۔

''ان سے بات کرنے کی کوشش کی؟''

''ہاں تمہارا مسئلہ بہت عجیب ہے اور لنکا بھی بہت عجیب ہے۔'' ذوہیب نے مفکرانہ انداز میں کہا۔

''یار مذاق مت بناؤ اب لنکا کا......''

''کیوں کہو عجیب نہیں ہے؟''

''ہاں ایک جزیرہ ہے چاروں طرف پانیوں سے گھرا ہوا...... بہت خوبصورت پُرفضا حسین شاداب چائے ناریل کے باغات سے مالا مال سری لنکا کئی اعتبار سے شہرت رکھتا ہے مگر پُراسرار ماورائی اور بہت ہی خوفناک واقعات جنم لیتے رہے ہیں بنگال و ہندوستان کے دیگر علاقوں کی طرح وہاں جادوگر، جادوگرنیاں، چڑیلیں بھوت پریت وغیرہ کی موجودگی ہے۔''

''تو یہ لنکا والے چچا کس کیٹیگری میں آتے ہیں۔'' فیصل سمجھا نہیں فوراً اور جب سمجھا تو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

''توبہ ہے یار...... ذوہیب بھائی وہ حکیم ہیں وید...... وید......''

''ارے بھائی اورنگزیب کو کوئی مرض لاحق نہیں ہوا ہے۔'' سمیر نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔

''تم حکیم ڈھونڈ رہے ہو...... وید تلاش کر رہے ہو...... بے وقوف آدمی بات تو سن لو پوری۔'' ذوہیب نے کہا۔

''یہ پرانے زمانے کے حکیم وید ڈاکٹر یہ صرف حکمت ہی نہیں جانتے تھے جسمانی امراض کے ساتھ روحانی امراض کا علاج کرنے میں دسترس رکھتے تھے۔''

''بالکل......!'' فیصل نے کہا۔

''ایسے ہی ہیں لنکا والے چچا بھائی وہ جنگلوں جنگلوں گھومتے ہیں عمر گزر گئی اُن کی جڑی بوٹیوں کو تلاش کرنے اور ہر طرح کا علاج معالجہ کرنے کے سلسلے میں جڑی بوٹیوں کی تحقیق کے ایسے شائق ہیں کہ بس...... اور سری لنکا میں ایسی ایسی نایاب جڑی بوٹیاں پائی جاتی ہیں جو کہ پوری دنیا میں نہیں ملتی آسام بنگال جو کہ مشہور ہیں اس سلسلے میں وہاں بھی دستیاب نہیں ہوتی...... اور وہ خالی خولی جڑی بوٹیاں نہیں ہوتیں وہ پُراسرار خاصیت بھی اپنے اندر رکھتی ہیں۔ اور سچ پوچھو تو میرا تو ایک وقت میں بڑا ہی دل کیا کہ میں سری لنکا چلا جاؤں حکمت اور وہ بھی پُراسرار طریق علاج تمہیں معلوم ہے میرا رجحان ہے اس طرف......'' فیصل نے کہا۔

''مگر جانے نہیں دیا ابا جان نے اس طرح......''

''تم ملے ہو چچا جان سے......'' اورنگزیب نے پوچھا۔

''ہاں تمہیں یاد ہوگا دو سال پہلے ابا جان کے ساتھ میں سری لنکا گیا تھا تم لوگ جانتے تو ہو میرے دادا جان کاروباری سلسلے میں بڑے باقاعدہ انداز سے سری لنکا آتے جاتے رہے ہیں۔ بلکہ بیشتر وقت انہوں نے سری لنکا میں ہی گزارا ہے اپنی زندگی کا......''

''وہیں چچا جان سے ملاقات ہوئی اور دوستی میں ڈھلتی چلی گئی ایک جڑی بوٹی تو ایسی ہے جو ہمارے پاس موجود ہے بطور تحفہ انتہائی سحر انگیز خوشبو آتی ہے کسی جنگلی پودے کی جڑ ہے عجیب و غریب خاصیت ہے

اس کی خوشبو سے سانپ' شیر ہر قسم کے وحشی اور خونخوار درندوں پر ایک پل میں ایسا اثر ہوتا ہے کہ وہ مست ہو کر نیم بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ وہاں جنگلوں میں گھرے گاؤں کے لوگ اس جڑی بوٹی کو اپنی جیب میں اپنے بچاؤ کے لیے رکھتے ہیں۔ درندے تو اس کے درخت کے قریب بھی نہیں پھٹکتے ہیں۔" فیصل نے کہا۔

"ظاہر ہے ہم شہر میں رہتے ہیں جڑی بوٹی کے استعمال کی نوبت ہی کہاں آئی سو رکھی ہوئی ہے ابو نے سینت سنبھال کر۔"

"ہاں حکیم صاحب معمولی آدمی نہیں ہیں کئی مرتبہ دادا جان اُن کے ساتھ جڑی بوٹیوں کی تلاش میں جنگلوں اور دور دراز علاقوں کی طرف نکل جاتے تھے۔ ایک پُر فضا قصبہ تھا کوئی ناتھن نگر......" فیصل نے ذہن پر زور ڈالا۔

یہ بھی جنگلوں سے گھرا قصبہ ہے اس قصبے کے گرد و نواح میں روشنی دینے والے درخت بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اس کی روشنی اچھی خاصی تیز ہوتی ہے لہٰذا اس قصبے کے کسی مکان میں دیا جلایا جاتا ہے اور نہ ہی چراغ...... کیونکہ لوگ اپنے گھروں میں اس درخت کی ٹہنیاں کاٹ کر بطور روشنی چراغ استعمال کرتے ہیں جیسے جیسے شام ہوتی ہے اور اندھیرا پھیلنے لگتا ہے یہ ٹہنیاں روشنی دینے لگتی ہیں چراغوں کی طرح جل اٹھتی ہیں۔"

"اگر دن میں بھی گھر یا کمروں میں اندھیرا کر لیا جائے تو پھر یہ آپ ہی آپ چراغ کی طرح جل اٹھتی ہیں ان کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہ ٹہنیاں سوکھتی نہیں ہیں سدا بہار خاصیت رکھتی ہیں راتوں کو دوران سفر اس درخت کی ٹہنیاں لوگ گھر سے لے کر نکلتے ہیں۔ یہ مشعل کا کام دیتی ہیں ایک ٹہنی دس گز تک روشنی دیتی ہے راتوں کو یہ درخت جہاں ہوتے ہیں وہاں دن کا سا سماں ہوتا ہے۔"

"مجھے یہ سب سن کر ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی' حالانکہ ناقابل فہم اور ناقابل یقین باتیں ضرور ہیں۔" اورنگزیب نے کہا۔

"میں تمہاری باتوں پر یقین نہیں کرتا اگر میں ایسے انوکھے واقعات کا خود شکار نہ ہوتا۔"

"صحیح کہہ رہے ہو اورنگزیب ناقابل فہم اور حیرت انگیز تو ہے لیکن ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں ہماری دنیا میں کہ ان کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔"

"ہاں مگر ہمارے یہاں لوگ جب تک ایسی باتوں کا یقین بھی نہیں کرتے چاہے ان میں سچائی کیوں نہ ہو۔ جب تک ان پر خود بہت کچھ نہ گزر جائے۔ جیسا کہ ابھی اورنگزیب نے خود کہہ دیا کہ وہ میری باتوں پر شاید یقین ہی نہیں کرتا اگر وہ ان دنوں ایسے پُر اسرار واقعات کا شکار نہ رہا ہوتا۔" فیصل نے کہا۔

"خیر یہ بھی ہماری دنیا کے بہت سارے المیوں میں سے ایک المیہ ہے کہ جو نظر آ رہا ہے وہ 'ہے' اور جو نظر سے اوجھل ہے اسے مانتے ہی نہیں حالانکہ نظر سے اوجھل ہونا اور بات اور وجود ہی نہ رکھنا اور بات ہے اور یہی اسرار ہے۔"

"دیکھو یہ......" فیصل نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا پیکٹ نکالا۔

"کیا ہے بھائی یہ......" سمیر نے پیکٹ فیصل کے ہاتھ سے لینا چاہا۔

"ارے ٹھہرو یار دیکھو......" فیصل نے ایک گلاس میں پانی انڈیلا اور ساتھ لائے ہوئے پیکٹ سے سوکھی ہوئی گھاس نکالی گلاس کو سامنے رکھی میز پر رکھا اور اس میں چند تنکے سوکھی گھاس کے ڈال دیے پانی

میں ڈالتے ہی پانی سے دھواں نکلنا شروع ہوگیا۔ اس وقت یہ سارے دوست جس کمرے میں بیٹھے تھے وہ اورنگزیب کا ڈرائنگ روم تھا ایک وسیع کمرہ تھا ایک دھندسی چھا گئی تھی پورے کمرے میں دھویں کی ایک باریک چادرسی تن گئی تھی۔ چند سیکنڈ یہی صورت حال رہی پھر دھند چھٹتی گئی۔

''یہ کیا تھا؟''

''کچھ نہیں بس ایک قسم کی جڑی بوٹی تھی چند تنکے ڈالے تھے تو یہ حال تھا دادا جان کے خزانوں سے اُڑا کرلایا تھا دل چاہا تھا تمہیں نمونہ دکھاؤں۔''

''واقعی کمال ہے یار......''

''اگر تھوڑی زیادہ مقدار میں اسے پانی میں بھگویا جائے تو گرد و پیش میں بیس تیس گز تک دھندسی چھا جاتی ہے میں نے بمشکل تین چار تنکے ہی ڈالے تھے اس کے......'' فیصل نے کہا۔

''حکیم صاحب تو کمال کے آدمی ہیں۔''

''ہاں واقعی کمال کے ہیں۔''

''تمہارے مسئلے کو حکیم صاحب ہی حل کر سکتے ہیں اورنگزیب مجھے یقین ہے اس کا میں نے میسج چھوڑ دیا ہے وہ آج کل میں جواب دیتے ہیں۔ اور دوسرا بندوبست بھی کیا ہے وہ یہ کہ ذوہیب تمہارے ساتھ رہے گا دو تین دن جب تک حکیم صاحب جواب نہیں دیتے تمہارے گھر میں اعتراض تو کوئی نہیں؟''

''ارے کیسی باتیں کرر ہے ہو یار ہم بچپن کے دوست ہیں جب تک چاہو رہ سکتے ہو۔ بس میں چاہتا ہوں امی کے علم میں لائے بغیر یہ مسئلہ حل ہو جائے ورنہ امی خوامخواہ پریشان ہو جائیں گی۔''

''ٹھیک ہے ایسا ہی ہوگا اور وہ آرٹ گیلری والی لڑکی؟ کیا نام بتایا تھا؟''

''سنہرا......'' اورنگزیب نے بتایا۔

''اس کا فون تو نہیں آیا؟''

''نہیں......تم فون اگنور کرومت بات کرنا اور نا ہی کہیں جانا اس کے ساتھ......''

''فیصل وہ تو خود غائب ہے ورنہ روز فون کرتی تھی۔''

''مجھے یقین تھا تصویر کی فروخت اور چیک ملنے کے بعد مجھے مبارکباد کا فون لازمی کرے گی ٹریٹ بھی مانگے گی مگر......اس نے ایسا نہیں کیا......''

''اچھا ہے وہ جب تک تم سے دور رہے اچھا رہے گا ہم آگے کے بارے میں لائحہ عمل تیار کرلیں گے۔'' چاروں دوست کافی دیر تک سر جوڑے مختلف زاویوں سے اورنگزیب کی ساتھ ہونے والے واقعات کا جائزہ لیتے رہے۔ اور پھر رات گئے اپنے اپنے گھروں کے لیے رخصت ہوئے سمیر کے بارے میں طے پایا کہ وہ صبح اپنا کچھ ضروری سامان لے کر اورنگزیب کے گھر آجائے گا سب کے جانے کے بعد اورنگزیب بھی فائزہ کو سونے کا کہہ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

بری طرح تھکاوٹ محسوس کرر ہا تھا۔ بیڈ پر لیٹ گیا تھوڑی دیر تک وہ آج کے تمام واقعات چیک ملنے کھونے سے لے کر فیصل و دیگر دوستوں سے اُن پُراسرار واقعات پر ڈسکس کرنا سوچتا رہا پھر سری لنکا والے حکیم کی جانب ذہن چلا گیا اُسے اطمینان کی ایک لہر جسم میں دوڑتی محسوس ہوئی خود کو ہلکا پھلکا محسوس

کرنے لگا نیند سے آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں نیند کی مہربان وادی میں اترتا چلا گیا۔

☆......☆......☆

جنگل میں شام اتر رہی تھی شام کے سرمئی رنگوں نے عجب ملگجا سا جادو جنگل پر طاری کر رکھا تھا سحر اور پُراسراریت ہر جانب بکھری پڑی تھی۔ اچانک ایک بڑا سا پرندہ اپنے آشیانے کی جانب پرواز کی جلدی میں ایک درخت کی شاخ سے جو اڑا تو بے شمار پھول دور دور تک بکھر گئے۔ کچھ پھول کچھ دیر فضا میں تیرتے رہے پھر دوبارہ درخت کی شاخوں سے چپک گئے دور سے ایسا ہی معلوم دیتا تھا مگر وہ قوس وقزاح کے سارے رنگوں کو اپنے نازک پروں میں سمیٹے ہوئے تتلیاں تھیں۔ جو پرندے کی مچائی ہل چل سے پریشان ہو کر اِدھر اُدھر بکھر گئی تھیں۔

شام تیزی سے رات میں تبدیل ہو رہی تھی جنگل کے مکین رات کے استقبال کی تیاریوں میں مگن تھے بندروں کے لڑنے کی آواز میں درختوں پر ان کا اودھم مچانا اس کے ساتھ پرندوں کی آوازیں حشرات الارض کی سیٹیاں' مینڈکوں کے ٹرانے اور قریب ہی بہنے والی جھیل کے پانیوں کی مدھم مدھم سی صدا شامل تھی یہ سب مل کر رات کا پُرتپاک استقبال کر رہے تھے۔

درختوں کی اوٹ سے جھانکتا ہوا مہتاب یہ تماشا دیکھ رہا تھا آسمان کا رنگ کاسنی ہو چلا تھا۔ جس پر کبھی بھی بجلی کی لہر یا بنتی تھی تو درختوں کی اونچی شاخیں روشن ہو جاتی تھیں اب ہوا بھیگ چلی تھی جنگل میں دور دور کچھ زعفرانی شعلوں کے جلتے بجھتے الاؤ روشن ہو چلے تھے اس کے گرد و پیش نیلے اودے جنگلی پھلوں سے ڈھکی کھڑکیوں والا شاہ بلوط کے درختوں کے حصار والا مکان شان و شوکت سے سر اٹھائے کھڑا تھا۔

مکان میں آج ایک زبردست ہل چل مچی ہوئی تھی۔ شاہ بلوط کے ان درختوں کے نیچے آگ کا ایک چھوٹا الاؤ روشن تھا اس الاؤ سے یکے بعد دیگرے چنگاریاں پھوٹتی اور فضا میں اٹھکھیلیاں کرتے ہوئے تحلیل ہو جاتیں۔ زعفرانی رنگ شعلوں کا عکس اور چنگاریوں کا رقص عجیب فسوں پیدا کر رہا تھا اس مدھم نارنجی روشنی میں شب تاب کا پودا وجود سنہری ہو رہا تھا قریب ہ کسی درخت پر رات کا کوئی پرندہ دلفریب راگنی چھیڑ رہا تھا راگنی کے سر بدلنے لگے تھے میٹھا گیت بے چین ہو رہا تھا۔ جگہ جگہ روشن الاؤ میں خشک لکڑیوں کے چٹخنے کی آوازوں اور اس کے نتیجے میں نارنجی پیلی چنگاریوں کے پُرفسوں رقص نے ماحول کی پُراسراریت میں اضافہ کر رکھا تھا۔ مکان میں ہونے والی ہل چل عروج پر پہنچی ہوئی تھی آسمان پر بڑے سے چاندی کے تھال جیسا چاند نکل آیا تھا جس کی چاندنی میں تاحد نگاہ درختوں کی اونچی اونچی شاخیں چوٹیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ مکان کا دروازہ کھلا...... ایک انتہائی رعب دار بھاری گونجدار آواز میں کسی نے حاضرین کو باہر تشریف لانے کا کہا۔

وہ دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا تھا لمبا قد' گہرا سانولا رنگ تراشے ہوئے کھڑے کھڑے نقوش ایسا لگتا تھا مہا گنی سے تراش کر بنائے گئے ہوں۔

''سب باہر تشریف لے چلیں......'' رعب دار آواز اس کی شخصیت سے تال میل کھا رہی تھی۔ پہاڑوں جیسی سنگین اور ان سے ٹکرانے والے دریاؤں جیسی گھمبیر پُراسرار اس گھنے جنگل جیسی...... پوری شخصیت غلافوں میں لپٹی ہوئی تھی۔

(جاری ہے)

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو اِن وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہرحال محدود ہے۔ اِن ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/500 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کر دیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحب استطاعت حضرات ٹوکن منی =/500 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسب استطاعت اِس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)...... مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)...... منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)...... اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

88-C II۔ خیابانِ جامی۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

عزیزو! اللہ ہم سب پر اپنا کرم اور رحم فرمائے۔ ماہ صفر کی آمد آمد ہے اس لیے خاص ماہ صفر کا وظیفہ تحریر کر رہا ہوں جو پابندی سے کرنے والے کو قرب رب العزت عطا فرمائے گا۔ ذہنی اور قلبی سکون عطا ہوگا۔ دنیاوی معاملات سہل ہوتے چلے جائیں گے۔ بعد نماز تہجد 7 بار الحمد شریف، 3 تسبیح ان اللہ مع الصابرین، 3 تسبیح حسبان اللہ و نعیم الوکیل، تین تسبیح فاذکرونی اذکرکم، تین تسبیح سبحان اللہ و بحمدہ سبحان اللہ العظیم اور تین تسبیح ربی انی مغلوب فانتصر پڑھیں پھر دعا کریں۔ دعا کے بعد فجر تک درود شریف پڑھتے رہیں اور پھر فجر کی نماز ادا کر کے اگر آرام کرنا چاہیں تو آرام کریں۔ 14 دن پابندی سے یہ عمل کرنے والا کبھی ناکام نہیں ہوگا

میں یہاں ایک بات کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ میری تیار کردہ ادویات دھیرے دھیرے فائدہ دیتی ہیں کیونکہ ان میں **Steroids** کا استعمال نہیں کیا جاتا تمام ادویات بالکل خالص جڑی بوٹیوں سے تیار کی جاتی ہیں۔ لہٰذا پابندی کے ساتھ علاج کرنے والے کو ہی شفا عطا ہوتی ہے۔ کچھ لوگ مختلف قسم کی ادویات بیچ رہے ہیں وہ ان کا کاروبار ہے میرا نہیں، میں مریض کے حساب سے دوا تیار کرتا ہوں لہٰذا اگر دوا درکار ہو تو تفصیل سے مسئلہ بتانا ہوگا کیونکہ ہر شخص دوسرے سے جدا ہوتا ہے۔ لہٰذا علاج اور دوا بھی مختلف ہونی چاہیے۔

□ رقیہ علی۔ شکار پور

○ بابا جان! آپ کیسے ہیں۔ آپ نے مجھے شوہر کے مزاج میں نرمی کے لیے تعویذ دیا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب وہ میرا اور بچوں کا بہت خیال رکھنے لگے ہیں۔ میں تعویذ نہیں ہٹانا چاہتی کہیں وہ دوبارہ پہلے جیسے نہ ہو جائیں ڈر لگتا ہے بتایئے کیا کروں؟

☆ بیٹی رقیہ خوش رہو ڈر دل سے نکال دو تم نے اللہ سے مدد مانگی ہے لہٰذا مطمئن رہو۔ تعویذ تلف کر دو اور پابندی سے نماز ادا کرتی رہو۔ ہر ماہ کچھ رقم الگ کر لیا کرو جو صدقے کی مد میں نکال دو۔

□ مبارک حسن۔ دوحہ

○ بابا جی میں بڑی پریشانی میں آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ میری دوران ڈیوٹی کچھ لوگوں سے لڑائی ہوگئی تھی اس بات کو تقریباً سال گزر گیا میں نے معافی بھی مانگ لی تھی۔ اب جب میری ترقی کا وقت آیا تو انہوں نے میرے خلاف درخواستیں دینا شروع کر دیں۔ کمپنی کے مالکان نے مجھے فوری طور پر معطل کر دیا اور میرا پاسپورٹ بھی ضبط کر لیا۔ 3 ماہ گزر چکے ہیں تنخواہ بھی نہیں مل رہی۔ گھر والوں کو کیا بتاؤں وہ بہت پریشان ہوں گے۔ پاکستان بھی نہیں آسکتا بتایئے کیا کروں۔ میرے مخالفین سب ہندو ہیں حالانکہ مالکان مسلمان ہیں مگر یہاں ہندو لابی بہت مضبوط ہے۔ یہ لوگ بہت سازشیں کرتے

اطلاع عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ اس نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتا: 88-C-II۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے۔ 021-35893121-35893122

چہرے پر رونق نہیں ہے' کیل مہاسے' جھائیاں ان سب سے نجات حاصل کرنے کے لیے خالص جڑی بوٹیوں سے تیار دوا سچی کہانیاں کے دفتر سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

ہیں۔ آپ کے بارے میں ایک دوست نے بتایا' خدارا بابا جی میری مدد کیجیے۔

☆ بیٹے مبارک! پریشان مت ہو میں تمہیں تعویذ ارسال کرنا چاہتا ہوں صرف 3 دن رکھنا پھر مجھے خوشخبری دینا مگر شرط یہ ہے کہ جیسے کہوں ویسے کرنا فوری طور پر اپنا پتہ ارسال کرو۔

☐ صاحب حسین۔ جہلم

o بابا صاحب! میں آپ کا احسان مند ہوں گھر والوں نے تو میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا مگر آپ کی مدد نے مجھے دنیا کی ساری خوشیاں عطا کردیں۔ ہم دونوں میاں بیوی اولاد کے لیے 7 سال سے ترس رہے تھے۔ میرے والدین بیوی کو طلاق دینے پر زور دے رہے تھے۔ اُس اللہ کی بندی نے آپ سے رابطہ کیا آپ نے تعویذ عنایت کیا اور اب میں جڑواں بیٹیوں کا باپ ہوں۔ محرم کے بعد کراچی آؤں گا جانتا ہوں آپ نہیں ملتے مگر سچی کہانیاں کے دفتر میں رقم جمع کروادوں گا آپ کسی ضرورت مند کو دے دیجیے گا۔ اللہ آپ کو ہمیشہ ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔

☆ بیٹے صاحب! اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس پاک ذات نے بہت نہیں آزمایا' بس عہد کرلو کہ ہمیشہ ضرورت مندوں کی مدد کرتے رہو گے۔ بچیاں پاؤں پاؤں چلنے لگیں تو مجھ سے تعویذ منگوالینا

اگر میں زندہ رہا تو......

☐ یمنہ رسول۔ کراچی

o بابا جی میں اپنی بہن کی جانب سے خط لکھ رہی ہوں اس نے آپ سے دانتوں کی دوا منگوائی تھی دانتوں کے ڈاکٹروں نے تو اس کو لوٹ لوٹ کر حشر کردیا تھا۔ ہم غریب لوگ کہاں تک اسپتالوں کے چکر لگاتے میں نے بہن کو آپ کی دوا کے بارے میں بتایا تھا وہ سچی کہانیاں کے آفس سے آکر خود لے گئی تھی۔ اب اس کی تکلیف مکمل طور پر دور ہوگئی ہے۔ دو بوتلیں وہ استعمال کرچکی ہے مزید کتنی کرنی ہیں ضرور بتادیں اور بابا جی کیا یہ دوا ہم اپنے گھر کے دیگر بچوں اور بڑوں کو استعمال کرواسکتے ہیں تاکہ مستقبل میں ان کے دانت خراب نہ ہوں۔ ابھی تو کوئی تکلیف نہیں۔

☆ بیٹی یمنہ! بہن سے کہو ابھی 3 ماہ پابندی سے دوا استعمال کرتی رہے بالکل نہ چھوڑے تاکہ وہ اندر تک جڑوں کو مضبوط کردے۔ بالکل صبح وشام ایک ایک بار گھر کے چھوٹے بڑوں سب کو دوا استعمال کرواؤ انشاء اللہ دانت اتنے مضبوط ہوں گے کہ دانتوں سے ہڈی توڑنا آسان ہوگا۔

☐ رمشا۔ شہداد پور۔

☆ بیٹی رمشا! تم مجھے اپنا مسئلہ تفصیل سے لکھو' تمہارا خط بہت مبہم ہے' وضاحت کے ساتھ لکھو تاکہ مسئلہ سمجھ میں آسکے۔ جہاں تک میں سمجھا ہوں' تم اپنے والد کے رویے سے ناراض ہو۔ بیٹی! باپ کا درجہ بہت بڑا ہے۔ اکثر اوقات درگزر سے کام لینا پڑتا ہے اور بعض اوقات بات چیت سالوں کے سرد رویے کو ختم کردیتی ہے۔ صبر اور مستقل مزاجی سے

بے اولاد جوڑوں کے لیے شرطیہ علاج' بانجھ پن یا کسی اور وجہ سے اگر اولاد نہ ہوتی ہو تو فوری رابطہ کریں۔ اور چند ماہ کے علاج کے بعد اپنی اولاد کو اپنے ہاتھوں میں کھلائیں۔

کام لو اور وضاحت کے ساتھ خط لکھو۔

□ ثمینہ۔ کراچی۔

☆ بیٹی ثمینہ! تمہارا خوف بے جا نہیں' کہتے ہیں نا کہ دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے مگر بیٹی! اللہ پر بھروسہ رکھو' اس پاک ذات سے اچھی امید رکھو' وہ بہتر کرنے والا ہے۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 101-101 بار پڑھو۔ اول و آخر پہلا کلمہ پھر دُعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔ پیروں کو زیتون کا تیل ہلکا گرم کر کے مالش کیا کرو' ضرور افاقہ ہوگا۔

□ بیٹی۔ ٹھٹھہ۔

☆ بیٹی! اپنی دوست سے کہو کہ ہر نماز کے بعد 11 بار سورۃ الناس پڑھے اور دُعا کرے۔ بھائی پر دن میں تین بار آیت الکرسی ایک ایک بار پڑھ کر ضرور دَم کرے۔ کچھ نہ کچھ رقم ضرور خیرات کرو۔ اللہ اپنا کرم رکھے۔ مجھے ایک ماہ بعد حالات سے مطلع کرو۔

□ اُم کلثوم۔ کراچی۔

☆ بیٹی اُم کلثوم! نمازِ عشاء کے بعد ایک بار سورۃ احزاب پڑھو اور دُعا کرو۔ اللہ غیب سے مدد فرمائے گا۔ مدت 2 ماہ ہے۔ بس خیال رہے' نماز قضا نہ ہو۔

□ م۔ن۔ لودھراں۔

☆ بیٹی! دنیا میں عزت چاہتی ہو تو نماز کی پابندی بہت ضروری ہے۔ کوئی شخص بھی کند ذہن نہیں ہوتا' بس جب توجہ کم ہو تو پھر وہ بات یاد نہیں رہتی۔ جن باتوں میں تمہیں کوئی دلچسپی نہ ہو' وہ بھی توجہ سے سنا کرو۔ جس کام سے بددل ہو' اس کو بھی نامکمل مت چھوڑو۔ بکثرت یَاعظیمُ کا وِرد کیا کرو۔

رات 6-5 بادام پانی میں بھگو دیا کرو اور نہار منہ اچھی طرح چبا کر کھا لو۔ یہی عمل بھتیجی کو کراؤ۔ انشاء اللہ' خود فرق محسوس کرو گی۔

□ آمنہ۔ کوٹری۔

○ باباجی! اللہ آپ کو خوش رکھے۔ میں نے آپ سے اولاد کے لیے تعویذ لیا تھا' اللہ نے مجھ پر بہت کرم کیا۔ اللہ کے بعد آپ کی شکر گزار ہوں۔ اب مجھے تیسرا مہینہ ہے۔ یہ فرمایئے' تعویذ کا کیا کروں؟ اللہ آپ کو دین و دنیا دونوں میں سرفراز فرمائے۔

☆ بیٹی آمنہ......! خوش رہو' آباد رہو۔ اب مجھ سے حفاظت کا تعویذ منگوا لو۔ تعویذ ملنے کے بعد اس تعویذ کو تلف کر دینا۔ بیٹی! بس اللہ کا شکر ادا کیا کرو۔ میں تو اس کا ادنیٰ سا بندہ ہوں۔ تعویذ منگوانے میں مزید دیر مت کرنا۔

□ شاہانہ۔ لاہور۔

☆ بیٹی شاہانہ......! وزن کم کرنے کی دوا اور یرقان کی دوا ''سچی کہانیاں'' کے دفتر سے منگوا لو' یقیناً فائدہ ہوگا۔

□ زینت جہاں۔ کراچی۔

○ محترم باباجان! السلامُ علیکم! کئی سال سے میں ''سچی کہانیاں'' پڑھ رہی ہوں مگر خط لکھ نہ سکی۔ میرا پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ میری شادی کو 18 سال ہو

گئے ہیں۔ پہلے میرے شوہر دوست کی دکان کرتے تھے مگر گھریلو مسئلے کی وجہ سے وہ دکان چھوڑنا پڑی پھر وہ سرکاری محکمے میں کلرک ہوگئے۔ بابا جی! میرے پانچ بچے ہیں۔ میرا مہینے کا آخر اتنا پریشان کن گزرتا ہے کہ بیان نہیں کرسکتی۔ دوسرا کام کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر کر نہیں پاتے۔ کئی رکاوٹیں حائل ہوجاتی ہیں۔ مہربانی کرکے مجھے بھی وظیفہ بتادیں جس سے ہماری پریشانی دور ہوجائے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میری چار لڑکیاں اور ایک لڑکا ہے۔ بابا جی! میں چاہتی ہوں کہ وہ پڑھ لکھ کر کسی قابل بن جائیں لیکن ان کی پڑھائی میں دلچسپی بہت کم ہے۔ بابا جی! میں نماز پڑھتی ہوں۔ بچیاں بھی پڑھتی ہیں مگر میری فجر کی نماز اکثر قضا ہوجاتی ہے جس کا مجھے بہت ملال ہوتا ہے۔ کسی نے میرے شوہر کو نمازِ فجر کے بعد سورۃ رحمٰن اور عشاء کے بعد سورۃ واقعہ پڑھنا بتایا تھا، میں وہ پڑھتی ہوں۔

☆ بیٹی زینت! اللہ تعالیٰ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ سورۃ رحمٰن پڑھنا جاری رکھو۔ بچوں پر الحمد شریف اور چاروں قُل پڑھ کر ضرور دَم کردیا کرو۔ مجھے ایک ماہ بعد مطلع کرو۔ اللہ تعالیٰ حامی و ناصر ہو۔

□ نائمہ۔ ناروے۔

☆ بیٹی نائمہ! تمہارا خط مجھے اس حالت میں ملا ہے کہ صرف نام اور شہر کا نام معلوم ہوسکا ہے۔ جوابی لفافہ بھی نہیں تھا ورنہ براہ راست جواب دیتا۔ بہرحال باہر سے خط لکھنے والوں کو میری نصیحت ہے کہ خط ہمیشہ انشورڈ کروا کر بھیجیں۔ صرف اس صورت میں مجھے خط درست حالت میں ملتے ہیں۔

□ فروا، کراچی۔

☆ بیٹی فروا! اللہ تعالیٰ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ تمہیں واقعی ہمت سے کام لینا ہوگا۔ اپنی والدہ کو اعتماد میں لے کر بات واضح کردو۔ نماز کی پابندی رکھو اور نمازِ عشاء کے بعد یَامجیدُ کی تین تسبیح پڑھو اور دُعا بہت کرو۔ میں بچیوں کو یہ مشورہ نہیں دیتا ہوں مگر تمہارے حالات میں یہ ضروری ہے۔ مجھے 21 روز بعد پھر مطلع کرو۔ انشاء اللہ، کرم ہوگا۔

□ ریحانہ، پنڈی۔

☆ بیٹی ریحانہ! تمہارا پہلا خط ہے جس میں جوابی لفافہ بھی نہیں ہے۔ والدہ سے کہو کہ روزانہ بیٹی پر الحمد شریف اور چاروں قُل پڑھ کر دَم کردیا کریں۔ نمازِ عصر کے بعد ایک بار سورۃ یٰسین پڑھ کر پانی پر دَم کریں اور بیٹی کو پلائیں اس طرح کہ بچی کو اندازہ نہ ہو کہ دَم کیا ہوا پانی ہے۔ وظائف جو پڑھ رہی ہو وہ مزید ایک ماہ کرو۔ کرم ہوگا۔

□ طاہرہ حمید۔ یو کے۔

☆ بیٹی طاہرہ! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ نجات صرف نماز میں ہے۔ اللہ کے سامنے سر جھکاؤ اور گڑگڑا کر دعا کرو۔ ہر نماز کے بعد ایک تسبیح پڑھو

بلند فشار خون کے لیے دوا دستیاب ہے

دانتوں کے جملہ امراض کے لیے اکسیر دوا ہر عمر اور ہر جنس کے افراد کے لیے دستیاب ہے' اپنا آرڈر سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے نوٹ کروائیں۔

یَاارحم الراحمین مدت 41 دن ہے۔ انشاء اللہ' کرم ہوگا۔

☐ شازیہ۔ فیصل آباد۔

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری منگنی تو اچھے گھروں میں ہوتی ہے لیکن شادی کے قریب آ کر ٹوٹ جاتی ہے۔ ایسا تین بار ہوا ہے اور اب کی بار میں بہت پریشان ہوں۔ میرا کہیں شادی کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ کچھ دن پہلے میری منگنی سرگودھا کے پاس ہی کسی قصبے میں ہوئی تھی۔ یہ شادی وٹا سٹہ کی تھی۔ نکاح سے ایک دن پہلے رات کو میرے منگیتر اپنی پسند کی لڑکی سے نکاح کر کے لے آئے۔ اس طرح یہ منگنی ٹوٹ گئی ہے لیکن اس منگنی کے ٹوٹنے کا مجھے بہت دکھ ہے۔ اب میں کئی امیدیں لے کر آپ کے در پر حاضر ہوں۔ آپ پلیز' میری مدد کریں۔

☆ بیٹی شازیہ! اللہ تعالیٰ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ نماز فجر اور عصر کے بعد سورۃ احزاب آیت 33 ایک سو ایک' ایک سو ایک بار پڑھو اور دعا کرو۔ اللہ تعالیٰ بڑا رحیم و کریم ہے۔ ضرور کرم ہوگا۔

☐ صبوحی۔ سیالکوٹ۔

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! جب سے میری شادی ہوئی ہے' میں نے تکلیف اور پریشانی ہی دیکھی ہے۔ میرا پہلے بیٹا ہوا تھا جو کہ مر گیا اور اس کے بعد 5 بیٹیاں ہوئیں جن میں سے 4 زندہ ہیں۔ چار میں سے تین کی شادی ہوگئی ہے اور ایک ابھی پڑھ رہی ہے۔ اس زمانے سے اب تک میرے شوہر نے کچھ کام کاج نہیں کیا۔ بابا جی! جوانی میں تو مجھے کچھ پتا نہیں چلا' اِدھر اُدھر کام کاج کر کے گھر کی ضرورتیں پوری کر لیا کرتی تھی اور شوہر بھی مجھے مار پیٹ کر مجھ سے پیسے لے لیا کرتا تھا۔ اب بھی میرا شوہر کام نہیں کرتا ہے۔ میں پانچ سال تک اپنی بیٹی کے پاس رہی ہوں' اب اس سے علیحدہ ہوئی ہوں۔ وہ صبح گھر سے نکل جاتا ہے اور رات کو 3-4 بجے تک آتا ہے۔ گھر کا سارا سامان بک چکا ہے۔ بابا جی! میں بہت پریشان ہوں۔ کبھی سوچتی ہوں اس سے علیحدہ ہو جاؤں۔ یٰسین شریف میں مکمل روزانہ پڑھتی ہوں۔ آپ مجھے کوئی آسان سا وظیفہ بتائیں جو میں پڑھ سکوں۔ نماز پابندی سے پڑھتی ہوں۔ تمام عمر آپ کو دعائیں دوں گی۔

☆ بیٹی! اب بہت دیر ہو چکی ہے' علیحدگی کا فیصلہ درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ تمہاری ذمے داریاں خوش اسلوبی سے مکمل فرمائے۔ نماز عشاء کے بعد 33 بار سورۃ اللھب پڑھو اور دعا کرو۔ کرم ہوگا۔ مدت 3 ماہ ہے۔

☐ کشمالہ' کوئٹہ۔

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز کرے اور آپ اسی طرح دکھی لوگوں کے مسائل حل کرتے رہیں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں ایک لڑکے سے محبت کرتی ہوں اور وہ لڑکا بھی مجھ سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری شادی ہنسی خوشی ہمارے والدین کی رضا مندی سے ہو مگر میرے گھر والے یہ کبھی نہیں

مانیں گے کہ ہماری بہن بیٹی غیروں میں جائے۔ ہم میں فرق صرف اتنا ہے کہ وہ سندھی ہیں اور ہم پٹھان۔ برائے مہربانی مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جس سے میرے گھر والے راضی ہو جائیں۔

☆ بیٹی کشمالہ! اللہ تعالیٰ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ ناممکن کو ممکن بنانا صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو۔ نماز کی پابندی رکھو۔ نماز فجر اور نماز عشاء کے بعد سورۃ الاعراف آیت 29 ننانوے ننانوے بار پڑھو اور دعا کرو۔ یَامُقِیطُ کا بہت ورد کرو۔ مدت 3 ماہ ہے۔

□ عامر احمد۔ لاڑکانہ۔

o محترم بابا جی! السلام علیکم! میں آپ کے سامنے ایک مسئلہ لے کر پیش ہو رہا ہوں۔ میری دور کی نظر کمزور ہے اور میری عینک کا نمبر 5 ہے۔ ''سچی کہانیاں'' میں نظر ٹھیک کرنے کا ایک نسخہ لکھا ہوا دیکھا۔ مجھے یہ نسخہ استعمال کرنے کی اجازت دی جائے۔ اس میں لکھا ہوا ہے کہ نماز کے بعد یَاشَافِعِیُ سات سات دفعہ پڑھ کر ایک چمچ سونف پھانک لیں تو کیا ہر نماز کے بعد یا کسی مخصوص نماز کے بعد سونف پھانکنا ہے؟ اس کے بارے میں ضرور بتایا جائے۔ اس کے علاوہ مجھے فوج میں بھرتی ہونے کا بہت شوق ہے لیکن میں اپنی نظر کی کمزوری کی وجہ سے فوج میں بھرتی نہیں ہو سکا۔ برائے مہربانی نوکری حاصل کرنے کے لیے کوئی وظیفہ بتائیں۔ میں آپ کا تہہ دل سے مشکور رہوں گا۔

☆ بیٹے عامر! اللہ تعالیٰ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ وظیفے کی اجازت ہے۔ یہ عمل ہر نماز کے بعد کرو۔ بیٹے! نظر کی کمزوری دور ہوگی تب ہی تم فوج میں اپلائی کر سکو گے۔

☆☆......☆☆

پاکستانی شوبز

شوبز سے جڑی تہلکہ خیز خبریں......

اور نئی ریلیزز......

ادارہ

بند کھڑکیاں

ہم ٹی وی سے نشر ہونے والا ڈرامہ 'بند کھڑکیاں' آج کل بہت پسند کیا جارہا ہے۔ دوشیزہ میں چھپنے والا افسانہ جس کی مصنفہ سیما مناف ہیں پسندیدگی کے ریکارڈ توڑ رہا ہے۔ وجہ مضبوط اسکرپٹ اور اداکاروں کی حقیقت سے قریب اداکاری ہے۔ شکی مزاج شوہر کے ساتھ زندگی گزارنے والی بیوی کی کہانی ہے جو دیکھنے والوں کو مستقل شاک کی سی کیفیت دیتی ہے۔ آغا علی، سارہ خاں اور انعم فیضا کی اداکارہ لاجواب ہے۔ ڈرامہ دیکھتے ہوئے بالکل محسوس نہیں ہوتا کہ یہ ٹی وی اسکرین پر چلنے والے سین ہیں بلکہ ایسے کردار اور ایسی مشکل زندگی

بند کھڑکیاں

ہمیں اپنے آس پاس بھی نظر آتی ہے۔

جوانی پھر نہیں آنی ہے

اس فلم نے اس بار سینما کے شوقین افراد کے دل موہ لیے ہیں۔ ہمایوں سعید' فہد مصطفیٰ' اور کبریٰ خان کی



اداکاری لاجواب ہے۔ عید پر ریلیز ہونے والی اس فلم نے ریکارڈ بزنس کیا۔ فلموں کے شوقین افراد کا کہنا ہے کہ ٹینشن بھرے اس ماحول میں مزاحیہ فلمیں بہت ضروری ہیں اور پھر جوانی پھر نہیں آنی تو ایک مکمل انٹرٹینمنٹ فلم ہے۔ اس فلم کی خاصیت یہ ہے کہ اداکاری بھی لاجواب ہے اور پکچرائزیشن بھی بہت اچھی ہے۔ جن مقامات کا انتخاب شوٹنگ کے لیے کیا ہے اُس نے تو دیکھنے والوں کو اپنا گرویدہ کرلیا ہے اگر یہ کہا جائے کہ جوانی پھر نہیں آنی ہے ایک بہترین پاکستانی فلم ہے تو یہ غلط نہ ہوگا۔

گھر تتلی کا پر

جیو سے نشر ہونے والا ڈرامہ گھر تتلی کا پر بھی لوگوں



میں بہت مقبول ہورہا ہے' کاسٹ میں شامل ہیں صنم چوہدری' ایمن خان اور شہزاد شیخ' رائٹر ثمرہ بخاری ہیں۔ کہانی وہی عام سی ہے کہ دوست نے دوست کا گھر خراب کردیا میاں بیوی خوشحال زندگی گزار رہے تھے کہ ایک سہیلی کا گھر میں آنا جانا بڑھ گیا اور اس نے اپنی سہیلی کے شوہر کو اپنی طرف مائل کرلیا' اپنا گھر بچے' شوہر سب چھوڑ دیا۔ کہانی تو عام سی ہے مگر کسی حد تک سچی تصویر معاشرے کی دکھائی گئی ہے۔ صنم چوہدری کی اداکاری لاجواب ہے۔

بِنت خالہ کی بیٹیاں

ARY سے پیش کیا جانے والا یہ ڈرامہ بھی اچھا ہے کاسٹ میں شامل ہیں۔ ثنا فخر' ماریہ واسطی' قوی اور ذہین طاہرہ' ایک ایسے کنبے کی کہانی جس میں بیٹیاں عمر رسیدہ ہورہی ہیں مگر شادی کے آثار دور دور تک نہیں' ڈرامے کی



کہانی تو عام سے گھریلو مائل کے گرد گھومتی ہے مگر اس ڈرامے میں ثمینہ نذیر (نجمہ) نے حیدرآبادی خاتون کا کردار نبھایا ہے جو لاجواب ہے۔ ثمینہ نذیر کے کردار نے فاطمہ ثریا بجیا کے کچھ کرداروں کی یاد دلا دی جو لازوال ہیں۔ ہم ثمینہ نذیر کو اس شاندار اداکاری پر مبارک باد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ مزاحیہ ڈراموں اپنے فن کے جوہر دکھائیں گی۔

شرم کرو حیا کرو

چیف جسٹس آف پاکستان کے اعلامیے کے بعد لوگوں نے ڈیم فنڈ میں عطیات دینا شروع کردیے ہیں۔ یہ بات تو ہم سب جانتے ہیں کہ ڈیم پاکستان

کے لیے ناگزیر ہیں۔ پانی سے ہی زندگی کا پہیہ چلتا ہے پچھلی حکومتوں نے اس جانب کوئی توجہ نہیں دی مگر اب چیف جسٹس کے اعلان کے بعد یہ مہم بہت اہم اور ضروری ہوگئی ہے۔ مگر کیا وجہ ہوئی کہ پرائم منسٹر آف پاکستان کو بھی پاکستانیوں سے فنڈ ریزنگ کی اپیل کرنی پڑی۔ وجہ صاف ہے ٹی وی پر مشہوری کے لیے ہر شخص عطیہ دینے کا اعلان تو کر رہا ہے مگر دے نہیں رہا' کچھ لوگوں کو تو خبروں میں رہنے کا مرض ہوتا ہے اور فن بھی آتا ہے۔ ٹی وی پر جاری نشریات



میں فون کر کے وہ ایئر ٹائم ضائع کرتے ہیں اپنا نام اسکرین پر چلتا دیکھنا ہی اُن کا مقصد ہے اور یہی وجہ ہے کہ چیف کے بعد پرائم منسٹر کو بھی پاکستانیوں سے اپیل کرنی پڑی۔ ایسے لوگوں کے لیے ہی کہا گیا ہے شرم کرو حیا کرو۔

اچھائی کا راستہ

سائرہ خان جو شوبز انڈسٹری سے ایک طویل عرصے سے وابستہ تھیں انہوں نے اس فیلڈ کو خیر باد کہہ دیا۔ ہوا کچھ یوں کہ سائرہ کی گاڑی کی ٹکر سے ایک بچی شدید زخمی ہوگئی اور سائرہ کو یقین تھا کہ بچی نہیں بچے گی انہوں نے اسی وقت اللہ سے دعا کی کہ یااللہ اس بچی کو بچالے میں رنگ و نور اور فحاشی کی اس دنیا کو چھوڑ دوں گی۔ ڈاکٹرز نے بچی کو بچالیا اور سائرہ نے وعدہ جو اپنے رب سے کیا تھا پورا کیا۔ یقیناً یہ سائرہ کی اچھائی تھی کہ وہ زخمی بچی کو اسپتال لے گئیں اور یقیناً یہ حادثہ صرف ایک بہانہ تھا۔ رب



کو اپنی بندی کو اپنی طرف لانا تھا۔

شعیب اختر نے اپنا استعفیٰ PCB کو بھجوا دیا

دنیا کے تیز ترین باؤلر شعیب اختر نے نئے PCB چیئرمین احسان مانی کو اپنا استعفیٰ بھجوا دیا۔ شعیب اختر فارم چیئرمین نجم سیٹھی کے مشیر تھے۔ نجم سیٹھی کے استعفیٰ دینے کے بعد انہوں نے بھی



استعفیٰ دے دیا۔ اب وجہ کیا بنی اس استعفیٰ کی یہ تو فی الحال واضح ہیں مگر کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔ ورنہ ہمارے مزاج میں استعفیٰ دینا شامل ہی نہیں۔ خیر جلد یہ مسٹری بھی حل ہوجائے گی۔

☆☆......☆☆

آپ کی ڈائری

یہ ہے آپ کی پسند' آپ کا انتخاب

قارئین

فرمانِ الٰہی

اے پروردگار ہم کو اپنا فرمانبردار بنائے رکھنا۔ اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک گروہ کو اپنا فرمانبردار بنائے رکھنا اور (پروردگار) ہمیں ہماری عبادت کا طریقہ بتا اور ہمارے حال پر (رحم کے ساتھ) توجہ فرما۔ بے شک تُو توجہ فرمانے والا مہربان ہے O اے پروردگاران (لوگوں) میں، انہیں میں سے ایک پیغمبر مبعوث فرما جو ان کو تیری آیتیں پڑھ پڑھ کر سُنایا کرے اور کتاب اور دانائی (کی باتیں) سکھایا کرے اور ان (کے دلوں) کو پاک صاف کرے، بے شک تو غالب اور صاحب حکمت ہے O

(سورۃ البقرہ 2......ترجمہ: آیت 128 تا 129)

مردے کے متعلق تین آدمیوں کی گواہی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

"جو بندہ مسلم فوت ہو جائے اور اس کے تین قریبی پڑوسی اس کے لیے خیر کی گواہی دے دیں۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، میں نے اپنے بندوں کی شہادت ان کے علم کے مطابق قبول کرلی اور اپنے علم کے مطابق جو جانتا ہوں اسے پوشیدہ کر کے اسے معاف کردیا۔"

تین چیزیں

تین چیزیں انسان کو بے نقاب کرتی ہیں۔

1)......بڑھاپے میں اولاد

2)......غربت میں بیوی

اور

3)......مصیبت میں دوست

تین اہم چیزیں

1)......دولت' محبت بچپن میں مفت ملتی ہے

2)......جوانی میں کمانی پڑتی ہے

3)......بڑھاپے میں مانگنی پڑتی ہے۔

تجربہ

تجربہ انسان کو غلط فیصلوں سے بچاتا ہے۔

اور

تجربہ غلط فیصلوں سے ہی ہوتا ہے۔

ملازم حسین شیرازی۔ بھکر

سنہرے اقوال کا خزانہ

دو آدمیوں کی کوشش بے فائدہ ہے۔ ایک وہ جس نے حلال کمایا مگر اس کا استعمال نہ کیا دوسرا وہ جس نے علم حاصل کرلیا مگر عمل نہ کیا۔

اگر آپ دنیا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانا چاہتے

ہیں تو لوگوں پر احسان کریں جیسے آپ پر اللہ کا احسان ہے۔

دیوار کے پیچھے بات کرتے وقت بھی ہمیشہ ہوشیار رہنا چاہیے ہوسکتا ہے کوئی کان لگا کر آپ کی بات سن رہا ہو۔

بدی کا اگر موقع ملے اور بدی نہ کرو تو یہ بہت بڑی نیکی ہے۔

جب تم دنیا کی مفلسی سے تنگ آجاؤ اور رزق کا کوئی راستہ نہ ملے تو صدقہ دے کر اللہ سے تجارت کرو۔

جانور اپنے مالک کو پہچانتا ہے لیکن انسان اپنے اللہ کو نہیں پہچانتا۔

شعر

وہ کہنے لگا مجھے پہچان لو گے کیا ہزاروں کے بیچ میں
میں نے مسکرا کر کہا تجھ ہی سے تو ہوا تھا عشق ہزاروں کے بیچ میں

خضر حیات۔ روڑہ تھل

ٹھیک نہیں

ہر چمکتے چہرے کو یوں پاس بٹھانا ٹھیک نہیں
موسم گل تو اچھا ہے مگر موسم زمانہ ٹھیک نہیں
وہ آئے تو ہیں ہم سے ملنے تاروں کی چھاؤں میں
پر کچھ بھی ہو تم ان سے کہو یوں رات کو آنا ٹھیک نہیں
یہ بات نہیں کوئی باتوں میں دل کس سے تم نے لگایا ہے
تم کھل کر کہو جو کہنا ہے یوں بات چھپانا ٹھیک نہیں
ہجر و مروت مہر و وفا تم چھوڑو ان سب قصوں کو
گر تم نے ہمارا ہونا ہے یوں نہ نہ کرنا ٹھیک نہیں
نہیں آئے چاند ہمارے آنگن میں اب تم ہی آیا جایا کرو
گڑیا جیسی لڑکی کو یوں پہروں جگانا ٹھیک نہیں
کچھ تو اب کہنا چاہتے ہیں سادات پور کی رانی سے
یہ عمر ناداں اور پیار کے قصے یوں روگ لگانا ٹھیک نہیں

انتخاب: پرنس افضل شاہین۔ بہاولنگر

مختصر مختصر

انسان جس کیفیت اور عقیدے میں مرے گا اسی میں دوبارہ اُٹھایا جائے گا۔ دعا کریں کہ وقتِ رخصت کلمہ نصیب ہو۔

عزت کرو، عزت ملے گی۔ صدقہ دو، بلا ٹل جائے گی۔ توبہ کرو، گناہ معاف ہو جائیں گے۔ شکر کرو، نعمت محفوظ ہو جائے گی، دستر خوان کشادہ کردو، رزق بڑھے گا۔ سجدہ کرو، تقرب ملے گا۔

جو شخص اس لیے اپنی اصلاح کر رہا ہے کہ دُنیا اس کی تعریف و عزت کرے، اس کی اصلاح نہیں ہوگی۔ اپنی نیکیوں کا صلہ دنیا سے مانگنے والا انسان نیک نہیں ہوسکتا۔ ریا کار اس عابد کو کہتے ہیں جو دنیا کو اپنی عبادت سے مرعوب کرنا چاہے۔

واصف علی واصف کی کتاب سے

ارم ایوب۔ چیچہ وطنی کا انتخاب

ورزش

دفتر کے جنرل منیجر کی کاہلی مثالی تھی۔ ایک روز اچانک انہوں نے یہ اعلان کر کے سب کو حیران کر دیا۔ "بھئی آج میں جمنازیم ضرور جاؤں گا۔"

"بہت خوب......!" ایک صاحب نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "آخر آپ کو ورزش کا خیال آ ہی گیا۔"

"ورزش کرنے کو کون کمبخت جا رہا ہے......"

جی ایم منہ بنا کر بولا۔ "مجھے تو اپنی ممبر شپ کینسل کروانے کے لیے جانا ہے۔"

مرسلہ: کوثر پروین۔ کراچی

کائنات کے اُس پار آبی بخارات کی دھند

جدید سائنسی جریدے میں شائع ایک رپورٹ کے مطابق ناسا کی نہایت طاقتور دوربین "سپٹزر خلائی دوربین" نے نظامِ شمسی سے باہر ایک سیارے

کی فضا میں پانی کے بخارات دریافت کیے ہیں، جس سیارے کی فضا میں یہ حیرت انگیز بخارات دیکھے گئے ہیں اسے "ایچ ڈی 189733 بی" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ خلائی تاریخ میں ایک نیا موقع ہے، جب نظامِ شمسی سے باہر کسی سیارے پر پانی دریافت ہوا۔

ایچ ڈی نامی سیارہ ایسے سیاروں کے مجموعے کا حصہ ہے جو سورج سے چونسٹھ شمسی سال کے فاصلے پر ہے۔ سائنسدانوں کے مطابق یہ سیارہ اپنے ستارے سے "نوسوسینتیس ڈگری" تک جا پہنچا ہے۔ ریسرچ ٹیم کے سربراہ کے مطابق سیارے پر زندگی کی علامات مفید نہیں، تاہم خلا میں پانی کی موجودگی، خلائی سائنس کی تاریخ میں ایک نئے حیرت انگیز باب کا اضافہ ہے۔

انتخاب: علی گیلانی۔ راولپنڈی

رضامندی

ایک برطانوی خاتون نے ایک عدالت میں جیوری کی رکن بننے سے محض اس لیے انکار کردیا تھا کہ وہ موت کی سزا کو ناپسند کرتی تھی۔ جج نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

"دیکھیے محترمہ! وہ مقدمہ جس کے لیے آپ کو جیوری میں شامل ہونا ہے' ایک معمولی سا مقدمہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک عورت نے اپنے شوہر کو دس ہزار پونڈ زیورات کی خریداری کے لیے دیے تھے مگر شوہر نے زیور لانے کے بجائے ساری رقم جوئے میں ہار دی۔"

محترمہ نے یہ سنا تو فوراً بولی۔ "آپ کی بات بالکل مناسب ہے' میں بخوشی جیوری میں شامل ہوتی ہوں' ممکن ہے کہ موت کی سزا کے بارے میں میرے جو خیالات ہیں' وہ غلط ہی ہوں۔"

مرسلہ: ریحانہ بخت۔ کوٹ لکھپت

زکوٰۃ کا نصاب

ستاسی (87) گرام سونے کے زیورات پر زکوٰۃ دینی ہوگی۔ تولے کے حساب سے جس کے پاس ساڑھے سات تولے کے زیورات ہوں' اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی۔

جس وقت زکوٰۃ دی جائے' اس وقت سونے کی فی تولہ یا فی دس گرام جو قیمت ہو' اسی کے حساب سے زیورات کی مالیت لگالی جائے اور ڈھائی فیصد کے حساب سے اس کی زکوٰۃ دے دی جائے۔

دورانِ سال جو زیورات خریدے گئے۔ ان کو بھی باقی زیورات کے ساتھ شامل کرلیا جائے گا اور جب ان پر سال پورا ہوگا تو دوران سال خریدے گئے زیورات کی زکوٰۃ بھی ان کے ساتھ ہی دینی ہوگی' ہر ہر زیور پر۔ ضروری نہیں ہے کہ ان کو خریدے ہوئے سال گزر چکا ہو۔

انتخاب: روزینہ وہاب۔ گھونکی

کیلا

کیلا ایک مفید پھل ہے یہ سرد تر ہوتا ہے یہ خشک کھانسی اور گلے کی خراش کو دور کرتا ہے اس کے استعمال سے گردوں پر چربی کی تہہ مضبوط ہوکر کمر سیدھی ہوجاتی ہے یہ گردہ اور جگر کو طاقت دیتا ہے بلغم پیدا کرتا ہے۔ خون پیدا کرتا ہے۔

دیر سے ہضم ہوتا ہے فربہ آدمیوں کو کیلا کم استعمال کرنا چاہیے کیونکہ یہ جسم کو موٹا کرتا ہے ہاں! دبلے پتلے لوگ اگر تین چار کیلے روزانہ استعمال کریں تو کچھ عرصہ میں اپنے وزن میں کافی فرق محسوس کرینگے۔

یہ دل کے لیے بہت مفید ہے۔ پیچش میں کیلا بہترین غذا ہے کیلا بچوں کی نشوونما کے لیے بہت مفید ہے۔ چھوٹے بچوں کو کیلے کی کھیر کھلانے سے ان کا جسم تیزی سے بڑھتا ہے۔

پیشاب کی جلن کے مریضوں کے لیے کیلا عمدہ غذا ہے۔ تپ دق کے مریضوں کو خوب پکے ہوئے یعنی جن کیلوں کے چھلکے سیاہ پڑ چکے ہوں کھانے چاہیں۔

عمارہ خان۔ بھولاری

ماضی، حال اور مستقبل

عجیب بات ہے کہ امریکیوں کے پاس خواہ وہ سیاہ فام ہی کیوں نہ ہوں حال بھی ہے اور مستقبل بھی جبکہ وہ ماضی کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ ہمارے پاس اتنا ماضی ہے کہ سنبھالے نہیں سنبھلتا بلکہ اس پر شجاعت کا لیپ کرنے کے لیے مکرمی نسیم حجازی وغیرہ موجود ہیں۔

حال البتہ خراب ہے، یہ ہم گرامر کی اصطلاح میں زمانہ حال کا ذکر کر رہے ہیں اور اب رہا مستقبل سو اس کی خبر نہیں۔

(ابنِ انشاء کی ''نگری نگری پھرا مسافر سے''
آرو اشاہد۔ کراچی کا انتخاب)

ہری مرچیں

☼ خدا آپ کی عمر دراز کرے۔
☼ خدا آپ کو خوش رکھے۔
☼ خدا آپ کے رزق میں اضافہ کرے۔
☼ خدا آپ کی ہر مراد پوری کرے۔
☼ ''یاد ہو گیا......! چل پکڑ پیالہ اور نکل کام پر۔''

☆......☆......☆

موبائل

پیٹرول پمپ پر لکھا تھا۔ ''موبائل استعمال مت کریں۔''

سردار جی نے موبائل نکالا اور سب دوستوں کو کال کر کے کہا۔

''فون نہ کرنا، میں پیٹرول پمپ پر ہوں۔''

عامر بشیر۔ کراچی

مناسب وقت پہ

ایک خاتون نے فقیر کو پرانے کپڑے خیرات میں دیئے اور کہا۔ ''یہ میرے مرحوم شوہر کے کپڑے ہیں۔''

کپڑوں پر جا بجا دھبے پڑے ہوئے تھے اور کئی سوراخ بھی تھے، یہ دیکھ کر فقیر بولا۔ ''آپ کے شوہر بہت خوش نصیب تھے، بالکل مناسب وقت پر رحلت کر گئے۔''

مرسلہ: سعدیہ وحید، کراچی

اقوال زریں

☆ سب کے سامنے کسی کو نصیحت کرنا ایک طرح کی ملامت ہے۔ (حضرت علیؓ)

☆ جو شخص تم سے دوسروں کے عیوب بیان کرتا ہے، وہ یقیناً دوسروں کے سامنے تمہاری برائی بھی کرتا ہوگا۔ (حضرت حسن بصریؒ)

☆ تین شخص/ اشخاص تین باتوں سے پہچانے جاتے ہیں، دانا غصے کے وقت، بہادر لڑائی کے وقت اور دوست ضرورت کے وقت۔ (حضرت لقمان)

☆ محبت میں یہ قباحت ہوتی ہے کہ جس سے محبت کی جائے، اسے خود سے جدا کرتے وقت بہت تکلیف ہوتی ہے۔ (خلیل جبران)

☆ اپنے خدا سے آشنا بنو کیونکہ جب مسافر کسی شہر میں پہنچتا ہے تو آشنا کی موجودگی اسے بہادر اور نڈر بنا دیتی ہے۔ (کنفیوشس)

☆ بے موقع گفتگو انسان کو لے ڈوبتی ہے۔ (ایڈورڈ بوہری)

مرسلہ: صائمہ اسحاق، کوٹ ادو

سادگی

صبح دودھ والے نے گھنٹی بجائی تو شوہر کی آنکھ کھل گئی۔ بیوی گہری نیند سو رہی تھی، اس کے

شوہر نے سردی کی وجہ سے بیوی کی شال اچھی طرح اوڑھی اور دروازہ کھول دیا۔ دودھ والے سے دودھ لے کر وہ جونہی مڑا' پیچھے سے اسے دودھ والے کی آواز آئی۔ ''کیا بات ہے ڈارلنگ' کیا آج کچھ ناراض ہو؟''

شوہر ہنستا ہوا مسہری پر جا لیٹا۔ بیوی نے نیند بھری آواز میں پوچھا۔ ''ہنس کیوں رہے ہو؟''

شوہر نے جواب دیا۔ ''ابھی بڑے مزے کی بات ہوئی' میں تمہاری شال اوڑھ کر دودھ والے سے دودھ لینے گیا تو اس نے پیار سے مجھے ڈارلنگ پکارا۔ میرا خیال ہے' اس کی بیوی کی شال بھی تمہاری جیسی ہے۔''

مرسلہ: شازیہ جاوید' بہاولپور

کام سے پہلے انجام

حکایت ہے کہ ایک ہرن ایک دفعہ پیاسا ہوا تو پانی کے ایک چشمے کے پاس آیا تاکہ اس چشمے سے پانی پیے، پانی گہرائی میں تھا۔ وہ ہرن اس چشمے میں اُتر گیا اور خوب پانی پیا۔ پھر جب اس نے چشمے سے نکلنے کا ارادہ کیا تو نکلنے پر قادر نہ ہو سکا۔ اس کو ایک لومڑی نے دیکھا تو کہا اے میرے بھائی! تُو نے اپنے کام میں غلطی کی ہے کیونکہ تم نے چشمے میں اُترنے سے پہلے ہی اپنے نکلنے کو نہیں سوچا۔ انسان کو چاہیے کہ کوئی بھی کام کرنے سے پہلے اس کا انجام سوچ لے۔

(مفید الطالبین الباب الثانی فی الحکایات صفحہ 22)

1300 سال تک دنیا کی نظروں سے اوجھل رہنے والا جزیرہ ''ایسٹر''

5 اپریل 1722 کو ایسٹر کے مذہبی تہوار کے دن، مشہور ولندیزی جہاز راں اور سیاح ''جیکب روگی وین'' (Jacob Roggeveen) نے اس جزیرے پر قدم رکھا تھا۔ جبکہ روگی وین مہذب دنیا کا پہلا یورپی فرد تھا جس نے تقریباً تیرہ صدیوں تک باقی دنیا سے لاعلم رہنے والے اس آباد جزیرے کو دریافت کیا اور گم نامی میں چھپے ہوئے نادر اور انوکھے موآئی مجسموں کو شہرتِ دوام بخشی۔ اگرچہ ایسٹر کی مناسبت سے جزیرے کا نام ایسٹر آئی لینڈ مشہور ہو گیا ہے، تاہم جزیرے کو تیسری صدی عیسوی میں آباد کرنے والے ابتدائی آبادکار نسلی گروہ ''راپانیو'' (Rapa Nui) کے تاریخی نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔

لاکھوں سال کے آتش فشانی کے عمل سے تقریباً تکونی شکل میں تشکیل پانے والے اس جزیرے کو مقامی مقامی افراد Te Pito O Te Henua یعنی ''زمین کی ناف'' (Navel of the world) بھی کہتے ہیں۔ جبکہ یہاں موجود چٹانوں سے تراشے ہوئے بلند بالا مجسموں کے لیے مقامی افراد اپنی مادری زبان کے لفظ ''موآئی'' کا استعمال کرتے ہیں جس کے معنی مجسمہ، بت یا مورتی کے ہیں۔

غزل

کہا کسی نے کہ ہم کو وہ محبت یاد آتی ہے
اٹھائی ہے جو برسوں' وہ اذیت یاد آتی ہے
بھلایا اس کی باتوں کو' مٹایا اس کی یادوں کو
بہت دن ہو گئے پھر بھی وہ صورت یاد آتی ہے
عیاں تھی وہ جو آنکھوں سے' نہاں تھی وہ جو باتوں سے
تیرے جذبوں کی وہ بھرپور شدت یاد آتی ہے
ہماری حکمرانی تھی' ہماری ترجمانی تھی
تمہارے دل پہ کی تھی جو حکومت' یاد آتی ہے

شاعرہ: زہرہ جنید

انتخاب: نورین جبران' کراچی

☆☆......☆☆

شعر و سخن

غزل

رخصت ہوا تو بات میری مان کر گیا
جو اس کے پاس تھا وہ مجھے دان کر گیا
بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا
دلچسپ واقعہ ہے کہ کل اک عزیز دوست
اپنے مفاد پر مجھے قربان کر گیا
کتنی سدھر گئی ہے جوانی میں زندگی
ہاں وہ جفا سے مجھ پہ تو احسان کر گیا
ذیشان میں بات بات پر کہتا تھا جس کو جان
وہ شخص آخر مجھے بے جان کر گیا

شاعر: ذیشان ریاض شیخ۔ فیصل آباد

تحفہ عید

سوچتا ہوں تجھے میں کیا بھیجوں
پیار بھیجوں یا کہ دعا بھیجوں
تازہ زخموں کی میں حنا بھیجوں
ماتم عشق کی صدا بھیجوں
یا نئی کوئی کربلا بھیجوں
تحفہ عید میں تجھ کو کیا بھیجوں
جلتے جذبات کا دھواں بھی ہے
داغ دل کا ابھی جواں بھی ہے
اک ویران آشیاں بھی ہے
غم سے سرشار داستان بھی ہے
یا فسانہ کوئی نیا بھیجوں
تحفہ عید میں تجھ کو کیا بھیجوں
آرزو ہے لہو لہو میری
غم میں ڈوبی ہے گفتگو میری
رنج و غم ہوگئی ہے خو میری
تجھ کو شاید ہو جستجو میری
دل اپنا بجھا بجھا بھیجوں
تحفہ عید میں تجھ کو کیا بھیجوں
اب ہے گھیرے ہوئے زوال مجھے
گردشوں نے کیا ہے نڈھال مجھے
کرکے چھوڑا ہے پائمال مجھے
پھر بھی آئے تیرا خیال مجھے
درد میں ڈوبا قابلہ بھیجوں
تحفہ عید میں تجھ کو کیا بھیجوں
آج تک سوگوار ہوں میں بھی
چلتا پھرتا مزار ہوں میں بھی
تیرے غم کی بہار ہوں میں بھی
اک مسلسل پکار ہوں میں بھی
اب وہی ہیں بجھی بجھی آنکھیں
تیری صورت کو ترستی آنکھیں
ڈھونڈتی ہیں گلی گلی آنکھیں
اپنی آنکھوں کی التجا بھیجوں
تحفہ عید میں تجھ کو کیا بھیجوں
بچھڑے لمحے ستا رہے ہوں گے
یاد تجھ کو بھی آرہے ہوں گے
خاک دل کی اڑا رہے ہوں گے
قصہ غم سنا رہے ہوں گے
ضبط کرنے کا حوصلہ بھیجوں
تحفہ عید میں تجھ کو کیا بھیجوں

شاعر: محمد حنیف شاکر۔ بھاگووالی

آہستہ آہستہ

روز ہا تھا میں
خود اپنی بے بسی پر
آہستہ آہستہ
وہ بچھار ہا تھا پیاس
میرے آنسوؤں سے کیوں؟
آہستہ آہستہ
گرم گرم اشک تھے
رخسار پر جب بھی گرے
آگ بھڑک اٹھی
تن بدن میں
مرے من یں
وہ مسکرا رہا تھا
آہستہ آہستہ
میں تو جل کر راکھ ہوا
لیکن اس کی زندگی اور بے نوشی
اور کفن سینے سے لے کر قبر میں اتارنے تک کا فاصلہ
طے ہوا
آہستہ آہستہ
شاید یہ محبت کی کہانی ہے
کبھی ختم نہیں ہوئی
سلسلہ یونہی چلتا رہے گا' قیامت تک!

شاعر: شاہد قریشی

زندگی

یہ جو زندگی ہے
درحقیقت
پانی کا اک بلبلہ ہے
جو پل میں بنے اور پھٹ جائے
زندگی اک لمحہ ہے
جو پلک جھپکتے گزر جائے
زندگی اک سپنا ہے
آنکھ کھلے اور ٹوٹ جائے
زندگی اک وعدہ ہے
جو کبھی نہ پورا ہو پائے
زندگی اک ایسا رشتہ
جو کبھی پنپ نہ پائے
اک خواہش ہے زندگی
جو ہمیشہ ادھوری رہ جائے
اک تمنا ہے زندگی
جو سدا لاحاصل رہے
زندگی اک رات ہے
جو سورج کے ساتھ ہی ڈھل جائے
سانس کی اِک ڈور ہے زندگی
جو کہیں بھی ٹوٹ جائے
ناپائیدار کچی ہانڈی جیسی
جو بیچ چوراہے پھوٹ جائے
ایسی بے اعتبار ہے یہ زندگی
جو اک پل میں چھومنتر ہو جائے
درحقیقت
یہی زندگی ہے

شاعرہ: ریحانہ اعجاز

غریب لڑکی

آئینے میں
اپنا چہرہ تکنے والی
کب تک خوابوں سے اُلجھے گی
بند کواڑوں سے آگے
جو دنیا ہے
اس کے دام بہت اونچے ہیں

شاعرہ: ڈاکٹر عزیزہ انجم